نوائے مشرق



علامہ اقبال رح
اور
مولانا مودودی رح
کا
ایک تقابلی مطالعہ

سعید احمد

نوائے مشرق

سعید احمد



نوائے مشرق اس کتاب میں جناب سعید احمد صاحب نے علامہ اقبال (جو کہ ایک شاعر ہیں) اور مولانا مودودی (جو کہ ایک ادیب ہیں) کا ایک تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔
دونوں اپنے اپنے فن کے مشاق ہیں۔ دونوں کی تخلیقات عزائم کو سینوں میں بیدار کرتی ہیں اور دونوں ہی فکرِ اسلام کے ترجمان ہیں۔ سفید عمدہ کاغذ پر آفسیٹ کی طباعت۔ دو رنگوں میں خوبصورت ڈیزائن کا کور۔ سائز ۱۸×۲۲/۸ : ایڈیشن ۱۹۸۳ء : صفحات ۲۶۴ : قیمت ۳۰/- روپے۔

بائیبل، قرآن اور سائنس قرآن کے اندر قدرتی حوادث سے متعلق ایسے بیانات موجود ہیں، جن کا مفہوم صرف جدید سائنسی معلومات کے ذریعہ ہی سمجھ میں آسکتا ہے۔ اور سائنس کا ذکر بائیبل میں بھی ملتا ہے۔
اس کتاب میں "موریس بوکائیے" نے اسی بنا پر قرآن اور بائیبل کی روشنی میں جدید سائنسی معلومات کا آپس میں ایک دوسرے سے موازنہ پیش کیا ہے۔ فوٹو آفسیٹ طباعت، عمدہ دیدہ زیب ٹائیٹل۔
سائز ۱۸×۲۲/۸ صفحات ۴۰۲ : ایڈیشن ۱۹۸۳ء : قیمت ۲۵/- روپے۔

فیروز اللغات طلبہ اور عام شائقین کے لئے گراں قدر تحفہ
اُردو جاننے والوں کے لئے ایک نہایت مفید معلوماتی کتاب۔ عام بول چال اور روزانہ استعمال میں آنے والے محاوروں اور کہاوتوں کے معنی جاننے کے لئے اس کتاب کا اپنے پاس رکھنا بہت ضروری ہے۔ دو سائز میں دستیاب ہے۔
طلبہ کے لئے پاکٹ ایڈیشن قیمت ۱۵/- روپے۔ اُردو داں طبقہ کے لئے بڑے سائز میں قیمت ۲۵/- روپے

مجموعۂ وظائف مترجم اپنی طرز کی پہلی کتاب، ہر لحاظ سے مکمل
دو رنگوں میں آفسیٹ کی طباعت، دیدہ زیب خوبصورت بائنڈنگ
سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۳۴۴ : قیمت ۱۵/- روپے۔

پبلشرز: تاج کمپنی ۳۱۵۱ ترکمان گیٹ، دہلی۔ انڈیا

نوائے مشرق



علامہ اقبالؒ
اور
مولانا مودودیؒ
کا
ایک تقابلی مُطالعہ

سعید احمد

نوائے مشرق

سعید احمد



نوائے مشرق

سعید احمد

تاج کمپنی

پبلیشر:
تاج کمپنی
3151، ترکمان گیٹ
دہلی

ایڈیشن:
1983

قیمت: -/30 روپے

مطبوعہ:
تاج پرنٹرز
69، نجف گڑھ روڈ
نئی دہلی

خدائے عزّ وجل کے نام
جو
ہر زمانے کے لیے روشنی ہے

نوائے مشرق

علامہ اقبالؒ

اور

مولانا مودودیؒ

کا

ایک تقابلی مطالعہ

سعید احمد

”جن لوگوں نے (ان باتوں کو تسلیم کرنے سے) انکار کر دیا، ان کے لیے یکساں ہے، خواہ تم انھیں خبردار کرو یا نہ کرو، بہرحال وہ ماننے والے نہیں ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے۔“

قرآن ۲ : ۶-۷ (تفہیم القرآن)

پھول کی پتّی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

(بالِ جبریل)

دیباچہ

اس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق

روشنی کی تلاش میں خوبیٔ قسمت سے کتابوں میں علامہ اقبالؒ اور مولانا مودودیؒ سے شرف نیاز حاصل ہو گیا تو اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ دو ہوتے ہوئے بھی دونوں کا اندرون ایک ہے۔ دونوں کا فکر و نظر، دل و دماغ، جذبات و احساسات میں حیرت انگیز حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔

اقبال اور مودودی دونوں فکرِ اسلام کے ترجمان ہیں۔ ایک نے خاص طور پر نظم دوسرے نے نثر کو ذریعہ بنایا ہے ایک شاعر دوسرا ادیب ہے۔ دونوں اپنے اپنے فن کے کامیاب فنکار ہیں۔ دونوں کے چشمۂ علم سے نور کی ندیاں رواں ہیں۔ دونوں کی تخلیقات عزائم کو سینوں میں بیدار کرنے کا کام کرتی ہیں۔ روح کو تازگی اور قلب کو حرارت بخشتی ہیں۔ شانِ خلیل دونوں کی تخلیقات سے عیاں ہے۔ دونوں حضرتِ انسان کی رات کو سحر کرنا چاہتے ہیں۔ دونوں آدمِ یزداں صفات کو بتانِ آذری کی حکمرانی سے آزاد دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے دونوں نے شاہراہِ اسلام کو پسند کیا ہے جو انسان پر انسان کی خدائی کی جڑ کاٹتا ہے اور دونوں اسی شاہراہ پر ساری انسانیت کو گامزن کرنا چاہتے ہیں

اقبال پر ناقدین نے بہت کچھ لکھا ہے مگر افسوس! کسی نے بھی اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ان میں سے کسی نے بھی اس جرأتِ رندانہ کا ثبوت نہیں دیا جو اس پر قلم اٹھانے

والوں میں پائی جانی چاہیئے۔ ہر ایک نے اس کی فکر کو دو دو چار کے انداز میں پیش کرنے سے گریز کیا۔ ان کے سامنے مصلحتِ وقت کا بت آن کھڑا ہوا! چنانچہ اس کا پیغامِ انقلاب کے پردوں میں چھپا رہ گیا بلکہ چھپا دیا گیا۔ چونکہ اقبال پر مولانا مودودی کے دو مضامین اس کتاب میں شامل ہیں جس سے ضرورت کی حد تک ان کا تعارف ہو جاتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ علامہ کا مولانا کی نظر میں کیا مرتبہ اور مقام ہے مگر افسوس! ایسا کوئی مواد اقبال کا مولانا مودودی کے بارے میں نہیں مل سکا، لہٰذا میں ہی سمندر کو ایک بوند پانی میں بند کرنے کا فریضہ انجام دیتا ہوں۔

خانۂ کعبہ کی دیواریں اٹھاتے ہوئے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ یہ دعا کر رہے تھے:

"اور اے رب! ان لوگوں میں خود ان ہی کی قوم سے ایک رسول اٹھائیو، جو انھیں تیری آیات سنائے، ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے۔ تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے۔"

باپ بیٹے کی اس دعا کے جواب میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت مبعوث فرمایا گیا جب انسانیت کسی مردِ راہ دان کے لیے ترس رہی تھی۔ حضور کو بنی نوع انسان کی زندگیاں سنوارنے کا کام سونپا گیا۔

اقبال نے بھی جب اپنی قوم کو شعار آذری اختیار کیے ہوئے پایا تو دل کی گہرائیوں سے وہی براہیمی دعا مانگی ؎

کوئی مردِ مومن جگا دے یہ بستی
طریقے ہیں مشرق کے سب راہبانہ

ذات بے ہمتا پر یہ دعا اثر انداز ہو گئی اور مولانا مودودی کو مئے غفلت کے سرمستوں کی بستیاں جگانے کا کام سونپا گیا۔

(مولانا) سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳ء تا ۱۹۷۹ء) حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ ۲۴ سال کی عمر میں اسلام کے فلسفۂ صلح و جنگ پر اپنی یگانۂ روزگار کتاب "الجہاد فی الاسلام" تصنیف کی جو اسلامی دنیا میں اب بھی اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ پھر مسلسل اپنی گرم گرم تحریروں اور رنگین بیانوں سے دلوں کو گرماتے رہے اور اسلام کو ایک مکمل نظامِ حیات، آبِ حیات اور

تحریک کی حیثیت سے متعارف کرنے کا عظیم کارنامہ انجام دیتے رہے۔ یہ کام اس شان سے گذشتہ صدیوں میں جب سے اسلام کے گلستاں میں فصلِ خزاں کا دور شروع ہوا ہے، شاید ہی انجام دیا گیا ہو۔

۱۹۴۱ء میں سید مودودی نے جَآءَ الْحَقُّ وَزَھَقَ الْبَاطِلُ ط کے تحت تاریکی باطل کو آدابِ گریز سکھانے کے لیے جماعت اسلامی کے نام سے عشق بلا خیز کا قافلۂ سخت جان منظم کیا جس میں کشتیاں جلا کر ہی شامل ہوا جا سکتا ہے کیونکہ اس شرط کو پورا کیے بغیر صفحۂ دہر سے باطل کو مٹانے کا عزم خام ہوتا ہے۔ اس طرح اس مردِ سراپا کردار نے قافلۂ حجاز میں حسین پیدا کیے ؎

فصلِ گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حجاب

عشق بلا خیز کے اس قافلۂ سخت جان کو شعلہ بن کر خاشاکِ غیر اللہ کو پھونک دینے کا سبق پڑھایا تاکہ دنیا میں توحید بے حجاب ہو، تاکہ اسلام آزاد ہو، تاکہ پھر وہی محفلِ دیرینہ زندہ ہو، تاکہ پھر ایک بار اس گلشن کہن میں بہار خیمہ زن ہو جائے۔ اس نصب العین کے حصول کے لیے یہ جماعت اپنے ممبران میں شعور کا جام آتشیں تقسیم کرتی ہے۔ اپنے ارکان میں براہیم کا ایماں پیدا کرتی ہے۔ ان میں نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفان ہو جانے کی صفت پیدا کرتی ہے۔

یہ مردِ مومن خود کو نو مسلم کہتا ہے کیونکہ اس نے اپنے آبائی مذہب —— مذہبِ ملّا و جمادات و نباتات جو خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات تک محدود ہے —— کو ترک کر کے مردانِ خود آگاہ و خدا مست کا مذہب جو وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل ہے۔ اختیار کیا۔ بے شک وہ اپنے نو مسلم ہونے پر اس حیثیت سے فخر کر سکتا ہے کہ بیشتر اصحابِ رسول، انبیائے کرام اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ایک نمایاں صفت ہے۔

اس مردِ خدا کا صرف یہی کارنامہ نہیں ہے کہ اس نے بیرونِ خانہ باطل سے کھلی ٹکر لی، کمیونزم کے ہولناک فتنہ کے عظیم سیلاب پر بند باندھا، ذہنوں کو مغرب کی غلامی سے آزاد کرایا بلکہ اندرونِ خانہ بھی قصہ یزید و حسینؓ کو زندہ کیا۔ میر و فقیر و رند و پیر سب پر کاری ضرب لگائی، کعبہ کے برہمنوں کو کھری کھری سنائی کیونکہ اس کے بغیر اسلام کا آزاد ہونا، باطل کا سرنگوں ہونا ممکن نہ تھا اور نہ ممکن ہے۔

آہ! اسلام کو آزاد کرانے کی اس تحریک کی راہ میں سنگِ گراں یہی مسلمان قوم بنی جو اب
بھی اپنی عدم واقفیت، ایمان اور قوتِ ارادی میں کمی کے باعث اسلام کے اس نسخۂ زندگیٔ
دوام کو آزمانے میں اپنی دنیا کا زیاں سمجھتی ہے۔ یہ کیا بوالعجبی ہے کہ آگ اپنی گرمی کھو دے تو
آگ نہ رہ جائے، مگر مسلمان خدا کی اطاعت کھو کر بھی مسلمان ہے! اس کے باوجود اللہ کی مشیت
یہی ہے کہ موجودہ صدی ہجری اسلام کی صدی ہو۔ لہٰذا مسلمان نہ اٹھیں گے تو کعبہ کو
صنم خانے سے پاسبان مل جائیں گے۔

مولانا روشن جبیں، خوش دل، گرم اختلاط اور سادہ تھے۔ نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
تھی۔ لذتِ کردار کے ساتھ افکارِ عمیق اور حسن و جمال کے ساتھ جلال بھی تھا۔ طبعِ بلند ستارے
کی طرح روشن تھی۔ زندگی سراپا سوز، زندگانی مہتاب سے بھی تابندہ تر تھی۔ ان کے سخن سے
دلوں کی کھیتیاں سرسبز تھیں۔ ان کی کشتِ فکر سے عالم سبزہ زار اُگ رہے ہیں ؏
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

الغرض یہ مشتِ خاک خضرِ راہ کے ان اشعار کا مصداق تھا:

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار
تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے
خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب
تا بدخشاں پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے

دنیا کی یہ منافقت بھی قابلِ ذکر ہے کہ آج ہر ایک کہہ رہا ہے کہ اقبال ہمارے تھے حتیٰ کہ
اشتراکی روس اور سکولر ہندوستان میں بھی سرکاری اقبال ڈے منا کر یہ تاثر دینے کی کوشش
کی جاتی ہے کہ اقبال اشتراکیت، سیکولرزم، مغربی جمہوریت کے لئے بے ضرر شاعر تھے۔ اس طرح ان کی انقلابی
شاعری کی تعلیمات کو مسخ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے مگر سید ابوالاعلیٰ سے ہر باطل پرست کو کھلا بیر ہے۔
شیطان کو اس مردِ خدا کے نام سے الرجی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان کا انقلابی کردار اس قدر عریاں ہے کہ کوئی پردہ
اس پر پردہ ڈالنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اقبال اور سید مودودی میں بنیادی فرق وہی ہے جو "لاکھ
حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف" میں ہوتا ہے۔

ان دونوں اسلامی مفکرین کا کھلے دل سے مطالعہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے جس کو پورا کرنے کی
یہ ایک ناچیز کوشش ہے۔ اس کتاب کی ترتیب میں تنوع، تموج اور ترنگ کو سامنے رکھتے ہوئے
کلیاتِ اقبال سے اشعار کا انتخاب کیا گیا ہے اور ان کی مطابقت سیّد کی تحریروں اور تقریروں کے
اقتباسات سے کی گئی ہے۔ یہ کام اگرچہ آسان نہ تھا مگر افادیت کے پیشِ نظر ضروری تھا چنانچہ ان کی
میسّر تصنیفات سے یہ کام انجام دیا گیا۔

مشک آنست کہ خود ببوید۔ یہ کتاب بزمِ مردانِ حق کی دو اہم شخصیتوں سے آپ کی ملاقات
کرا دے گی اور بتائے گی کہ ان میں کیا روحانی رشتہ ہے اور وہ اس عصر کے لئے کیا پیغام رکھتے ہیں۔
ظاہر ہے عطائے شعلہ شرر کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

آخر میں اس کتاب کی افادیت بڑھانے کے لئے ناظرینِ کرام سے درخواست ہے کہ اپنے گراں
قدر مشوروں سے نواز کر کتاب کا آئندہ ایڈیشن خوب سے خوب تر بنانے میں تعاون فرمائیں۔
نیز سید مودودی کی دعا میں شریک ہو کر آمین کہیں۔

اے پروردگار! میں ایک مجاہد کے ایمان کا طالب ہوں۔ ایسا دل مانگتا ہوں جو سمندر کی
طوفانی موجوں کے مقابلے ٹوٹی کشتی لے جانے پر بے جھجک آمادہ ہو جائے۔ ایسی روح مانگتا ہوں جو
شکست کھانے اور سپر رکھ دینے کا تصور بھی نہ کر سکتی ہو۔ ایسی عزیمت مانگتا ہوں جو مادی سہاروں
سے قطعاً مستغنی ہو، اور تمام سہاروں کے چھوٹ جانے پر بھی نہ ٹوٹ سکے۔ ایسا ارادہ مانگتا ہوں
جسے کوئی طاقت اپنے مقصد کے راستے سے نہ ہٹا سکے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

سعید احمد
لکچرر
محمد حسن انٹر کالج جونپور یوپی

فہرست مضامین

ھدیۂ عقیدت

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انھیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

خانقاہوں سے نکل کر رسمِ شبیّری ادا کرنے والے، حاضر و موجود سے بیزار کرنے والے مردِ خود آگاہ و خدامست آیت اللہ روح خمینی سے اس کتاب کو منسوب کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں، جنھوں نے موت کے آئینے میں رخِ دوست دکھا کر زندگی کو دشوار تر بنا دیا ہے جو مسلم خوابیدہ کو آواز دے رہے ہیں:

"سحر کی اذان ہوگئی اب تو جاگ!"

سعید احمد

اقبالؒ کی ایک تصویر —— مولانا مودودی کے الفاظ میں

سب جانتے ہیں کہ اقبالؒ نے یہی مغربی تعلیم حاصل کی تھی جو ہمارے نوجوان انگریزی یونیورسٹیوں میں حاصل کرتے ہیں۔ یہی تاریخ، یہی ادب، یہی اقتصادیات، یہی سیاسیات، یہی قانون اور یہی فلسفہ انھوں نے بھی پڑھا تھا اور ان فنون میں بھی وہ مبتدی نہ تھے بلکہ منتہی فارغ التحصیل تھے، خصوصاً فلسفہ میں تو ان کو امامت کا مرتبہ حاصل تھا جس کا اعتراف موجودہ دور کے اکابر فلاسفر تک کر چکے ہیں۔ جس شراب کے دو چار گھونٹ پی کر بہت سے لوگ بہکنے لگتے ہیں۔ یہ مرحوم اس کے سمندر پیے بیٹھا تھا۔ پھر مغرب اور اس تہذیب کو بھی اس نے محض ساحل پر سے نہیں دیکھا تھا جس طرح ہمارے ننانوے فیصدی نوجوان دیکھتے ہیں بلکہ وہ اس دریا میں غوطہ لگا کر تہہ تک اتر چکا تھا اور ان سب مرحلوں سے گزرا تھا جن میں پہنچ کر ہماری قوم کے ہزاروں نوجوان اپنے دین و ایمان، اپنے اصول حتّٰی تہذیب و تمدن اور اپنے قومی اخلاق کے مبادی تک سے برگشتہ ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ اپنی قومی زبان تک بولنے کے قابل نہیں رہتے۔

لیکن اس کے باوجود اس شخص کا کیا حال تھا؟ مغربی تعلیم و تہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ جتنا مسلمان تھا اس کے منجدھار میں پہنچ کر اس سے زیادہ مسلمان پایا گیا۔ جتنا اس کی گہرائیوں میں اترتا گیا اتنا ہی زیادہ مسلمان ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی تہہ میں جب وہ پہنچا تو دنیا نے دیکھا کہ وہ قرآن میں گم ہو چکا ہے، اور قرآن سے الگ اس کا کوئی فکری وجود باقی نہیں رہا۔ وہ جو کچھ سوچتا تھا قرآن کے دماغ سے سوچتا تھا۔ جو کچھ دیکھتا تھا قرآن کی نظر سے دیکھتا تھا۔ حقیقت اور قرآن اس کی نظر میں شے واحد تھے اور اس شے واحد میں وہ اس طرح فنا ہو گیا تھا کہ اس دور کے علماء دین میں بھی مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو فنائیت فی القرآن میں اس امام فلسفہ اور اس ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ بار ایٹ لا سے لگا کھاتا ہو۔

حدیث کی جن باتوں پر نئے تعلیم یافتہ نہیں، پرانے مولوی تک کان کھڑے کرتے ہیں اور پہلو بدل بدل کرتاویلیں کرنے لگتے ہیں یہ ڈاکٹر آف فلاسفی ان کے ٹھیٹھ لفظی مفہوم پر ایمان رکھتا تھا۔ اور ایسی کوئی حدیث سن کر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے دل میں شک کا گزر نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے ان کے سامنے بڑے اچنبھے کے انداز میں اس حدیث کا ذکر کیا جس میں بیان ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصحاب ثلاثہ کے ساتھ کوہ اُحد پر تشریف رکھتے تھے اتنے میں احد لرزنے لگا اور حضور نے فرمایا کہ "ٹھہر جا! تیرے اوپر ایک نبی ایک صدیق اور دو شہیدوں کے سوا کوئی نہیں ہے!" اس پر پہاڑ ساکن ہو گیا۔ اقبال نے حدیث سنتے ہی کہا کہ اس میں اچنبھے کی کون سی بات ہے؟ میں اس کو استعارہ و مجاز نہیں بالکل ایک مادّی حقیقت سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اس کے لیے کسی تاویل کی حاجت نہیں۔ اگر تم حقائق سے آگاہ ہوتے تو تمھیں معلوم ہوتا کہ ایک نبی کے نیچے آ کر مادے کے بڑے سے بڑے تودے بھی لرز اٹھتے ہیں، مجازی طور پر نہیں، واقعی لرز اٹھتے ہیں۔

اسلامی شریعت کے جن احکام کو بہت سے روشن خیال حضرات فرسودہ اور بوسیدہ قوانین سمجھتے ہیں اور جن پر اعتقاد رکھنا ان کے نزدیک ایسی تاریک خیالی ہے کہ مہذب سوسائٹی میں ان کی تائید کرنا ایک تعلیم یافتہ آدمی کے لیے ڈوب مرنے سے زیادہ بدتر ہے اقبال نہ صرف ان کو مانتا اور ان پر عمل کرتا تھا بلکہ برملا ان کی حمایت کرتا تھا اور اس کو کسی کے سامنے ان کی تائید کرنے میں باک نہ تھا۔ اس کی ایک معمولی مثال سن لیجیے:

ایک مرتبہ حکومت نے ان کو جنوبی افریقہ میں اپنا ایجنٹ بنا کر بھیجنا چاہا۔ یہ عہدہ باقاعدہ ان کے سامنے پیش کیا گیا مگر شرط یہ تھی کہ وہ اپنی بیوی کو پردہ نہ کرائیں گے اور سرکاری تقریبات میں لیڈی اقبال کو ساتھ لے کر شریک ہوا کریں گے۔ اقبال نے اس شرط کے ساتھ یہ عہدہ قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور خود لارڈ و لنگڈن سے کہا "میں بے شک ایک گنہگار آدمی ہوں، احکام اسلامی کی پابندی میں بہت کوتاہیاں مجھ سے ہوتی ہیں مگر اتنی ذلّت اختیار نہیں کر سکتا کہ محض آپ کا ایک عہدہ حاصل کرنے کے لیے شریعت کا حکم توڑ دوں۔"

ان کی سادہ زندگی اور فقیرانہ طبیعت کے حالات ان کی وفات ہی کے بعد لوگوں میں شایع ہوئے ورنہ عام خیال یہی تھا کہ جیسے اور "سر" صاحبان ہوتے ہیں ویسے

ہی وہ بھی ہوں گے اور اسی بنا پر بہت سے لوگوں نے یہاں تک بلا تحقیق لکھ ڈالا کہ ان کی بارگاہ عالی تک رسائی کہاں ہوتی ہے؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ شخص اس سے زیادہ فقیر منش تھا جتنا اس کی وفات کے بعد لوگوں نے اخبارات میں بیان کیا ہے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ سن لیجیے۔ اس نائٹ اور بیرسٹر کی طبیعت کا آپ اندازہ کر سکیں گے۔ پنجاب کے ایک دولت مند رئیس نے ایک قانونی مشورہ کے لیے اقبال اور سر فضل حسین مرحوم اور ایک دو اور مشہور قانون داں اصحاب کو اپنے ہاں بلایا اور اپنی شاندار کوٹھی میں ان کے قیام کا انتظام کیا۔ رات کو جس وقت اقبال اپنے کمرہ میں آرام کرنے کے لیے گئے تو ہر طرف عیش وتنعم کے سامان دیکھ کر اور اپنے نیچے نرم اور قیمتی بستر پا کر معاً ان کے دل میں خیال آیا کہ جس رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ مرتبے نصیب ہوئے ہیں اس نے بوریے پر سو سو کر زندگی گزاری تھی۔ یہ خیال آنا تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی اور اس بستر پر لیٹنا ان کے لیے ناممکن ہو گیا۔ اٹھے اور برابر کے غسل خانہ میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور مسلسل رونا شروع کر دیا۔ جب ذرا دل کو قرار ہوا تو اپنے ملازم کو بلا کر اپنا بستر کھلوا دیا اور ایک چارپائی اس غسل خانے میں بچھوائی اور جب تک وہاں مقیم رہے غسل خانے میں سوتے رہے۔ یہ وفات سے کچھ برس پہلے کا واقعہ ہے۔ جب باہر کی دنیا اس کو سوٹ بوٹ میں دیکھا کرتی تھی کسی کو خبر نہ تھی کہ اس سوٹ کے اندر جو شخص چھپا ہے اس کی اصلی حیثیت کیا ہے۔

پندرہ روزہ الحسنات رام پور جولائی ۱۹۶۴ء صفحہ ۲۴، ۲۵

اقبال کیا تھے

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی اس تقریر کا مکمل متن جو انھوں نے ۲۱ / اپریل سنہ ۱۹۷۰ء کو پنجاب یونیورسٹی ہال میں ارشاد فرمائی۔ آئین کے لیے اُسے ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے حفظ الرحمٰن احسن نے مرتب کیا۔

(ماہنامہ تجلی دیوبند جولائی سنہ ۱۹۷۰ء)

معزز حاضرین و حاضرات!

میں آپ سے اسی بات کی معافی چاہتا ہوں کہ بیٹھ کر تقریر کر رہا ہوں دراصل میری صحت آج کل اتنی خراب ہے کہ کھڑے ہو کر تقریر کرنا تو درکنار بجائے خود تقریر کرنا ہی میرے لیے سخت مشکل ہو رہا ہے —— اس کمزور صحت کے باوجود اس وقت یہاں صرف اس وجہ سے حاضر ہوا ہوں کہ حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کا جو موقع مجھے مل رہا ہے اس سے محروم نہ رہوں۔

حضرات!

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اسلامی تاریخ میں جو عظیم الشان اصلاحی کارنامہ انجام دیا ہے اگرچہ وہ بجائے خود نہایت قیمتی ہے لیکن اس کی قدر و قیمت اس وقت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے جب ہم اس بات پر نگاہ ڈالتے ہیں کہ انھوں نے کن حالات میں یہ کارنامہ انجام دیا۔ کسی مصلح کے کام کو جانچنے کے لیے صرف یہی دیکھنا کافی نہیں ہوتا کہ اس نے کیا کام کیا ہے بلکہ یہ دیکھنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ حالات کیا تھے جن میں اس نے وہ کام کیا۔

میں ایک مختصر طریقہ سے آپ حضرات کے سامنے ماضی قریب کی تاریخ کا ایک ورق کھولنا چاہتا ہوں۔ اس تاریخ سے میں خود بھی گزرا ہوں اور میں نے اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کیا ہے —— سنہ ۱۹۲۴ء سے سنہ ۱۹۳۸ء تک کا زمانہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کا تاریک ترین زمانہ تھا۔ اس وقت مسلمانوں نے تحریک خلافت میں اپنی تمام تر پونجی لگا دی تھی۔ ان کو یہ احساس تھا کہ خلافت اسلامیہ کو بچانے کے لیے اور مسلمانوں کے مقامات مقدسہ کو اغیار کے قبضہ سے چھڑانے کے لیے جو کچھ ہم سے ہو سکتا ہے وہ ہمیں کر ڈالنا چاہیے۔ اس غرض کے لیے انھوں نے نہ اپنا مال خرچ کرنے میں کوئی کسر اٹھا رکھی اور نہ اپنی جانیں قربان کرنے میں کوئی دریغ کیا۔ وہ اس مقصد کے لیے اس حد تک گئے کہ جن ہندوؤں کے متعلق ان کو صدیوں سے تجربہ تھا وہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں کیا جذبہ رکھتے ہیں انھوں نے ان کے ساتھ بھی محض اس امید پر اتحاد و تعاون کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی کہ کسی طرح

سے ہم خلافت کے ادارے کو بچالے جائیں اور اپنے مقامات مقدسہ کو اغیار کے قبضہ سے چھڑالیں لیکن آخر کار اس ساری تگ و دو کا جو انجام ہوا وہ یہ تھا کہ جس خلافت کو بچانے کے لیے انھوں نے سر دھڑ کی بازی لگائی تھی اس کی بساط ان ہی لوگوں نے لپیٹ دی جن کی خلافت کے لیے مسلمان کوشش کر رہے تھے اور جن مقامات مقدسہ کے لیے وہ اپنی جان لڑا رہے تھے انہی مقامات مقدسہ کے رہنے والے قومیت کے بت کے پرستار بن گئے اور انھوں نے آپس میں کشت و خون شروع کر دیا۔ آپس میں عداوتوں اور لڑائیوں پر اتر آئے اور وہ خود مقامات مقدسہ پر اغیار کے مستقل قبضے اور تسلط کا ذریعہ بن گئے۔ ایک طرف تو ہندی مسلمانوں کو خلافت کے تحفظ کے سلسلہ میں اپنی ساری کوششوں کا یہ نتیجہ دیکھنا نصیب ہوا اور دوسری طرف جس کانگریس کے ساتھ انھوں نے اتحاد اور جن ہندوؤں کے ساتھ انھوں نے تعاون کیا تھا وہی دوسری راہ چل نکلے اور سنہ ۱۹۲۴ء سے ہندو مسلم فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور اس سارے عرصے میں کانگریس کے لیڈروں کو ان لوگوں کی مذمت کرنے کی کبھی ہمت نہیں ہوئی جو مسلمانوں کے ساتھ یہ مظالم کر رہے تھے ـــــ گویا مسلمانوں کو اس موقع پر دوسری شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک طرف جس مقصد کے لیے جان لڑائی تھی وہ مقصد فوت ہو گیا اور دوسری طرف جن لوگوں سے اتحاد کیا تھا وہ مسلمانوں سے لڑنے اور ان کو تباہ کرنے کے درپے ہو گئے، سب سے زیادہ انھوں نے گاندھی جی پر اعتماد کیا تھا اور انھیں اپنا لیڈر بنایا تھا مگر خود انھی کو کبھی اس بات کی توفیق نہ ہوئی کہ وہ مسلمانوں پر ہندوؤں کی زیادتی کے خلاف زبان کھولتے۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں پر یکایک ایک سخت مایوسی طاری ہو گئی اور ان کی ہمتیں ٹوٹ گئیں۔ میں اس زمانہ میں موجود تھا اور ان سارے حالات کا شاہد ہوں اور بکثرت ایسے لوگ بھی زندہ موجود ہیں جن کے سامنے یہ ساری تاریخ گزری ہے کہ کس طرح مسلمان ایک شدید مایوسی کا شکار ہو کر رہ گئے۔ اس کے ساتھ اس ساری لیڈرشپ سے مسلمانوں کا اعتماد اٹھ گیا جنھوں نے تحریک خلافت اٹھائی تھی اور اس میں کانگرس کے ساتھ اتحاد کیا تھا۔ اس طرح مسلمان مایوس بھی ہو گئے اور بے قیادت بھی رہ گئے۔ پوری قوم میں ایک ہمہ گیر اور شدید انتشار کی کیفیت رونما ہو گئی

اس انتشار کی حالت میں مسلمان اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ غیر مسلم ایک لیڈر کی لیڈرشپ میں پوری طرح متحد ہیں اور ہندوستان پر اپنے قبضہ کو مکمل کرنے کے لیے ہر ممکن جدّ و جہد میں مصروف ہیں اور دوسری طرف مسلمان بالکل اس قابل نہیں تھے کہ اس صورت حال کا مقابلہ کر سکیں اور اپنے تحفظ کی کوئی تدبیر اختیار کر سکیں۔

ایک طرف تو یہ مصیبت تھی اور دوسری طرف عین اس زمانے میں یہ فتنہ رونما ہوا کہ مسلمانوں کے اندر الحاد اور دہریت کی تحریکیں اٹھنی شروع ہوئیں اور اسلام کی حقانیت پر کھلّم کھلاّ حملے کیے جانے لگے۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ میں کبھی اس طرح کا اعلانیہ الحاد اور دہریت کی دعوت نہیں اٹھی تھی جس طرح کی اس زمانے میں اٹھی تھی۔ مسلمانوں کے تعلیمی اداروں میں کمیونزم کی اشاعت شروع ہو گئی ـــــ پورے پورے رسائل و جرائد اس غرض کے لیے نکلنے شروع ہو گئے کہ مسلمانوں میں الحاد اور دہریت کی تبلیغ کریں۔ اخلاقی بے قیدی کی تعلیم مسلمانوں کو دی جانے لگی۔ رفتہ رفتہ حالت یہ ہو گئی کہ لوگوں کو یہ بات عجیب معلوم ہونے لگی کہ کوئی شخص پڑھا لکھا بھی ہو اور وہ خدا کو بھی مانتا اور نماز روزہ جیسے احکام کی پیروی بھی کرتا ہو۔ یہ انداز نظر اس حد تک بدلا کہ لوگ یہ سمجھنے لگے کہ جو شخص نماز پڑھ رہا ہے اس کو اپنی حرکت پر شرمانا چاہیے، جو نہیں پڑھ رہا ہے اس کو شرمانے کی ضرورت نہیں ـــــ ایک طرف مسلمانوں کے سیاسی اور تہذیبی اور نظریاتی اختلال کا یہ عالم تھا اور اس کے ساتھ جس مصیبت میں یہ گرفتار تھے وہ یہ تھی کہ ان کی کوئی قابل اعتماد قیادت اس وقت موجود نہ تھی۔ جن لوگوں نے جنگ عظیم اوّل سے پہلے اور جنگ عظیم کے زمانے میں جس حد تک بھی ہو سکا تھا اسلام کے علم کو بلند رکھا تھا، وہ یا تو خاموش ہو چکے تھے۔ یا مسلمانوں کے اندر ان کے اثر و نفوذ کو نقصان پہنچ چکا تھا یا انھوں نے اسلام کی دعوت کا راستہ چھوڑ کر قومیت اور وطنیت کی دعوت کا راستہ اختیار کر لیا تھا ـــــ اس عالم میں صرف اقبال وہ شخص تھا جس نے اس پوری صورت حال کا مقابلہ کیا اور واقعہ یہ ہے کہ سنہ ۱۹۲۴ء سے سنہ ۱۹۳۸ء تک چودہ سال کی مدت میں ـــــ اسلامی تحریک اور اسلامی جذبہ کے احیا کے لیے اور مسلمانوں میں اسلامی اور ملّی شعور کو ابھارنے اور بیدار رکھنے کے لیے اگر کوئی سب سے بڑی طاقت کام کر رہی تھی تو وہ اکیلے اقبال کی طاقت تھی ـــــ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں کلام اقبال ر

سے اس کی سند پیش کروں جو لوگ بھی کلامِ اقبالؒ پر نگاہ رکھتے ہیں اور انھوں نے ان کی نظم و نثر پڑھی ہے وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ اقبالؒ نے ہندی مسلمانوں کے گرتے ہوئے وقار کو بچانے اور انھیں اپنے مٹتے ہوئے ملّی تشخص کو بچانے کے لیے کس طرح آمادۂ کار کیا اور اس غرض کے لیے انھوں نے نظم و نثر دونوں کی قوت سے کام لیا۔

اقبال رح کے کارنامے کو ہم مختلف عنوانات کے تحت بیان کر سکتے ہیں۔

(۱) انھوں نے مغربی تہذیب کا طلسم توڑا

سب سے اہم کام جو اقبال نے انجام دیا وہ یہ تھا کہ انھوں نے مغربیت اور مغربی مادّہ پرستی پر پوری قوت کے ساتھ ضرب لگائی۔ اگرچہ یہ کام اس وقت علمائے دین اہل مدارس اور خطیب حضرات بھی انجام دے رہے تھے مگر ان کی باتوں کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا جاتا تھا اور کہا جا سکتا تھا کہ یہ لوگ مغربی فلسفہ اور مغربی تہذیب و تمدن سے واقفیت نہیں رکھتے۔ لوگ ان اہل علم کی بات کو کچھ زیادہ وزن نہیں دیتے تھے جو اگرچہ دین سے تو واقف تھے لیکن مغربی علوم مغربی فلسفے، مغربی تہذیب اور مغربی زندگی سے پوری طرح واقف نہیں تھے ——— ان کے برعکس اقبالؒ وہ شخص تھا جس کے متعلق کوئی بڑا سے بڑا جدید آدمی اٹھ کر یہ دعوا نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اس سے زیادہ مغرب کو جانتا ہے اور اس سے زیادہ مغرب کے فلسفے اور مغربی علوم سے واقف ہے اس لیے جب اقبال نے مغربیت، مغربی مادہ پرستی، مغربی فلسفے اور مغربی افکار پر چوٹ لگائی تو مسلمانوں پر جو مغرب کی مرعوبیت طاری تھی وہ کافور ہونے لگی اور واقعہ یہ ہے کہ اس مرعوبیت کو توڑنے میں اکیلے اقبال کا کارنامہ سب سے بڑھ کر ہے۔

(۲) پیغام خودی

اگرچہ علامہ اقبال نے مسلمانوں کی جسمانی غلامی کو توڑنے کے لیے بھی کوشش کی اور ان کو آزادی کا سبق بھی دیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کا ذہن اگر غلام ہو تو خواہ اس کا جسم آزاد بھی ہو جائے تب بھی وہ قوم آزاد نہیں رہ سکتی۔ اس وجہ سے اقبال نے مسلمانوں کی ذہنی غلامی کو بھی ختم کرنے کی کوشش کی جو ان پر طاری ہو گئی تھی ———

اقبال کا یہ خودی کا فلسفہ، جس کے متعلق لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی چیستاں یا معمّہ ہے، یہ درحقیقت اس بات کے لیے تھا کہ مسلمان اپنے کو پہچانیں کہ وہ کیا ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے کو بھول گئے تھے۔ ان کو اپنی تاریخ سے شرم آتی تھی، وہ اپنی روایات اپنی تہذیب اپنے عقیدے اور اپنی اخلاقی اقدار کے بارے میں شدید احساس کمتری کا شکار ہو چکے تھے وہ سمجھتے تھے کہ اگر دنیا کی تاریخ میں کوئی قابل قدر چیز ہے تو وہ صرف اہل مغرب کی پیش کی ہوئی ہے۔ یہ صورت حال اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ مسلمانوں کی نئی نسلوں کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ ان کا اپنا سرمایہ کیا ہے۔ اس موقع پر اقبال مرحوم نے مسلمانوں کے اندر یہ احساس پیدا کیا کہ تم دنیا بھر میں سب سے زیادہ قابل فخر تہذیب رکھتے ہو۔ تمھارے پاس دنیا کا بہترین نظامِ حیات ہے اور تم سب سے زیادہ صحیح اور اعلا اقدار رکھتے ہو۔ اپنی خودی کو پہچانو اور اپنے آپ کو جانو کہ تم کیا ہو۔ تم نے اپنے آپ کو کھو دیا ہے اور اپنی حقیقت کو گم کر دیا ہے اور اپنے قومی تشخص کو سمجھو اور اپنی تہذیب کی سربلندی کے لیے سرگرم عمل ہو جاؤ۔

(۳) اسلام کی ابدی حقانیت کی شہادت

اس کے ساتھ اقبال نے مسلمانوں کے اندر یہ احساس پیدا کیا کہ اسلام کوئی پرانا اور از کار رفتہ نظام نہیں ہے جو اس زمانے میں کام نہ کر سکتا ہو۔ انھوں نے اپنے شعر سے بھی اور اپنی نثر سے بھی یہ بات مسلمانوں کے ذہن نشین کی کہ اسلام ازلی اور ابدی اصولوں کا حامل ہے۔ اسلام کسی وقت بھی پرانا نہیں ہو سکتا۔ اس کے اصول ہر زمانہ میں یکساں اور قابل عمل ہیں اگرچہ اسلام کی حقانیت کی شہادت اس وقت علمائے دین ممبروں پر بھی دے رہے تھے اور مدرسوں میں بھی، لیکن جب اس مغربی تہذیب کی آغوش میں پرورش پائے ہوئے مغربی فلسفے پر عبور رکھنے والے آدمی نے اٹھ کر اسلام کی حقانیت کی شہادت دی تو مسلمانوں کے قلوب و اذہان پر اس کا نہایت گہرا اور پائیدار اثر پڑا۔ اس وقت مختلف فتنوں اور یلغار کے درمیان مسلمانوں کی جو نسل گمراہ ہو رہی تھی اس کو بچانے کے لیے اہل منبر وہ کام نہیں کر سکتے تھے جو مغربی تعلیم یافتہ اور مغربی علوم میں مہارتِ کاملہ رکھنے والا یہ آدمی انجام دے سکتا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ جب اس نے ایک باوقار اعتماد اور

مجتہدانہ شان کے ساتھ اسلام کی حقانیت کی شہادت دی تو نئی نسل کے اندر ایک نیا اسلامی شعور پیدا ہوا۔

(۴) انھوں نے وطنی قومیت کا بت توڑ دیا

اس کے ساتھ علامہ اقبال نے جو عظیم کارنامہ انجام دیا وہ یہ ہے کہ انھوں نے وطنی قومیت اور قوم پرستی پر ایک شدید ضرب لگائی —— حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے قوم پرستی، نیشنلزم اور وطنی قومیت پر بروقت ضرب کاری نہ لگائی ہوتی تو آگے چل کر مسلمانوں کو کانگریس میں جذب کرنے کے لیے جو تحریک اٹھی تھی اس سے مسلمانوں کا بچ جانا محال تھا —— ایسے حالات میں جب کہ علمائے دین تک اٹھ کر مسلمانوں کو وطنی قومیت کا درس دینے لگے تھے اور مسلمانوں کے بڑے بڑے متقی علما تک مسلمانوں سے کہنے لگے تھے کہ وطنی قومیت سے تمھارے دین کو کوئی خطرہ نہیں۔ اس موقع پر یہ صرف اقبال تھا جس نے پوری شدت کے ساتھ اس تباہ کن تصور کا تار و پود بکھرا اور لوگوں کو پوری قوت کے ساتھ یہ بتایا کہ وطن بھی ایک بت ہے اور وطن کی پرستش کرنا بھی ویسا ہی شرک ہے جیسا کہ کسی بت کی پرستش کرنا شرک ہے، اگر اقبال نے یہ تعلیم بروقت نہ دی ہوتی تو بعد میں کانگریس نے رابطۂ عوام Mass Contact کی جو تحریک شروع کی تھی اور جس میں علما اور اشتراکی حضرات سبھی شریک تھے۔ وہ تحریک مسلمانوں کو ہندوؤں کے اندر اس طرح گھلا دیتی جیسے کہ نمک پانی کے اندر گھل جاتا ہے لیکن اقبال نے مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ قومیت وطن اور زبان سے نہیں بنتی ہے بلکہ قومیت دین اور عقیدے سے بنتی ہے۔ اس نے مسلمانوں میں اس شعور کو بیدار کیا کہ تم ایک عقیدہ اور ایک تہذیب رکھنے والی قوم ہو، تمھاری قومیت ان لوگوں سے بالکل مختلف ہے جن کی تہذیب عقیدہ و مسلک تم سے الگ ہے۔

(۵) عالم اسلام کی وحدت و اتحاد کی دعوت

اس کے ساتھ اقبال نے مسلمانوں کے اندر یہ احساس بھی ابھارا کہ تمام دنیا میں

ملتِ اسلامیہ ایک وحدت ہے اور اس کو ایک ہونا چاہیے —— اس طرح انھوں نے بیک وقت دو کام کیے —— باہر کی دنیا میں مسلمان جس طرح قوم پرستی میں مبتلا ہو کر ایک دوسرے کو کاٹ رہے تھے اور جس طرح ترکوں اور عربوں کے درمیان ایک المناک کشمکش برپا ہوئی اور اس کے نتیجہ میں مشرق اوسط اور تمام ممالک اسلامیہ جس مصیبت میں گرفتار ہوئے وہ سب اسی قوم پرستی کا نتیجہ تھا جس کی تبلیغ و اشاعت عیسائیوں نے عربوں اور ترکوں کے درمیان کی تھی —— ایک طرف تو اقبال نے تمام دنیا کے مسلمانوں کو اس بات کی دعوت دی کہ تم ایک ملت واحدہ ہو اور جس قوم پرستی میں تم مبتلا ہو یہ ایک بالکل غلط اور مہلک تصور ہے اور دوسری طرف انھوں نے ہندی مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ تم مسلم ہونے کی حیثیت سے ایک قوم اور ایک ملت ہو تمھارا کسی قوم میں جذب ہونا سراسر باطل نظریہ ہے —— اگر اقبال نے بروقت یہ اقدام نہ کیا ہوتا اور اسلامی قومیت کے صحیح تصور کی تبلیغ کر کے مسلمانوں کے اندر اپنی اسلامی قومیت کا احساس پیدا نہ کر دیا ہوتا تو آج اس پاکستان کا کہیں وجود نہ ہوتا ——!

آج اگر ہندوستان میں مسلمان ایک قوم کی حیثیت سے اپنے تہذیبی وجود پر اصرار کر رہے ہیں تو وہ بھی اسی تعلیم کی وجہ سے کر رہے ہیں جو اقبال نے اس وقت دی تھی، اور یہ پاکستان بھی اسی تعلیم کی وجہ سے معرضِ وجود میں آیا جس نے مسلمانوں میں اس احساس کو بیدار کر دیا کہ وہ ایک قوم اور ایک ملت ہیں۔

(۶) دین و سیاست کے متعلق ایک باطل تصور کی بیخ کنی

اقبال نے ایک بڑا کارنامہ یہ بھی انجام دیا کہ دین اور سیاست کی علاحدگی اور دین و دنیا کی تفریق کا جو تصور مغرب سے آ کر مسلمانوں میں پھیل رہا تھا اور جس کی وجہ سے لوگ یہ سمجھنے لگے تھے کہ اہل دین کو سیاست سے کیا تعلق اور دین کو سیاست میں گھسیٹنے کا کیا کام، اقبال نے اس باطل تصور کا ٹھیک وقت پر مقابلہ کیا۔ اس نے دین بے سیاست کی بھی برملا مذمّت کی اور سیاست بے دین کو بھی علانیہ مذموم قرار دیا۔ سیاست بے دین کے متعلق اقبال کا ایک مصرعہ ایسا ہے کہ اس موضوع پر تمام

دنیا کا لٹریچر ایک طرف اور وہ مصرعہ ایک طرف ——— اس کا کہنا ہے کہ

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اگر آپ اس موضوع پر دنیا بھر کی کتابیں پڑھ ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ اس مصرعہ میں ان سب کا خلاصہ اور عطر نکال کر رکھ دیا ہے اقبال نے ان الفاظ سے دراصل یہ بات ذہن نشین کی ہے کہ جب تم سیاست کو دین سے الگ کرتے ہو تو اس کا نتیجہ سوائے وحشت و بربریت اور ظلم و ستم کے اور کچھ نہیں ہو سکتا سیاست صرف اس صورت میں ٹھیک رہ سکتی ہے جب کہ دین اس کو صحیح راستہ پر قائم رکھنے کے لیے ایک راہنما قوت کی حیثیت سے اس کے ساتھ موجود ہو۔

اس طرح سے مسلمانوں کے دماغوں میں یہ خیال جاگزیں ہو چکا تھا کہ اہل دین کا کام تو بس اللہ اللہ کرنا ہے یا مسجدوں اور مدرسوں میں حفظ قرآن و حدیث پڑھانا ہے۔ ان کا سیاست سے بھلا کیا تعلق ——— اس غلط تصور پر بھی اقبال نے ایک ضرب کاری لگائی ہے اور اس کو بھی ایک مصرعے میں بیان کر دیا اور واقعہ یہ ہے کہ اس موضوع پر جتنا کچھ لکھا جا سکتا ہے وہ سب ایک طرف اور وہ مصرع ایک طرف! ——— اقبال کہتا ہے کہ ع

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

اس ایک مصرعہ میں یہ سب حقیقت کھول دی گئی ہے کہ اگر دین کے پاس اپنے عقیدے اور نظام کو نافذ کرنے کے لیے طاقت نہیں ہے تو طاقت جس شخص یا گروہ یا نظام کے پاس ہے وہ دنیا کو اپنے راستہ پر ہانک کرلے جائے گا آپ کے لیے کلیمی کرنے کا کیا موقع باقی رہے گا اور وہ کلیمی کہاں بروئے عمل آئے گی۔

(۷) انسان کے تراشیدہ نظاموں کی تغلیط و مذمت

اقبال نے پورے زور کے ساتھ یہ بات بھی لوگوں کے ذہن نشین کی کہ موجودہ زمانہ کے ازم انسانیت کے دکھوں کا مداوا نہیں ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں جتنا ظلم و ستم فساد و غارت گری اور انسانیت کے لیے آلام و مصائب رونما ہوئے ہیں وہ سب انہی ازموں کا کیا دھرا ہے یہی وجہ ہے کہ اقبال نے ان ازموں میں سے جس طرح

سرمایہ داری کی مذمت کی ہے اسی طرح سے اس نے اشتراکیت کی بھی مذمت کی ہے۔
ان کا آخری پیغام جو انھوں نے اپنی وفات سے دو ڈھائی مہینے پہلے آل انڈیا ریڈیو سے دیا تھا اور غالباً ان کو یہ پتہ بھی نہیں تھا کہ وہ یہ آخری پیغام دنیا کو دے رہے ہیں اس میں انھوں نے بالکل وضاحت کے ساتھ بتایا ہے کہ اس وقت انسانیت جن مصائب میں گرفتار ہے اور جس ہلاکت اور تباہی کی طرف بڑھ رہی ہے وہ سب ان ازموں کی وجہ سے ہے۔ ان کے اس پیغام پر مشکل سے دو سال گزرے تھے کہ وہ تباہی جنگ عظیم دوم کی صورت میں دنیا پر مسلّط ہوئی اور اس کے بعد بھی اس کا خطرہ مستقل طور پر موجود ہے۔ انھوں نے وضاحت کے ساتھ یہ بتایا تھا کہ انسانوں کے یہ خود تراشیدہ ماڈرن ازم ہی دراصل انسان کے مصائب کا سرچشمہ ہیں اور انہی ازموں نے اس وقت انسانیت کو مصیبت عظمیٰ میں مبتلا کیا ہے اور اس کے لیے تباہی اور ہلاکت کی راہیں ہموار کی ہیں انھوں نے اپنے اس پیغام میں اشتراکیت، سرمایہ داری، ملوکیت، آمریت نازیت اور فسطائیت سبھی کی مذمت بھی کی ہے اور انھیں انسانیت کے لیے مہلک بھی قرار دیا ہے۔

(۸) اسلام اور صرف اسلام

اس کے ساتھ اقبال نے مثبت طور پر یہ بات مسلمانوں کے ذہن نشین کی ہے کہ تمہاری مصیبتوں اور مصائب کا اگر کوئی حل ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ تم قرآن کی پیروی کرو اور اپنی زندگیوں پر اسلام کے آئین کو نافذ کرو ——— انھوں نے ۱۹۳۷ء میں قائد اعظم کے نام خط لکھا تھا اس میں واضح طور پر یہ بتایا تھا کہ مسلمانوں کے معاشی مسائل کا اگر کوئی حل ہے تو وہ صرف اسلامی آئین کے نفاذ میں مضمر ہے۔

(۹) کیا اقبال سوشلسٹ تھا؟

یہ وہ کارنامہ تھا جو اقبال نے اپنی زندگی میں انجام دیا۔ اب اسی کے مقابلہ میں اس الزام کی حقیقت دیکھیے کہ اقبال سوشلسٹ تھے
کسی آدمی کی فکر اور نقطۂ نظر کو جانچنے کے لیے اس کی کسی عبارت سے کوئی آدھ فقرہ سیاق و سباق سے الگ نکال کر اس سے کوئی نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں ہوتا۔ دیکھنا

یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص بحیثیت مجموعی کس نظام فکر کے لیے برسوں کام کرتا رہا اور فی الجملہ اس نے کیا کارنامہ انجام دیا اس لحاظ سے اگر اقبال کے سارے کام کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف اسلام کا داعی تھا کسی دوسرے نظریے اور نظام کا داعی نہیں تھا ——— وہ اس بات کا ہرگز قائل نہیں تھا کہ اسلام کے سوا کسی چیز کو یا اسلام کے ساتھ کسی چیز کو اختیار کرکے ہماری نجات ہو سکتی ہے۔ اب یہ ایک عجیب لطیفہ ہے کہ جن لوگوں نے اقبال کی زندگی میں اس کے اس کام کی وجہ سے اُسے رجعت پسند قرار دیا تھا اور اس بنا پر قرار دیا تھا کہ یہ شخص ایک صدیوں پرانے نظام کی طرف لوگوں کو بلا رہا ہے اور اس کی بنیاد پر لوگوں کو جمع کرنے کی کوشش کر رہا ہے آج وہی لوگ اس کی وفات کے بعد کہہ رہے ہیں کہ وہ اسلام کا نہیں بلکہ سوشلزم یا اسلامی سوشلزم کا قائل تھا یعنی پہلے اس شخص کو جب کہ اس کے اصلی خیالات سامنے آئے اس بنا پر رجعت پسند قرار دیا کہ اس کے دلائل ونظریات کا توڑ کرنا ان کے بس میں نہیں تھا اور جس نظریے اور نظام کی طرف وہ ان کو بلا رہا تھا اس کے یہ لوگ دشمن تھے لیکن اس کے بعد جب دیکھا کہ اس شخص کی گرفت (Hold) تعلیم یافتہ طبقے کے دماغوں پر بہت مضبوط ہو چکی ہے اور اس کی فکر قبول عام کی سند اختیار کر چکی ہے اس لیے اب اس کی مذمت نہیں کی جا سکتی تو انھوں نے کہا کہ اچھا اگر اس کو Condemn نہیں کر سکتے تو اس کو Covert کرو اور کہو کہ وہ تو سوشلزم کا قائل تھا اور یہ سوشلزم بھی اقبال کے کلام سے برآمد کس طرح کیا جاتا ہے ذرا ایک نظر ادھر بھی دیکھ لیجیے۔

ان کا مشہور شعر ہے کہ ؎

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اوّل تو آپ یہ دیکھیں کہ جس سلسلۂ کلام میں انھوں نے یہ بات فرمائی ہے، اس کے اندر اس شعر کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ اے اشتراکی گوریلو اٹھو اور لوگوں کے کھیتوں کو جلا دو ——— سلسلۂ کلام یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرما رہا ہے کہ دنیا میں جو ظلم وستم برپا ہے یہ ہمارے عذاب کو دعوت دے رہا ہے اور اگر لوگوں کے درمیان انصاف قائم نہ کیا گیا تو تمھیں یہ اجازت بلکہ حکم ہے کہ ان سب کھیتوں کو جلا دو،

جن سے دہقاں کو روزی میسر نہیں آتی گویا یہ فرمان آدمیوں کے لیے نہیں تھا بلکہ یہ بات شاعر کے تخیل کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں سے کہی تھی۔

لیکن فرض کیجیے کہ اگر اس سلسلۂ کلام سے صرف نظر بھی کر لیا جائے تب بھی شعر کا یہ مفہوم اخذ کرنا صحیح نہیں۔ ایک شاعر کسی مضمون کو ادا کرنے کے لیے جب کسی بات پر زور دیتا ہے تو وہ مبالغ کی زبان استعمال کرتا ہے۔ یہ سخن فہمی سے آدمی کی محرومی کی علامت ہے کہ وہ شاعر کے کسی شعر کو مفتی کا فیصلہ سمجھ بیٹھے۔ مثال کے طور پر آپ دیکھیں کہ غالب نے کہا تھا ؎

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

اب کیا واقعی غالب کے پیش نظر یہ بات تھی کہ اس کا ممدوح کروڑوں سال زندہ رہے ظاہر بات ہے کہ اس کے پیش نظر یہ بات نہیں تھی بلکہ اس کا مقصد اس کے حق میں درازیٔ عمر کی دعا کرنا تھا۔ اس بات کو ادا کرنے کے لیے اس نے مبالغے کی زبان استعمال کی اور مبالغہ شعر میں حسن پیدا کرتا ہے ——— اگر اقبال اس موضوع پر کوئی تقریر کرتے کہ لوگوں کے اندر بے انصافی پائی جاتی ہے اور ان کے حقوق پامال کیے جا رہے ہیں اس لیے اس ظلم اور بے انصافی کا ازالہ ہونا چاہیے تو وہ کبھی اس مقصد کے لیے لوگوں کو یہ نہ کہتے کہ جاؤ اور جا کر کھیتوں کے خوشۂ گندم کو جلا دو۔ اور بالفرض اگر کوئی شخص جا کر ان سے کھیتوں کو جلانے کی اجازت مانگتا تو وہ کبھی اس کی اجازت یا حکم نہ دیتے۔ شعر کی زبان میں یہ بات سمجھانے کے لیے، جہاں فی الواقع لوگوں کے ساتھ انصاف نہ ہو رہا ہو وہاں لوگوں کو سبق سکھانے اور سزا دینے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے مبالغے کی زبان اور شاعرانہ طرز ادا سے کام ضرور لیا۔ لیکن یہ کسی مفتی کا فتویٰ یا قاضی کا فیصلہ نہیں تھا۔

(۱۰) اقبال اور اسلامی سوشلزم

اس طرح اگر اقبال نے کبھی اپنی کسی تحریر میں اسلامی سوشلزم کا لفظ استعمال کیا تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اقبال نے اسلامی سوشلزم کا کوئی فلسفہ ایجاد کیا تھا اور اپنی ساری عمر وہ اس فلسفے کی تبلیغ کرتے رہے ——— بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کا یہ

اندازہ بھی نہیں ہوتا کہ آگے چل کر بعض خاص لوگ کسی لفظ کو کیا معنی پہنانے والے ہیں۔ اس وقت اقبال نے جو بات کہی تھی وہ یہ تھی کہ معاشرتی اور اجتماعی انصاف (Social Justice) کے لیے کسی سوشلزم کی طرف جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ سب کچھ تو اسلام میں بھی موجود ہے بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اسلام ہی میں موجود ہے۔ اس غرض کے لیے اگر کسی وقت انھوں نے یہ لفظ استعمال کر بھی لیا جیسا کہ قاعداعظم نے بھی کبھی یہ لفظ استعمال کر لیا ہوگا تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یہ ان کا کوئی مستقل فلسفہ یا نظریہ تھا۔ آدمی کا فلسفہ یا نظریہ وہ ہوتا ہے جس کی تبلیغ و تلقین اور اس کی تشریح اور توضیح میں وہ اپنی قوتیں کھپاتا ہے۔ اقبال نے تبلیغ میں تو اپنی ساری قوتیں اسلام کے لیے کھپائیں اور سارا زور لوگوں کو اس بات کی طرف بلانے کے لیے صرف کیا کہ تم اسلام کے فلسفہ زندگی اور نظریہ حیات کو اختیار کرو لیکن اگر اٹھ کر اس کی طرف یہ بات منسوب کر دی جائے کہ وہ سوشلزم کا قائل تھا تو اس سے زیادہ بے انصافی کی بات کیا ہو سکتی ہے اگر اقبال اسلامی سوشلزم کے قائل ہوتے تو اس کے اصول و تفاصیل بیان کرتے اور بتاتے کہ اس سے ان کی مراد کیا ہے اور پھر لوگوں کو اس کی تبلیغ و تلقین بھی کرتے مگر اس بات کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے کہ انھوں نے کبھی ایسا کیا ہو ـــ اس لیے یہ ایک صریح علمی بددیانتی Intellectual Dishonesty ہے کہ کوئی آدمی کسی صاحب فکر کی طرف ایک ایسا نظریہ منسوب کر دے جو درحقیقت اس کا ہے ہی نہیں۔

سوشلزم یا کسی دوسرے غیر اسلامی نظریہ و فکر کے برعکس اقبال نے تو بڑی وضاحت اور قطعیت کے ساتھ مسلمانوں کو یہ تصور دیا کہ محض سیاسی آزادی یا اقتصادی بہبود ہی تمھارا مقصود نہیں ہے بلکہ اسلام کی حفاظت تمھارا اصل مقصد ہے اس نے بار بار یہ بات لوگوں کے ذہن نشین کی تھی کہ ہمارا عقیدہ ہماری تہذیب ہماری روایات اور ہماری اخلاقی اقدار ہی ہمارے لیے اصل چیزیں ہیں محض روٹی یا زمین کا ٹکراؤ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کے لیے ایک مسلمان جیے یا مرے اقبال نے واضح طور پر یہ کہا تھا کہ مسلمانوں کو ایک وطن صرف اس لیے چاہیے کہ وہ وہاں اسلام کے اصولوں پر زندگی بسر کر سکیں ان کی ۱۹۳۰ء کی تقریر سے جس میں انھوں نے پاکستان کی اصطلاح بیان کیے بغیر پاکستان کا تخیل پیش کیا تھا یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ ان کی نظر میں اگر کوئی چیز اہم تھی تو صرف

یہ کہ کسی طرح اسلام اور اہل اسلام کو سربلندی نصیب ہو وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں ہندوؤں کے ساتھ رہ کر مسلمان اپنی تہذیب پر قائم نہیں رہ سکتے" اس لیے انھوں نے صرف مسلمانوں کی تہذیب کو زندہ رکھنے کے لیے ایک آزاد مملکت کے حصول کا تصور پیش کیا ـــ ان سب چیزوں کو دیکھنے کے بعد محض کسی ایسے لفظ یا اصطلاح کی بنیاد پر جو انھوں نے اتفاقاً کسی موقعہ پر کسی دوسرے سیاق و سباق (Context) میں کسی دوسرے مفہوم میں استعمال کی ہو۔ ان کی طرف خاص نظریے کو منسوب کرنا صریح بددیانتی بھی ہے اور مسلمانوں کو دھوکا فریب دینا بھی ہے۔

آخری بات

اس سلسلے میں آخری بات جو آپ سے کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اقبال مرحوم اور قائداعظم مرحوم آپ کو اسلام کی بنیاد پر ایک وطن دے گئے ہیں۔ اقبال نے آپ کو فکر اور نظریہ دیا اور قائداعظم کی قیادت میں آپ کو یہ وطن حاصل ہوا اس وطن کی انوکھی شان یہ ہے کہ اس کا نظریہ پہلے وجود میں آیا اور ملک بعد میں بنا۔ اگر اس ملک کے بنیادی نظریہ کو یا دوسرے لفظوں میں اس کی نظریاتی بنیاد کو ہٹا دیا جائے تو یہ ملک قائم نہیں رہ سکتا۔ آج اس ملک کی نظریاتی بنیاد پر مختلف اطراف سے حملے کیے جا رہے ہیں لیکن کیا آپ اس چیز کو جو اتنی محنتوں اور عظیم قربانیوں کے نتیجے میں حاصل ہوئی ہے۔ یوں ہی غفلت اور کوتاہ ہمتی سے ضائع کر دیں گے ـــ؟ میں کہتا ہوں کہ اگر آپ نے اس کو کھو دیا تو گویا تاریخ انسانی میں یہ بات ثابت کریں گے کہ یہ ایک بیوقوف قوم تھی جس نے لاکھوں جانوں ان گنت عصمتوں اور کروڑوں عربوں روپوں کی جائدادیں قربان کر کے ایک وطن حاصل کرنے کے بعد ۲۳ برس کی مدت کے اندر ہی اندر اس کو کھو بھی دیا۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو تاریخ میں آپ کا مقام ایک بیوقوف اور احمق قوم کی حیثیت سے باقی رہ جائے گا (بشرطیکہ آپ کی تاریخ کو باقی رہنے دیا گیا) اگر آج آپ نے اشتراکیت اور وطنی قومیت کے نظریے یا کسی اور باطل ازم کو اختیار کیا تو صرف یہی نہیں کہ آپ کی آزادی ختم ہو جائے گی بلکہ میں کہتا ہوں کہ آپ کا وجود بھی ختم ہو جائے گا اور مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اسپین کے بعد تاریخ کا دوسرا بھیانک المیہ ہوگا کہ اس برصغیر میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی امت کا خاتمہ ہو گیا۔ خدا نہ کرے ایسا وقت ہم پر آئے۔

اس وجہ سے یہ وقت ہے کہ مسلمانوں کے نوجوان، مرد اور عورتیں بچے اور بوڑھے سب اس بات کے لیے متحد ہو جائیں کہ وہ یہاں اسلام کا نظام ہی غالب کریں گے اور ان لوگوں کی کوششوں کو قطعی طور پر ناکام بنا دیں گے جو مسلمانوں کو اسلام کے عقیدے اور نظامِ حق سے منحرف کرنا چاہتے ہیں اور اس طرح ان کو فتنوں میں مبتلا کر کے تباہی کی طرف ڈھکیلنا چاہتے ہیں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ط

(ماہنامہ تجلّی دیوبند جولائی ۱۹۷۰ء)

فہرستِ اشعار

۱ اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب — بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں
۲ الفاظ و معنی میں تفاوت نہیں لیکن — مُلّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
۳ آزادیِ افکار سے ہے ان کی تباہی — رکھتے نہیں جو فکر و تدبّر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیِ افکار — انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ
۴ اس مردِ خدا سے کوئی نسبت نہیں تجھ کو — تو بندۂ آفاق ہے وہ صاحبِ آفاق
۵ اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو — قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
۶ اگر جہاں میں میرا جوہر آشکارا ہوا — قلندری سے ہوا ہے تونگری سے نہیں
۷ اپنی ملّت کو قیاس اقوامِ مغرب پر نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
۸ ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوّتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
۹ آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا — آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا
۱۰ اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ — مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
۱۱ اے مردہ صد سالہ! تجھے کیا نہیں معلوم — ہر موت کا پوشیدہ تقاضا ہے قیامت
۱۲ اے مردِ خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل — جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد
۱۳ اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم — ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف
۱۴ ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے — جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
۱۵ احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسّر — تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پازند!
۱۶ اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی — نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق
۱۷ اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش — میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

۱۸ آگ اس کی پھونک دیتی ہے برنا و پیر کو
لاکھوں میں ایک بھی ہو اگر صاحبِ یقیں

۱۹ الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ دین، مرد آزما مرد آفریں

۲۰ اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

۲۱ ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

۲۲ بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہیے

۲۳ براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

۲۴ بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

۲۵ بندۂ مومن کا دل بیم و رِیا سے پاک ہے
قوتِ فرمانروا کے سامنے بیباک ہے

۲۶ بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

۲۷ پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

۲۸ پھر نہ کر سکتی حباب اپنا اگر پیدا ہوا
توڑنے میں اس کے یوں ہوتی نہ بے پروا ہوا

۲۹ پیرِ حرم کو دیکھا ہے میں نے
کردار بے سوز گفتار واہی

۳۰ پیرانِ کلب ہوں کہ شیخانِ حرم ہوں
نے جدّتِ گفتار ہے نے جدّتِ کردار

۳۱ تم اُسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

ہے وہی شعر و تصوّف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

۳۲ تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

۳۳ ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشّاف

۳۴ تم نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

۳۵ تا خلافت کی بِنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

۳۶ تری طبیعت ہے اور تیرا زمانہ ہے اور
تیرے موافق نہیں خانقہی سلسلہ!

۳۷ تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

۳۸ جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

۳۹ جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

۴۰ جو عالمِ ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد
ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ

۴۱ جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی
مرے کلام پہ حجّت ہے نکتۂ لولاک

۴۲ جب پیرِ فلک نے ورق ایّام کا اُلٹا
آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز

۴۳ آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل
دنیا تو ملی، طائرِ دیں کر گیا پرواز

۴۴ جاتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

۴۵ جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

۴۶ چہ کافرانہ قمارِ حیات می بازی
کہ با زمانہ بسازی بخود نمی سازی

۴۷ حریف اپنا سمجھ رہے ہیں مجھے خدایانِ خانقاہی
انھیں یہ ڈر ہے کہ میرے نالوں سے شق نہ ہو سنگِ آستانہ

۴۸ حدیثِ بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ با تو نسازد، تو با زمانہ ستیز

۴۹ حلقۂ صوفی میں ذکر بے نم و بے سوز و ساز
میں بھی رہا تشنہ کام تو بھی رہا تشنہ کام

۵۰ خموش اے دل بھری محفل میں چلّانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبّت کے قرینوں میں

۵۱ خاکی و نوری نہاد بندہ مومن صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز

۵۲ خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

۵۳ زباں سے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

۵۴ خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں
زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا!

۵۵ درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلّی نہ صفاہاں نہ سمرقند

۵۶ دنیا کو ہے اس مہدیِ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار

۵۷ دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

۵۸ رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا
اتر گیا جو ترے دِل میں لا شریک لہ

۵۹ رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا

۶۰ رِشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

۶۱ رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے

نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

۶۲ سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

۶۳ سماں الفقر فخری کا رہا شانِ امارت میں
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

۶۴ سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا
ہے ایسا عقیدہ اثرِ فلسفہ دانی

۶۵ سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

۶۶ سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر، جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

۶۷ ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

۶۸ سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندہ مومن کا بے زری سے نہیں

۶۹ سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا
چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیری

۷۰ شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب

۷۱ شیر مردوں سے ہوا بیشہ تحقیق تہی
رہ گئے صوفی و مُلّا کے غلام اے ساقی

۷۲ شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں
خود جلیں، دیدہ اغیار کو بینا کر دیں

۷۳ شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

۷۴ شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

۷۵ شاعر بھی ہیں پیدا علما بھی حکما بھی
خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ

مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک
ہر ایک ہے گو شرحِ معانی میں یگانہ

بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رمِ آہو
باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ

کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند
تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ

۷۶ صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لاالٰہ میں ہے

۷۷ عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

۷۸ عجب واعظ کی دینداری ہے یا رب
عداوت ہے اسے سارے جہاں سے

۷۹ عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش

۸۰ عام حرّیت کا دیکھا تھا جو خواب اسلام نے
اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

۸۱ علاجِ ضعفِ یقیں ان سے ہو نہیں سکتا
غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق

۸۲ عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

۸۳ فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

۸۴ فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر

باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے
یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر

ہم پوچھتے ہیں شیخ کلیسا نواز سے
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر

حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات
اسلام کا محاسبہ، یورپ سے درگزر

۸۵ فقیہہ شہر بھی رہبانیت پر ہے مجبور
کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست

۸۶ فریبِ نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرّۂ کائنات

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

۸۷ فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملّت کے گناہوں کو معاف

۸۸ فقیہہ شہر کی تحقیر کیا مجال مری
مگر یہ بات کہ میں ڈھونڈتا ہوں دل کی کشاد!

۸۹ قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد

۹۰ قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

۹۱ قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

۹۲ کیوں ہراساں ہے صہیلِ فرسِ اعدا سے
نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفسِ اعدا سے

۹۳ کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

۹۴ کہتا ہے زمانے سے یہ درویشِ جوانمرد
جاتا ہے جدھر بندۂ حق تو بھی ادھر جا

۹۵ کشتیِ مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم
علمِ موسیٰ بھی ہے جس کے سامنے حیرت فروش

۹۶ کس درجہ یہاں عام ہوئی مرگِ تخیّل
ہندی بھی فرنگی کا مقلّد عجمی بھی

۹۷ کس طرح ہوا کند ترا نشترِ تحقیق
ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک؟

۹۸ کشادہ دستِ کرم جب وہ بے نیاز کرے
نیاز مند نہ کیوں عاجزی پہ ناز کرے

۹۹ کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

۱۰۰ گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیِ احرار

وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

۱۰۱ گلہ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بتکدہ میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ”ہری ہری“

۱۰۲ لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی
ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی

۱۰۳ مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے ملّا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی

۱۰۴	میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہوگا	مسائلِ نظری میں اُلجھ گیا ہے خطیب
۱۰۵	مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار	انتہائے سادگی میں کھا گیا مزدور مات
۱۰۶	مسکینی و محکومی و نومیدیٔ جاوید	جس کا یہ تصوّف ہو وہ اسلام کر ایجاد
۱۰۷	مُلّا کو ہے جو ہند میں سجدہ کی اجازت	نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد
۱۰۸	میراث میں آئی ہے انھیں مسندِ ارشاد	زاغوں کے تصرّف میں عقابوں کے نشیمن
۱۰۹	موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے	نے کوئی فغفور و خاقان، نے فقیرِ رہ نشیں
۱۱۰	میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی	شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی!
۱۱۱	مسلماں ہے توحید میں گرم جوش	مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش
	تمدّن، تصوّف، شریعت، کلام	بتانِ عجم کے پجاری تمام
	حقیقت خرافات میں کھو گئی	یہ اُمّت روایات میں کھو گئی
	لبھاتا ہے دِل کو کلامِ خطیب	مگر لذّتِ شوق سے بے نصیب
	بیاں اس کا منطق سے سُلجھا ہوا	لغت کے بکھیڑوں میں اُلجھا ہوا
	وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد	محبّت میں یکتا، حمیّت میں فرد
	عجم کے خیالات میں کھو گیا	یہ سالک مقامات میں کھو گیا
۱۱۲	محسوس پر بنا ہے علومِ جدید کی	اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا چور چور
۱۱۳	نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق اُن کو	آنکھ جن کی ہوئی محکومی و تقلید سے کور
۱۱۴	نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے	جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے
۱۱۵	نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقیں	اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز
۱۱۶	نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی	اُڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گزر
۱۱۷	نذرانہ نہیں سود ہے پیرانِ حرم کا	ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن
۱۱۸	نااہل کو حاصل ہے کبھی قوت و جبروت	ہے خوار زمانے میں کبھی جوہرِ ذاتی
۱۱۹	وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمّت سے	زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا
۱۲۰	وہی سجدہ ہے لائقِ اہتمام	کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام
۱۲۱	وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش	جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام
۱۲۲	وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا	کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

۱۲۳	وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے	نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے
۱۲۴	وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہے محروم	حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
۱۲۵	وحدت کی حفاظت نہیں بے قوتِ بازو	آتی نہیں کچھ کام یہاں عقلِ خداداد
۱۲۶	ہند میں حکمتِ دیں کوئی کہاں سے سیکھے	نہ کہیں لذتِ کردار نہ افکارِ عمیق
	حلقۂ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں	آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق
۱۲۷	ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم	رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
۱۲۸	ہے اس کی طبیعت میں تشیّع بھی ذرا سا	تفضیلِ علی ہم نے سنی اس کی زبانی
۱۲۹	ہے وہاں بے حاصلی کشتِ اجل کے واسطے	سازگار آب و ہوا تخمِ عمل کے واسطے
۱۳۰	ہوتا ہے کوہ و دشت میں پیدا کبھی کبھی	وہ مرد جس کا فقر خزف کو کرے نگیں
۱۳۱	ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم	کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
	دریا میں موتی، اے موجِ بے باک!	ساحل کی سوغات خار و خس و خاک
۱۳۲	ہوئے مدفونِ دریا زیرِ دریا تیرنے والے	طمانچے موج کے کھاتے تھے جو بن کر گہر نکلے
۱۳۳	ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا	کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام
۱۳۴	ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت	احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات
۱۳۵	ہے آبِ حیات اسی جہاں میں	شرط اس کے لیے ہے تشنہ کامی
۱۳۶	ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام	جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
۱۳۷	ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ	تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے
۱۳۸	ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی	ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
۱۳۹	ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں	راہ دکھلائیں کسے؟ رہروِ منزل ہی نہیں
	تربیت عام تو ہے جوہرِ قابل ہی نہیں	جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گِل ہی نہیں
۱۴۰	یہ ذکرِ نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور	تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
۱۴۱	یقیں محکم عمل پیہم محبّت فاتحِ عالم	جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
۱۴۲	یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے	حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
۱۴۳	یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں	یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری
۱۴۴	یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے	ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات
۱۴۵	یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید	کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون

۱۴۶ یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی

۱۴۷ یہ اتفاق مبارک ہو مومنوں کے لیے
کہ ایک زباں ہیں فقیہانِ شہر میرے خلاف

۱۴۸ یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تو کر
کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریق خانقاہی

۱۴۹ یہ دنیا دعوتِ دیدار ہے فرزندِ آدم کو
کہ ہر مستور کو بخشا گیا ہے ذوقِ عریانی

۱۵۰ یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و ملّا ملوکیت کے ہیں بندے تمام

۱۵۱ یہ مصرع لکھ دیا کسی شوخ نے محرابِ مسجد پر
یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقتِ قیام آیا

۱۵۲ تیرا امام بے حضور تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گزر ایسے امام سے گزر

۱۵۳ بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی حدوں سے
ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر

۱۵۴ جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت

بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبّت کے لیے علم و ہنر موت

۱۵۵ نگاہ پاک تیری ہے تو پاک ہے دل بھی
کہ دل کو حق نے کیا ہے نگاہ کا پیرو

۱۵۶ آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے
وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر

۱۵۷ نے پردہ، نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

(ابلیس کی مجلس شوریٰ)

تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ:[۲۵]

(۱) تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو، مگر صرف اس کی۔[۲۶]

۲۵؎ یہاں وہ بڑے بڑے بنیادی اصول پیش کیے جا رہے ہیں جن پر اسلام پوری انسانی زندگی کے نظام کی عمارت قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا منشور ہے جسے مکی دور کے خاتمے اور آنے والے مدنی دور کے نقطۂ آغاز پر پیش کیا گیا، تاکہ دنیا بھر کو معلوم ہو جائے کہ اس نئے اسلامی معاشرے اور ریاست کی بنیاد کن فکری، اخلاقی، تمدنی، معاشی اور قانونی اصولوں پر رکھی جائے گی۔ اس موقع پر سورۂ انعام رکوع ۱۹ اور اس کے حواشی پر بھی ایک نگاہ ڈال لینا مفید ہو گا۔

۲۶؎ اس کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی پرستش اور پوجا نہ کرو، بلکہ یہ بھی ہے کہ بندگی اور غلامی اور بے چون و چرا اطاعت بھی صرف اسی کی کرو، اسی کے حکم کو حکم اور اسی کے قانون کو قانون مانو اور اس کے سوا کسی کا اقتدارِ اعلا تسلیم نہ کرو۔ یہ صرف ایک مذہبی عقیدہ اور صرف انفرادی طرزِ عمل کے لیے ایک ہدایت ہی نہیں ہے بلکہ اس پورے نظامِ اخلاق و تمدّن و سیاست کا سنگِ بنیاد بھی ہے جو مدینہ طیّبہ پہنچ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً قائم کیا۔ اس کی عمارت اسی نظریے پر اٹھائی گئی تھی کہ اللہ جل شانہٗ ہی ملک کا مالک اور بادشاہ ہے اور اسی کی شریعت ملک کا قانون ہے۔

تفہیم القرآن ۲ ۶۰۹

الفاظ و معنی میں تفاوت نہیں لیکن
ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

(حال و مقام)

توحید کا یہ تصور محض ایک مذہبی عقیدہ نہیں ہے جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں ، اس سے اجتماعی زندگی کا وہ پورا نظام جو انسان کی خود مختاری ، یا غیر اللہ کی حاکمیت والوہیت کی بنیاد بنا ہو، جڑ بنیاد سے اکھڑ جاتا ہے اور ایک دوسری اساس پر نئی عمارت تیار ہوتی ہے۔ آج دنیا آپ کے موذنوں کو اشھد ان لا الہ الا اللہ کی صدا بلند کرتے ہوئے اس لیے ٹھنڈے پیٹوں سن لیتی ہے کہ نہ پکارنے والا جانتا ہے کہ کیا پکار رہا ہوں نہ سننے والوں کو اس میں کوئی معنی اور کوئی مقصد نظر آتا ہے۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس اعلان کا مقصد یہ ہے اور اعلان کرنے والا جان بوجھ کر اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ میرا کوئی بادشاہ یا فرمان روا نہیں ہے۔ کوئی حکومت میں تسلیم نہیں کرتا ، کسی قانون کو میں نہیں مانتا ، کسی عدالت کے حدود و اختیارات Jurisdiction مجھ تک نہیں پہنچتے۔ کسی کا حکم میرے لیے حکم نہیں ہے کوئی رواج اور کوئی رسم مجھے تسلیم نہیں۔ کسی کے امتیازی حقوق ، کسی کی ریاست ، کسی کا تقدیس ، کسی کے اختیارات میں نہیں مانتا ایک اللہ کے سوا میں سب سے باغی اور سب سے منحرف ہوں تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس صدا کو کہیں بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ آپ خواہ کسی سے لڑنے جائیں یا نہ جائیں ، دنیا خود آپ سے لڑنے آجائے گی - یہ آواز بلند کرتے ہی آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ یکایک زمین و آسمان آپ کے دشمن ہو گئے ہیں اور ہر طرف آپ کے لیے سانپ ، بچھو اور درندے ہی درندے ہیں۔

یہی صورت اس وقت پیش آئی جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آواز بلند کی۔ پکارنے والے نے جان کر پکارا تھا اور سننے والے سمجھتے تھے کہ کیا پکار رہا ہے اس لیے جس جس پر جس پہلو سے بھی اس پکار کی ضرب پڑتی تھی وہ اس آواز کو دبانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ پجاریوں کو اپنی برہمنیت و پاپائیت کا خطرہ اس میں نظر آیا۔ رئیسوں کو اپنی ریاست کا ، ساہوکاروں کو اپنی ساہوکاری کا ، نسل پرستوں کو اپنی نسلی تفوق (Racial Superiority) کا قوم پرستوں

کو اپنی قومیت کا ، اجداد پرستوں کو اپنے باپ دادا کے موروثی طریقہ کا ، غرض ہر بت کے پرستار کو اپنے بت کے ٹوٹنے کا خطرہ اِسی ایک آواز میں محسوس ہوا ، اس لیے الکفر ملۃ واحدۃ وہ سب جو آپس میں لڑا کرتے تھے اس نئی تحریک سے لڑنے کے لیے ایک ہو گئے اس حالت میں صرف وہی لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے جن کا ذہن صاف تھا ، جو حقیقت کو سمجھنے اور تسلیم کرنے کی استعداد رکھتے تھے ، جن کے اندر اتنی صداقت پسندی موجود تھی کہ جب ایک چیز کے متعلق جان لیں کہ حق یہ ہے تو اس کی خاطر آگ میں کودنے اور موت سے کھیلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ایسے ہی لوگوں کی اس تحریک کے لیے ضرورت تھی - وہ ایک ایک دو دو چار چار کر کے آتے رہے اور کشمکش بڑھتی رہی۔ کسی کا روزگار چھوٹا ، کسی کو گھر والوں نے نکال دیا ، کسی کے عزیز دوست آشنا سب چھوٹ گئے۔ کسی پر مار پڑی۔ کسی کو قید میں ڈالا گیا ، کسی کو تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹا گیا ، کسی کو سر بازار پتھروں اور گالیوں سے تواضع کی گئی ، کسی کی آنکھ پھوڑ دی گئی ، کسی کا سر پھاڑ دیا گیا ، کسی کو عورت ، مال ، حکومت و ریاست اور ہر ممکن چیز کا لالچ دے کر خریدنے کی کوشش کی گئی - یہ سب چیزیں آئیں ، ان کا آنا ضروری تھا ، ان کے بغیر اسلامی تحریک نہ مستحکم ہو سکتی اور نہ بڑھ سکتی تھی -

اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہیں ۲۷ ، ۲۸ ، ۲۹

آزادیٔ افکار سے ہے ان کی تباہی رکھتے نہیں جو فکر و تدبّر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

(آزادیٔ فکر)

خدا کی بندگی تو انسان آپ سے آپ ، بلا عمد و اختیار ، بغیر جانے بوجھے کر ہی رہا ہے اور ٹھیک اسی طرح کر رہا ہے جس طرح لایعقل ، بے شعور درخت ، بے جان پتھر کر رہے ہیں اس حیثیت سے اس میں اور دوسری مخلوقات میں کوئی فرق نہیں - اور اس بندگی کا جو انعام ہے یعنی فیضان وجود اور عطائے رزق ، اس میں بھی فی الحقیقت دوسری مخلوقات سے ممتاز نہیں ہے - فرق و امتیاز اور برتری و شرف جو کچھ ہے ، اس امر میں ہے کہ دوسری موجودات کے برخلاف جو عقل و شعور ، جو آزادی ارادہ و امتیاز ، اور جو قوت علمیہ انسان کو دی گئی ہے اس سے کام لے کر وہ اس کو پہچانے جس کا وہ بندہ ہے اور بالاختیار بھی اس کی عبادت اور پرستش کرے

جس کی وہ بلا اختیار بندگی کر رہا ہے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا اور اپنی عقل و قوت علمیہ سے اپنے مالک کی معرفت حاصل نہ کی اور اپنے اختیار کی حدود میں اس کو چھوڑ کر دوسروں کی عبادت اور پرستش شروع کر دی تو شرف کیسا، وہ تو جانوروں سے بھی بدتر ہو گیا۔

بجائے خود عقل اور قوت علمیہ میں کوئی شرف اور برتری نہیں ہے۔ یہ تو محض حصول شرف کے لیے ایک آلہ ہے اور اس آلہ نے انسان کو یہ استعداد بہم پہنچا دی ہے کہ اس سے ٹھیک ٹھیک کام لے کر وہ بندگی اضطراری کے میدانی مقام سے ترقی کر کے عبادت اختیاری کے انسانی مقام پر پہنچ سکے۔ لیکن اگر انسان نے اس آلہ سے غلط کام لیا اور اس کو چھوڑ کر جس کا وہ بندہ ہے ان کی عبادت اختیار کی جن کا فی الحقیقت وہ بندہ نہیں ہے[1] تو وہ حیوانی مقام سے بھی نیچے اتر گیا۔ حیوان گمراہ تو نہ تھا، یہ گمراہ ہوا۔ حیوان منکر تو نہ تھا، یہ منکر ہوا حیوان کافر و مشرک تو نہ تھا۔ یہ کافر و مشرک ہو گیا حیوان جس مقام پر پیدا کیا گیا تھا اس مقام پر وہ قائم رہا اور حیوان ہونے کی حیثیت سے یہ بھی اُسی مقام پر ہے، مگر انسان ہونے کی حیثیت سے جو ترقی اس کو کرنی چاہیے تھی وہ اس نے نہ کی، بلکہ الٹا تنزل کی طرف چلا گیا۔ ترقی کے لیے اس کو جو عقل کا آلہ دیا گیا تھا اس کو اس نے انسانی ترقی کے لیے استعمال نہ کیا بلکہ حیوانیت میں ترقی کرنے کے لیے استعمال کیا۔ اس نے دور بین بنائی کہ حیوان جتنی دور کی چیز دیکھ سکتا ہے، اس سے زیادہ دور کی چیز یہ دیکھ سکے۔ اس نے ریڈیو ایجاد کیا کہ حیوان جتنی دور کی آواز سن سکتا ہے اس سے زیادہ دور کی آواز یہ سن سکے۔ اس نے ریل اور موٹر بنائی کہ حیوان جس قدر قطع مسافت کر سکتا ہے اس سے زیادہ کر سکے۔ اس نے ہوائی جہاز بنائے کہ اڑنے میں پرندوں سے بازی لے جائے۔ اس نے بحری جہاز بنائے کہ تیرنے میں مچھلیوں کو مات کر دے۔ اس نے آلات حرب بنائے کہ لڑنے میں درندوں سے سبقت لے جائے۔ اس نے عیش و عشرت کے سامان فراہم کیے کہ جانوروں سے زیادہ پرلطف زندگی بسر کرے۔ مگر کیا ان ترقیات کے باوجود یہ مقام حیوان سے کچھ بھی بلند ہوا؟ عقل و علم کے ذریعہ سے عالم مادی میں جتنے تصرّفات یہ کر رہا ہے وہ سب کے سب الہی قوانین فطرت کے ماتحت تو ہیں جن کے تحت عقل و علم کے بغیر حیوانات ایک محدود پیمانہ پر ایسے ہی تصرّفات کرتے ہیں۔ پس یہ تو وہی بندگی اضطراری کا مقام ہوا، جس میں حیوان ہے فرق صرف اتنا ہے کہ حیوان نے کمتر درجہ کی بندگی کی، کمتر درجہ کا رزق پایا۔ اس نے عقل و علم کی قوت سے اعلا درجہ کی بندگی کی اعلا درجہ کے رزق کا مستحق ہوا۔ حیوان کو

گھاس ملتی تھی اس کو توس اور مکھن ملا۔ حیوان کو صوف اور اون ملتا تھا، اس کو نفیس کپڑے ملے۔ حیوان کو گھونسلے میں جگہ دی جاتی تھی، اس کو بنگلوں اور کوٹھیوں میں ٹھہرایا گیا، حیوان کو پیدل دوڑنا پڑتا تھا، اس کو موٹر دے دی گئی۔ یہ اس کی حیوانی بندگی اور اس کی اضطراری عبادت کا انعام ہے، مگر دیکھنا یہ ہے کہ ترقی کا جو آلہ اس کو دیا گیا تھا اس سے اس نے ترقی کیا کی؟ ترقی کے معنی تو یہ تھے کہ حیوان ہونے کی حیثیت سے یہ جس کی بغیر جانے بوجھے بندگی کر رہا ہے، انسان ہونے کی حیثیت سے جان بوجھ کر بھی اس کی بندگی و عبادت کرتا۔ حیوان ہونے کی حیثیت سے جس کو بے اختیار سجدہ کر رہا ہے، انسان ہونے کی حیثیت سے اختیاری سجدہ بھی اسی کو کرتا۔ حیوان ہونے کی حیثیت سے جس کے حکم تکوینی (Natural Law) کی اطاعت کر رہا ہے، انسان ہونے کی حیثیت سے اس کے حکم شرعی (Moral Law) کی اطاعت بھی کرتا۔ اگر یہ ترقی اس نے کی تو بے شک یہ حیوانات اور تمام موجودات پر شرف لے گیا۔ اس نے بالفعل وہ خلافت حاصل کر لی جس کی قوت و استعداد اس کو دی گئی تھی، اس نے تمام موجودات سے بڑھ کر اپنے خالق کی بندگی و عبادت کی، اس لیے تمام موجودات عالم سے زیادہ اجر کا مستحق ہو گیا۔ لیکن اگر یہ ترقی اس نے نہ کی اور آلۂ ترقی کے غلط استعمال سے الٹا تنزل کی پستیوں میں اتر گیا تو بلا شائبۂ شک و ریب تمام اسافل سے اسفل اور تمام اراذل سے ارذل بن گیا۔

تفہیمات، ۱ ۵۰، ۵۱، ۵۲

---

[1] ان معبودوں میں انسان کی اپنی ہوائے نفس بھی شامل ہے جو شخص خدا کی بندگی نہیں کرتا وہ یا تو بتوں اور مصنوعی معبودوں کی بندگی کرتا ہے یا فرعون صفت انسانوں کی یا پھر اپنی خواہشات نفس کی۔

اس مردِ خدا سے کوئی نسبت نہیں تجھ کو
تو بندۂ آفاق ہے وہ صاحبِ آفاق

(بیداری)

جو شخص تہذیب اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کرے گا اُسے یہ بات نمایاں طور پر محسوس ہو گی کہ اس میں جب تک خالص اسلامیت رہی اس وقت تک یہ ایک خالص عملی تہذیب

تھی۔ اس کے پیروؤں کے نزدیک دنیا آخرت کی کھیتی تھی۔ وہ ہمیشہ اس کوشش میں رہتے تھے کہ دنیا میں جتنی مدت وہ زندہ رہیں اس کا ہر لمحہ اس کھیتی کے بونے اور جوتنے میں صرف کر دیں اور زیادہ سے زیادہ تخم ریزی کریں تاکہ بعد کی زندگی میں زیادہ سے زیادہ فصل کاٹنے کا موقع ملے۔ انھوں نے رہبانیّت اور لذّتیّت کے درمیان ایک ایسی معتدل اور متوسط حالت میں دنیا کو برتا جس کا نام ونشان بھی ہم کو کسی دوسری تہذیب میں نظر نہیں آتا۔ خلافت الٰہی کا تصوّر ان کو دنیا میں پوری طرح سے منہمک ہونے اور اس کے معاملات کو انتہائی سرگرمی کے ساتھ انجام دینے پر ابھارتا تھا اور اس کے ساتھ مسؤلیت اور ذمہ داری کا خیال انھیں حد سے متجاوز بھی نہ ہونے دیتا تھا۔ وہ نائب خدا ہونے کی وجہ سے انتہا درجہ کے خود دار تھے اور پھر یہی تصور ان میں تکبّر اور غرور کی پیدائش کو روکتا بھی تھا۔ وہ خلافت کے فرائض انجام دینے کے لیے ان تمام چیزوں کی طرف رغبت رکھتے تھے جو دنیا کا کام چلانے کے لیے ضروری ہیں، مگر اس کے ساتھ ہی ان چیزوں کی طرف ان کو کوئی رغبت نہ تھی جو دنیا کی لذّتوں میں گم کر کے انسان کو اس کے فرائض سے غافل کر دینے والی ہے۔ غرض وہ دنیا کے کام کو اس طرح چلاتے تھے کہ گویا ان کو ہمیشہ یہیں رہنا ہے اور پھر بھی اس کی لذتوں میں منہمک ہونے سے اس طرح بچے رہتے تھے کہ گویا یہ دنیا ان کے لیے ایک سرائے ہے جہاں محض عارضی طور پر وہ مقیم ہو گئے ہیں۔

بعد میں جب اسلامیت کا اثر کم ہو گیا اور دوسری تہذیبوں سے متاثر ہو کر مسلمانوں کی سیرت میں پوری اسلامی شان باقی نہیں رہی، تو انھوں نے وہ سب کچھ کیا جو دنیوی زندگی کے اسلامی تصور کے خلاف تھا۔ عیش وعشرت میں منہمک ہوئے۔ عالیشان قصر تعمیر کیے۔ موسیقی، مصوری، سنگ تراشی اور دوسرے فنون لطیفہ میں دل چسپی لی۔
اور طرز بود وماند میں اُس اسراف اور اس شان وشوکت کو اختیار کیا جو اسلامی مذاق کے بالکل خلاف تھی۔ ۔ ۔

اسلامی تہذیب ۶۳، ۶۴

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے

(شمع اور شاعر)

انسان اپنی اصل کے اعتبار سے ایک حقیر مخلوق ہے مگر اس کو جو عزت حاصل ہوئی ہے

وہ اس روح کی بنا پر ہے جو اس میں پھونکی گئی ہے اور اس نیابت الٰہی کی بنا پر ہے جو اُسے زمین میں عطا کی گئی ہے۔ اب اس عزت کی حفاظت منحصر ہے اس پر کہ وہ شیطان کی پیروی کر کے اپنی روح کو گندہ نہ کر دے اور اپنے آپ کو نیابت کے درجہ سے گرا کر بغاوت کے مرتبے میں نہ لے جائے۔ کیونکہ اس حالت میں وہ پھر وہی ایک حقیر ہستی رہ جائے گا۔

ملکوتی طاقتیں انسان کے نائب خدا ہونے کو تسلیم کر چکی ہیں اور وہ اس کے آگے بحیثیت نائب خدا ہونے کے جھکی ہوئی ہیں۔ مگر شیطانی طاقتیں اس کی نیابت کو تسلیم نہیں کرتیں اور وہ اسے اپنا تابع بنانا چاہتی ہیں۔ انسان اگر اس دنیا میں نیابت الٰہی کا حق ادا کرے گا اور خدا کی ہدایت پر چلے گا تو ملکوتی طاقتیں اس کا ساتھ دیں گی۔ ملائکہ کی فوجیں اس کے لیے اتریں گی۔ وہ عالم ملکوت کو کبھی اپنے سے منحرف نہ پائے گا۔ ان طاقتوں کی مدد سے وہ شیطان اور اس کے لشکروں کو مغلوب کرے گا۔ لیکن اگر وہ نیابت کا حق ادا کرنے میں کوتاہی کرے گا اور خدا کی ہدایت پر نہ چلے گا تو ملکوتی طاقتیں اس کا ساتھ چھوڑ دیں گی، کیونکہ اس طرح وہ خود اپنے منصب نیابت سے دست بردار ہو چکا ہوگا۔ اور جب اس کا ساتھ دینے والی کوئی طاقت نہ رہے گی اور وہ محض مٹی کا پتلا رہ جائے گا تو شیطانی قوتیں اس پر غالب آجائیں گی۔ پھر شیطان اور اس کے لشکر ہی اس کے حمایتی اور مددگار ہوں گے، انہی کے احکام کی وہ پیروی کرے گا، اور انہی کا سا انجام اس کا بھی ہوگا۔

اسلامی تہذیب اصول ومبادی ۳۰، ۳۱

اگر جہاں میں میرا جوہر آشکارا ہوا
قلندری سے ہوا ہے تونگری سے نہیں

(مسلمان کا زوال)

دوسری صدی ہجری کی ابتدا کا واقعہ ہے کہ سجستان در نجّ کے فرماں روا نے جس کا خاندانی لقب رتبیل تھا بنی امیہ کے عمال کو خراج دینا بند کر دیا۔ پیہم چڑھائیاں کی گئیں مگر وہ مطیع نہ ہوا۔ یزید بن عبدالملک اموی کے عہد میں جب اس کے پاس طلب خراج کے لیے سفارت بھیجی گئی تو اس نے مسلمانوں کے سفرا سے دریافت کیا

وہ لوگ کہاں گئے جو پہلے آیا کرتے تھے؟ ان کے پیٹ فاقہ زدوں کی طرح پٹخے ہوئے ہوتے تھے۔ پیشانیوں پر سیاہ گٹّے پڑے رہتے تھے اور کھجوروں کی چپلیں پہنا کرتے تھے۔"

کہا گیا کہ وہ لوگ تو گزر گئے۔ رتبیل نے کہا:۔

”اگرچہ تمھاری صورتیں ان سے زیادہ شان دار ہیں۔ مگر وہ تم سے زیادہ عہد کے پابند تھے۔ تم سے زیادہ طاقت ور تھے۔“

مورخ لکھتا ہے کہ یہ کہہ کر رتبیل نے خراج ادا کرنے سے انکار کر دیا اور تقریباً نصف صدی تک وہ اسلامی حکومت سے آزاد رہا۔

یہ اس عہد کا واقعہ ہے جب تابعین و تبع تابعین کثرت سے موجود تھے۔ ائمۂ مجتہدین کا زمانہ تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کو صرف ایک صدی گزری تھی۔ مسلماں ایک زندہ اور طاقت ور قوم کی حیثیت سے دنیا پر چھا رہے تھے۔ ایران، روم، مصر، افریقہ، اسپین وغیرہ ممالک کے وارث ہو چکے تھے اور ساز و سامان، شان و شوکت اور دولت کے اعتبار سے اس وقت دنیا کی کوئی قوم ان کی ہم پلّہ نہ تھی۔ یہ سب کچھ تھا۔ دلوں میں ایمان بھی تھا۔ احکامِ شریعت کی پابندی اب سے بہت زیادہ تھی۔ سمع و طاعت کا نظام قائم تھا۔ پوری قوم میں ایک زبردست ڈسپلن پایا جاتا تھا۔ مگر پھر بھی جو لوگ عہد صحابہ کے فاقہ کش خستہ حال صحرانشینوں سے زور آزمائی کر چکے تھے انھوں نے ان سرو سامان والوں اور اُن بے سرو سامانوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق محسوس کیا۔ یہ کس چیز کا فرق تھا؟ فلسفۂ تاریخ والے اس کو محض بدویت و حضریت کے فرق پر محمول کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ پرانے بادیہ نشین زیادہ جفاکش تھے اور بعد کے لوگوں کو دولت اور تمدّن نے عیش پسند بنا دیا تھا۔ مگر میں کہوں گا کہ یہ فرق دراصل ایمان، خلوص نیت، اخلاق اور اطاعت خدا و رسول کا فرق تھا۔ مسلمانوں کی اصل قوت یہی چیزیں تھیں، ان کی قوت نہ کثرت تعداد پر مبنی تھی، نہ اسباب و آلات کی افراط پر، نہ مال و دولت کی فراوانی پر، نہ علوم و صناعات کی مہارت پر، نہ تمدن و حضارت کے لوازم پر۔ یہ صرف ایمان و عمل صالح کے بل پر ابھرے تھے۔ اس چیز نے ان کو دنیا میں سربلند کیا تھا اس نے قوموں کے دلوں میں ان کی دھاک اور ساکھ بٹھا دی تھی۔ جب قوّت و عزّت کا سرمایہ ان کے پاس تھا تو یہ قلت تعداد اور بے سرو سامانی کے باوجود طاقت ور اور معزز تھے اور جب یہ سرمایہ ان کے پاس کم ہو گیا تو یہ کثرت تعداد کی فراوانی کے باوجود کمزور اور بے وقعت ہوتے چلے گئے۔

اپنی ملّت کو قیاس اقوام مغرب پر نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوّت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

(مذہب)

آج مغربی قوموں سے سبق سیکھ کر ہر جگہ کے مسلمان نسلیت اور وطنیت کے راگ الاپ رہے ہیں۔ عرب عربیت پر ناز کر رہا ہے۔ مصری کو اپنے فراعنہ یاد آ رہے ہیں۔ ترک اپنی ترکیت کے جوش میں چنگیز خاں اور ہلاکو سے رشتے جوڑ رہا ہے۔ ایرانی اپنی ایرانیت کے جوش میں کہتا ہے کہ یہ محض عرب امپریلزم کا زور تھا کہ حسین اور علی ہمارے ہیرو بن گئے حالانکہ حقیقت میں ہمارے قومی ابطال تو رستم اور اسفندیار تھے۔ ہندوستان میں بھی ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو اپنے آپ کو ہندوستانی قومیت سے منسوب کرتے ہیں۔ وہ لوگ بھی یہاں موجود ہیں جو آب زمزم سے قطع تعلق کر کے آب گنگا سے وابستگی پیدا کرنا چاہتے ہیں، ایسے لوگ بھی ہیں جو بھیم اور ارجن کو اپنا قومی ہیرو قرار دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ ان نادانوں نے نہ اپنی تہذیب کو سمجھا ہے اور نہ مغربی تہذیب کو۔ اصول اور حقائق ان کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ وہ محض سطح بیں ہیں اور سطح پر جو نقوش ان کو زیادہ نمایاں اور زیادہ خوش رنگ نظر آتے ہیں انھی پر لوٹ پوٹ ہونے لگتے ہیں۔ ان کو خبر نہیں کہ جو چیز مغربی قومیت کے لیے آب حیات ہے وہی چیز اسلامی قومیت کے لیے زہر ہے۔ مغربی قومیتوں کی بنیاد نسل و وطن اور زبان و رنگ کی وحدت پر قائم ہوتی ہے اس لیے ہر قوم مجبور ہے کہ ہر اس شخص سے اجتناب کرے جو اس کا ہم قوم، ہم نسل، ہم زبان نہ ہو خواہ وہ اس کی سرحد سے ایک ہی میل کے فاصلہ پر کیوں نہ رہتا ہو۔ وہاں ایک قوم کا آدمی دوسری قوم کا سچا وفادار نہیں ہو سکتا۔ ایک ملک کا باشندہ دوسرے ملک کا سچا خادم نہیں بن سکتا۔ کوئی قوم کسی دوسری قوم کے فرد پر یہ اعتماد نہیں کر سکتی کہ وہ اس کے مفاد کو اپنی قوم کے مفاد پر ترجیح دے گا مگر اسلامی قومیت کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہاں قومیت کی بنیاد نسل و وطن کے بجائے اعتقاد و عمل پر رکھی گئی ہے تمام دنیا کے مسلمان ہر جنسی امتیاز کے بغیر ایک دوسرے

کے شریک حال اور معاون ہیں۔ ایک ہندی مسلمان ایک مصر کا ویسا ہی وفادار شہری بن سکتا ہے جیساکہ وہ خود ہندوستان کا ہے۔ ایک افغانی مسلمان شام کی حفاظت کے لیے اسی جانبازی کے ساتھ لڑ سکتا ہے جس کے ساتھ وہ خود افغانستان کے لیے لڑتا ہے۔ اس لیے ایک ملک کے مسلمان اور دوسرے ملک کے مسلمان میں جغرافی یا نسلی تفریق کی کوئی وجہ نہیں ہے اس معاملہ میں اسلام کے اصول اور مغرب کے اصول ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں جو وہاں سبب قوت ہے وہ یہاں عین سبب ضعف ہے اور جو یہاں مایۂ حیات ہے وہ وہاں بعینہٖ سم قاتل ہے۔ اقبال نے اس حقیقت کو کس خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے

اپنی ملت کو قیاس اقوام مغرب پر نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک ونسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

بعض لوگ اس خیال خام میں مبتلا ہیں کہ وطنی یا نسلی قومیت کے احساسات پیدا ہونے کے بعد بھی اسلامی قومیت کا رشتہ مسلمانوں کے درمیان باقی رہ سکتا ہے اس لیے وہ اپنے نفس کو یہ کہہ کر دھوکہ دیتے ہیں کہ یہ دونوں قسم کی قومیتیں ساتھ ساتھ چلیں گی، ایک سے دوسرے پر آنچ نہ آئے گی اور ہم ان دونوں کے فوائد جمع کر لیں گے لیکن یہ محض جہل اور قلت فکر کا کرشمہ ہے۔ جس طرح خدا نے ایک سینے میں دو قلب نہیں رکھے اسی طرح ایک قلب میں دو قومیتوں کے متضاد اور متصادم جذبات کو جمع کرنے کی گنجائش بھی نہیں رکھی ہے۔ احساس قومیت کا لازمی نتیجہ اپنے اور غیر کا امتیاز ہے۔ اسلامی قومیت کے احساس کا اقتضا یہ ہے کہ آپ مسلم کو اپنا اور غیر مسلم کو غیر سمجھیں اور وطنی یا نسلی قومیت کے احساس کا طبعی اقتضا یہ ہے کہ آپ ہر اس شخص کو اپنا سمجھیں جو آپ کا ہم وطن یا ہم نسل ہو اور اس کو غیر سمجھیں جو دوسرے ملک یا نسل سے تعلق رکھتا ہو، اب کوئی صاحب عقل ہمیں سمجھا دے کہ یہ دونوں احساس ایک جگہ کیسے جمع ہو سکتے ہیں؟ کیونکر ممکن ہے کہ آپ اپنے غیر مسلم ہم وطن کو اپنا بھی سمجھیں اور غیر بھی؟ اور غیر وطنی مسلمان سے بعید بھی ہوں اور قریب بھی؟ هَلْ يَجْتَمِعَانِ مَعًا؟ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ؟

پس یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ مسلمانوں میں ہندیت، ترکیت، افغانیت، عربیت

اور ایرانیت کے احساسات کا پیدا ہونا اسلامی قومیت کا احساس مٹنے اور اسلامی وحدت کے پارہ پارہ ہونے کو مستلزم ہے اور یہ نتیجہ محض عقلی نہیں ہے بلکہ بار بار مشاہدہ میں آچکا ہے۔ مسلمانوں میں جب کبھی وطنی یا نسلی تعصبات پیدا ہوئے تو مسلمان نے مسلمان کا گلا مزور کاٹا اور لا ترجعون بعدی کفار ایضرب بعضکم رقاب بعض کے اندیشۂ نبوی کی تصدیق کر کے ہی چھوڑی لہذا وطنیت کے داعیوں کو اگر یہ کام کرنا ہی ہے تو بہتر ہے کہ اپنے آپ کو اور دنیا کو دھوکہ نہ دیں بلکہ جو کچھ کریں یہ جان کر کریں کہ وطنی قومیت کی دعوت محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت کی عین ضد ہے۔

مسئلہ قومیت ۴۷تا۵۰

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

(جواب شکوہ)

آج اگر ہم ایک صالح گروہ اس ذہنیت، اس اخلاق اور اس سیرت کے انسانوں کا منظم کر سکیں جو اسلام کے منشا کے مطابق ہو تو ہم امید رکھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ کے ذرائع و وسائل سے فائدہ اٹھا کر نہ صرف اپنے ملک بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی ہم ایک اخلاقی و تمدنی انقلاب برپا کر سکیں گے اور ہمیں پورا یقین ہے کہ ایسے گروہ کے منظم ہو جانے کے بعد عام انسانوں کی قیادت اس گروہ کے سوا کسی دوسری پارٹی کے ہاتھ میں نہیں جا سکتی۔ آپ مسلمانوں کی موجودہ حالت کو دیکھ کر جو رائے قائم کر رہے ہیں وہ اس حالت پر چسپاں نہیں ہو سکتی جو ہمارے پیش نظر ہے۔

اگر صحیح اخلاق کے حامل انسان میدان عمل میں آجائیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلمان عوام ہی نہیں بلکہ ہندو، عیسائی، پارسی اور سکھ سب ان کے گرویدہ ہو جائیں گے اور خود اپنے ہم مذہب لیڈروں کو چھوڑ کر ان پر اعتماد کرنے لگیں گے۔ ایسے ہی ایک گروہ کو تربیت اور تعلیم اور تنظیم کے ذریعہ تیار کرنا اس وقت میرے پیش نظر ہے اور میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اس کام میں وہ میری مدد کرے۔

رسائل مسائل اول ۳۳۹

اے پیر حرم رسم و رہ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا

(اے پیر حرم)

پہلی چیز جو مجھ کو حضرت مجدّد الف ثانی کے وقت سے شاہ صاحب اور ان کے خلفاء تک کے تجدیدی کام میں کھٹکی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے تصوف کے بارے میں مسلمانوں کی بیماری کا پورا اندازہ نہیں لگایا اور نادانستہ ان کو پھر وہی غذا دے دی، جس سے مکمل پرہیز کرانے کی ضرورت تھی۔ حاشا کہ مجھے فی نفسہٖ اس تصوّف پر اعتراض نہیں ہے جو ان حضرات نے پیش کیا۔ وہ بجائے خود اپنی روح کے اعتبار سے اسلام کا اصلی تصوّف ہے اور اس کی نوعیت "احسان" سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ لیکن جس چیز کو میں لائق پرہیز کہہ رہا ہوں وہ متصوّفانہ رموز و اشارات اور متصوّفانہ زبان کا استعمال، اور متصوّفانہ طریقے سے مشابہت رکھنے والے طریقوں کو جاری رکھنا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ حقیقی تصوّف اس خاص قالب کا محتاج نہیں ہے اس کے مقصد کے لیے دوسرا قالب بھی ممکن ہے اس کے لیے زبان بھی دوسری اختیار کی جاسکتی ہے، رموز و اشارات سے بھی اجتناب کیا جاسکتا ہے۔ پیری مریدی اور سلسلے کی تمام عملی شکلوں کو بھی چھوڑ کر دوسری شکلیں اختیار کی جاسکتی ہیں۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ اسی پرانے قالب کو اختیار کرنے پر اصرار کیا جائے جس میں مدتہائے دراز سے جاہلی تصوف کی گرم بازاری ہو رہی ہے اس کی کثرت اشاعت نے مسلمانوں کو جن سخت اعتقادی و اخلاقی بیماریوں میں مبتلا کیا ہے وہ کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ اب حال یہ ہو چکا ہے کہ ایک شخص خواہ کتنی ہی صحیح تعلیم دے۔ بہرحال یہ قالب استعمال کرتے ہی وہ تمام بیماریاں پھر عود کر آتی ہیں جو صدیوں کے رواج عام سے اس کے ساتھ وابستہ ہوگئی ہیں۔

پھر جس طرح پانی جیسی حلال چیز بھی اس وقت ممنوع ہو جاتی ہے جب وہ مریض کے لیے نقصان دہ ہو، اسی طرح یہ قالب بھی مباح ہونے کے باوجود اس بنا پر قطعی چھوڑ دینے کے قابل ہو گیا ہے کہ اسی کے لباس میں مسلمانوں کو افیون کا چسکا لگایا گیا ہے اور اس کے قریب جاتے ہی ان مزمن مریضوں کو پھر وہی چنیا بیگم یاد آجاتی ہے جو صدیوں ان کو تھپک تھپک کر سلاتی رہی ہیں۔ بیعت کا معاملہ پیش آنے کے بعد کچھ دیر نہیں لگتی کہ مریدوں میں وہ ذہنیت

پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ جو مریدی کے ساتھ مختص ہو چکی ہے یعنی

"بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید"

والی ذہنیت جس کے بعد پیر صاحب میں اور اَرْبَابٌ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ فکر و نظر مفلوج قوت تنقید ماؤف، علم و عقل کا استعمال موقوف، اور دل و دماغ پر بندگیِ شیخ کا ایسا مکمل تسلّط کہ گویا شیخ ان کا رب ہے اور یہ اس کے مربوب، پھر جہاں کشف و الہام کی بات چیت شروع ہوئی معتقدین کی ذہنی غلامی کے بند اور زیادہ مضبوط ہونے شروع ہو جاتے ہیں اس کے بعد صوفیانہ رموز و اشارات کی باری آتی ہے جس سے مریدوں کی قوت واہمہ کو گویا تازیانہ لگ جاتا ہے اور وہ انھیں لے کر ایسی اڑتی ہے کہ بیچارے ہر وقت عجائبات و طلسمات ہی کے عالم میں سیر کرتے رہتے ہیں۔ واقعات کی دنیا میں ٹھہرنے کا موقع غریبوں کو کم ملتا ہے۔

تجدید و احیائے دین ۱۱۸ - ۱۲۰

اے مردہ صد سالہ! تجھے کیا نہیں معلوم؟
ہر موت کا پوشیدہ تقاضا ہے قیامت؟

(عالم برزخ)

"جہاں تک عقلی استدلال کا تعلق ہے وہ ہم کو صرف "ہونا چاہیے" کی حد تک لے جا کر چھوڑ دیتا ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ آیا واقعی کوئی ایسا عالم ہے بھی، تو ہماری عقل اور ہمارا علم دونوں اس کا حکم لگانے سے عاجز ہیں۔ یہاں قرآن ہماری مدد کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمھاری عقل اور فطرت جس چیز کا مطالبہ کرتی ہے۔ فی الواقع وہ ہونے والی ہے۔ موجودہ نظام عالم جو طبعی قوانین پر بنا ہے ایک وقت میں توڑ ڈالا جائے گا، اس کے بعد ایک دوسرا نظام بنے گا۔ جس میں زمین و آسمان اور ساری چیزیں ایک دوسرے ڈھنگ کی ہوں گی۔ پھر اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو جو ابتدائے آفرینش سے قیامت تک پیدا ہوئے تھے دوبارہ پیدا کر دے گا اور بیک وقت ان سب کو اپنے سامنے جمع کرے گا۔ وہاں ایک ایک شخص کا ایک ایک قوم کا اور پوری انسانیت کا ریکارڈ ہر غلطی اور ہر فروگذاشت کے بغیر محفوظ ہوگا ہر شخص کے ایک ایک عمل کا جتنا ردِّ عمل دنیا میں ہوا ہے اس کی پوری روداد موجود ہوگی۔ وہ تمام نسلیں گواہی کے

کٹھرے میں حاضر ہوگی جو اس ردِّ عمل سے متاثر ہوئیں۔ ایک ایک ذرہ جس پر انسان کے اقوال اور افعال کے نقوش ثبت ہوئے اپنی داستان سنائے گا۔ خود انسان کے ہاتھ اور پاؤں اور آنکھ اور زبان اور تمام اعضا شہادت دیں گے کہ ان سے اس نے کس طرح کام لیا۔ پھر اس روداد پر وہ سب سے بڑا حاکم پورے انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے گا کہ کون کتنے انعام کا مستحق ہے اور کتنی سزا کا۔ یہ انعام اور یہ سزا دونوں چیزیں اتنے بڑے پیمانے پر ہوں گی جس کا کوئی اندازہ موجود نظام عالم کی محدود مقداروں کے لحاظ سے نہیں کیا جا سکتا۔ وہاں وقت اور جگہ کے معیار کچھ اور ہوں گے۔ وہاں کی مقداریں کچھ اور ہوں گی۔ وہاں کے قوانین قدرت کسی اور قسم کے ہوں گے۔ انسان کی جن نیکیوں کے اثرات دنیا میں ہزاروں برس چلتے رہتے ہیں، وہاں وہ ان کا بھرپور صلہ وصول کر سکے گا بغیر اس کے کہ موت اور بیماری اور بڑھاپا اس کے عیش کا سلسلہ توڑ سکیں اور اسی انسان کی جن برائیوں کے اثرات دنیا میں ہزارہاں برس تک اور بے شمار انسانوں تک پھیلتے رہے ہیں، وہ ان کی پوری سزا بھگتے گا، بغیر اس کے کہ موت اور بے ہوشی آکر اُسے تکلیف سے بچا سکے۔

ایسی ایک زندگی اور ایسے ایک عالم کو جو لوگ ناممکن سمجھتے ہیں مجھے ان کی ذہن کی تنگی پر ترس آتا ہے۔ اگر ہمارے موجودہ نظام عالم کا موجودہ قوانین قدرت کے ساتھ موجود ہونا ممکن ہے تو آخر ایک دوسرے نظام عالم کا دوسرے قوانین کے ساتھ وجود میں آنا کیوں ناممکن ہو؟ البتہ یہ بات کہ واقع میں ایسا ضرور ہوگا تو اس کا تعین نہ دلیل سے ہو سکتا ہے اور نہ علمی ثبوت سے اس کے لیے ایمان بالغیب کی ضرورت ہے۔"

اسلامی نظام زندگی ۶۲ - ۶۴

اے مرد خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد

(ہندی اسلام)

جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے[۱۲۹] ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے۔ فرشتوں نے کہا، کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے[۱۳۰]؟ یہ

وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانہ ہے۔ ہاں، جو مرد، عورتیں اور بچے واقعی بے بس ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پاتے، بعید نہیں کہ اللہ انھیں معاف کر دے۔ اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے۔ جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کے لیے بہت جگہ اور بسر اوقات کے لیے بڑی گنجائش پائے گا، اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کے لیے نکلے، پھر راستے ہی میں اُسے موت آجائے اس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہوگیا، اللہ بہت بخشش فرمانے والا اور رحیم ہے[۱۳۱]۔

۱۲۹ء مراد وہ لوگ ہیں جو اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ابھی تک بلا کسی مجبوری و معذوری کے اپنی کافر قوم ہی کے درمیان مقیم تھے اور نیم مسلمانہ اور نیم کافرانہ زندگی بسر کرنے پر راضی تھے، درآں حالیکہ ایک دارالاسلام مہیا ہو چکا تھا جس کی طرف ہجرت کر کے اپنے دین و اعتقاد کے مطابق پوری اسلامی زندگی بسر کرنا ان کے لیے ممکن ہو گیا تھا۔ یہی ان کا اپنے نفس پر ظلم تھا کیونکہ ان کو پوری اسلامی زندگی کے مقابلے میں اس نیم کفر و نیم اسلام پر جس چیز نے قانع و مطمئن کر رکھا تھا وہ کوئی واقعی مجبوری نہ تھی بلکہ محض اپنے نفس کے عیش اور اپنے خاندان، اپنی جائداد و املاک اور اپنے دنیوی مفاد کی محبت تھی جسے انھوں نے اپنے دین پر ترجیح دی (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو حاشیہ ۱۱۶)

۱۳۰ء یعنی جب ایک جگہ خدا کے باغیوں کا غلبہ تھا اور خدا کے قانون شرعی پر عمل کرنا ممکن نہ تھا تو وہاں رہنا کیا ضروری تھا؟ کیوں نہ اس جگہ کو چھوڑ کر کسی ایسی سرزمین کی طرف منتقل ہو گئے جہاں قانون الٰہی کی پیروی ممکن ہوتی؟

یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جو شخص اللہ کے دین پر ایمان لایا ہو اس کے لیے نظام کفر کے تحت زندگی بسر کرنا صرف دو ہی صورتوں میں جائز ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ اسلام کو اس سرزمین میں غالب کرنے اور نظام کفر کو نظام اسلام میں تبدیل کرنے کی جدوجہد کرتا رہے جس طرح انبیاء علیہم السلام اور ان کے ابتدائی پیرو کرتے رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ درحقیقت وہاں سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پاتا ہو اور سخت نفرت و بیزاری کے ساتھ وہاں مجبورانہ قیام رکھتا ہو۔ ان دو صورتوں کے سوا ہر صورت میں دارالکفر کا قیام ایک مستقل معصیت ہے اور اس معصیت کے لیے یہ عذر کوئی بہت وزنی عذر نہیں ہے کہ ہم دنیا میں کوئی ایسا دارالاسلام پاتے ہی نہیں ہیں جہاں ہم ہجرت کر کے جا سکیں۔ اگر کوئی دارالاسلام موجود نہیں

ہے تو کیا خدا کی زمین میں کوئی پہاڑ یا کوئی جنگل بھی ایسا نہیں ہے جہاں آدمی درختوں کے پتے کھا کر اور بکریوں کا دودھ پی کر گزر کر سکتا ہو اور احکام کفر کی اطاعت سے بچا رہے؟

بعض لوگوں کو ایک حدیث سے غلط فہمی ہوئی ہے جس میں ارشاد ہوا کہ فتح مکہ کے بعد اب ہجرت نہیں ہے۔ حالانکہ دراصل یہ حدیث کوئی دائمی حکم نہیں ہے بلکہ صرف اس وقت کے حالات میں اہل عرب سے ایسا فرمایا گیا تھا۔ جب تک عرب کا بیشتر حصہ دار الکفر و دار الحرب تھا اور صرف مدینہ و اطراف مدینہ میں اسلامی احکام جاری ہو رہے تھے، مسلمانوں کے لیے تاکیدی حکم تھا کہ ہر طرف سے سمٹ کر دار الاسلام میں آجائیں۔ مگر جب فتح مکہ کے بعد عرب میں کفر کا زور ٹوٹ گیا اور قریب قریب پورا ملک اسلام کے زیرنگیں آگیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب ہجرت کی حاجت باقی نہیں رہی ہے۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہ تھی کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے تمام حالات میں قیامت تک کے لیے ہجرت کی فرضیت منسوخ ہوگئی ہے۔

تفہیم القرآن ۳۸۶-۳۶۸

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

انھوں نے اپنی تعلیم ہم پر مسلّط کی اور اس طرح مسلّط کی کہ رزق کی کنجیاں ہی لے کر اپنی تعلیم گاہوں کے دروازوں پر لٹکا دیں، جس کے معنی یہ تھے کہ اب یہاں رزق وہی پائے گا جو یہ تعلیم حاصل کرے گا۔ اس دباؤ میں آکر ہماری ہر نسل کے بعد دوسری نسل پہلے سے بڑھ چڑھ کر ان تعلیم گاہوں کی طرف گئی اور وہاں وہ سارے ہی نظریات اور عملیات سیکھے جن کی روح اور شکل بالکل ہماری تہذیب کی ضد تھی۔ اگرچہ کھلا کافر تو وہ ہم میں سے ایک فی لاکھ کو بھی نہ بنا سکے، مگر فکر و نظر اور ذوق و وجدان اور سیرت و کردار میں ٹھیٹھ مسلمان انھوں نے شاید دو فی صدی کو بھی نہ رہنے دیا۔ یہ سب سے بڑا نقصان تھا جو انھوں نے ہم کو پہنچایا کیونکہ اس نے ہمارے دلوں اور دماغوں میں ہماری تہذیب کی جڑوں ہی کو خشک کر دیا اور ایک دوسری مخالف تہذیب کی جڑیں ان میں پیوست کر دیں۔

اسلامی نظام زندگی ۴۵۲ ۴۵۳

ان تازہ خداؤں میں وطن سب سے بڑا ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

(وطنیت)

جس مسلمان نے بھی نیشنلزم کے شیطان سے بیعت کی ہے، اسلام کے فرشتوں سے اس کا رخصتی مصافحہ ہوگیا ہے۔ ابھی حال میں ہندوستان کے ایک "مسلمان" شاعر نے ترانۂ وطن کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے جس میں وہ اپنی بھارت ماتا کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے:-

جس کا پانی ہے امرت وہ مخزن ہے تو — جس کے دانے ہیں بجلی وہ خرمن ہے تو
جس کے کنکر ہیں ہیرے وہ معدن ہے تو — جس سے جنت ہے دنیا وہ گلشن ہے تو
دیویوں دیوتاؤں کا مسکن ہے تو
تجھ کو سجدوں سے کعبہ بنادیں گے ہم

آخری بیت کو پڑھ کر اس امر میں کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ نیشنلزم اور اسلام دو بالکل الگ دو قطعی متضاد ذہنیتوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان دونوں کا ایک جگہ جمع ہونا محالات سے ہے۔ درحقیقت نیشنلزم خود ایک مذہب ہے جو شرائع الٰہیہ کا مخالف ہے، بلکہ عملی حیثیت سے بھی انسان کی زندگی کے ان تمام پہلوؤں پر ملکیت کا دعوا کرتا ہے جنھیں شرائع الٰہیہ اپنی گرفت میں لینا چاہتی ہے۔ اب ایک مرد عاقل کے لیے صرف یہی ایک صورت باقی رہ جاتی ہے کہ دل و دماغ اور جسم و جان کا مطالبہ کرنے والے ان دونوں مدعیوں میں سے کسی ایک کو پسند کر کے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دے اور جب ایک کی آغوش میں چلا جائے تو دوسرے کا نام تک نہ لے۔

دنیا نیشنلزم کی لعنت میں کیوں گرفتار ہے؟

اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانہ میں آزادی اور ترقی اور وقار و شرف حاصل کرنے کا ایک ہی مجرب نسخہ دنیا کے قوموں کو معلوم ہے اور وہ یہی نیشنلزم کا نسخہ ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر وہ قوم جو ابھرنا چاہتی ہے، اس نسخہ کی طرف دوڑنے لگتی ہے مگر قبل اس کے کہ دوسروں کو اس کی طرف دوڑتے دیکھ کر ہم بھی اس کی طرف دوڑ جائیں، ہمیں سوچنا چاہیے کہ دنیا کی یہ حالت

کیوں ہے ——— دنیا اس حالت میں صرف اس لیے مبتلا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی خواہشات کو ضابطہ میں لانے والی، حوصلوں اور تمناؤں کو جائز حدود میں رکھنے والی سعی وعمل کی قوتوں کو سیدھا راستہ دکھانے والی اور آزادی ترقی اور عزت و وقار کے حصول کا صحیح طریقہ بتانے والی کوئی تعلیم حکمت و اخلاق دنیا کے پاس نہیں ہے اسی چیز نے قوموں کو بھٹکا دیا ہے۔ یہی محرومی اور یہی فقدان ہے جس نے قوموں کو جاہلیت اور ظلم و عدوان کی طرف ڈھکیل دیا ہے۔ خود ہمارے اپنے ملک کے ہندو اور سکھ اور پارسی وغیرہ بھی جس وجہ سے مغرب کے قوم پرستانہ خیالات قبول کر رہے ہیں وہ یہی ہے کہ یہ بیچارے اس ہدایت و رہنمائی سے محروم ہیں۔ اس مصیبت کا علاج اور گمراہی کی اصلاح اگر کہیں ہے تو وہ شرائع الٰہیہ میں ہے اور دنیا میں صرف مسلمان ہی وہ جماعت ہے جو شرائع الٰہیہ کی نمائندگی کرتی ہے۔ لہٰذا یہ مسلمان کا کام تھا کہ وہ آگے بڑھ کر اس عصبیت جاہلیہ کی جڑیں کاٹتا جو اکاس بیل کی طرح دنیا کو اپنے لپیٹ میں لے رہی ہے اور دنیا کی ہر قوم کو بتاتا کہ تمہارے لیے نہ صرف آزادی ترقی اور وقار و شرف کا، بلکہ اس کے ساتھ سلامتی، امن اور حقیقی خوشحالی کا راستہ بھی وہی ہے، جو خدا کی طرف سے اس کے رسول لائے ہیں نہ کہ وہ جو شیطان کی طرف سے فتنہ و شر کے امام تمہیں دکھا رہے ہیں لیکن یہ دور حاضر کی سب سے زیادہ دردناک ٹریجدی ہے کہ دنیا کو اس تباہی اور گمراہی سے بچانے والی وہ ایک ہی جماعت "مسلمان"، جس کو اللہ نے زمین پر انبیا علیہم السلام کا مشن قائم کرنے اور پھیلانے پر مامور کیا تھا اپنے فرائض منصبی کو فراموش کر بیٹھی ہے اور اب بجائے اس کے کہ وہ ہدایت کی شمع لے کر تاریکیوں میں بھٹکنے والی دنیا کو روشنی دکھائے، وہ خود ان بھٹکنے والوں ہی کے پیچھے چلنے پر آمادہ ہو رہی ہے افسوس اس بیمارستان میں ایک ہی ڈاکٹر تھا اور وہ بھی بیماروں میں شامل ہوا جاتا ہے۔

مژدہ باد اے مرگ! عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے

مسئلہ قومیت ۱۲۳ - ۱۲۶

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسّر — تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پازند!

جاہلیت مشرکانہ نے عوام پر حملہ کیا اور توحید کے راستے سے ہٹا کر ان کو ضلالت کی بے شمار

راہوں میں بھٹکا دیا۔ ایک صریح بت پرستی تو نہ ہو سکی، باقی کوئی قسم شرک کی ایسی نہ رہی جس نے "مسلمانوں" میں رواج نہ پایا ہو۔ پرانی جاہلی قوموں کے جو لوگ اسلام میں داخل ہوئے تھے وہ اپنے ساتھ بہت سے مشرکانہ تصورات لیے چلے آئے اور یہاں ان کو صرف اتنی تکلیف کرنی پڑی کہ پرانے معبودوں کی جگہ بزرگان اسلام میں سے کچھ معبود تلاش کریں، پرانے معبودوں کی جگہ مقابر اولیا سے کام لیں اور پرانی عبادات کی رسموں کو بدل کر نئی رسمیں ایجاد کر لیں۔ اس کام میں دنیا پرست علما نے ان کی بڑی مدد کی اور وہ بہت سی مشکلات ان کے راستے سے دور کر دیں جو شرک کو اسلام کے اندر نصب کرنے میں پیش آسکتی تھیں۔ انھوں نے بڑی دیدہ ریزی سے آیات اور احادیث کو توڑ مروڑ کر اسلام میں اولیا پرستی اور قبر پرستی کی جگہ نکالی۔ مشرکانہ اعمال کے لیے اسلام کی اصطلاحی زبان میں الفاظ بہم پہنچائے اور اس نئی شریعت کے لیے رسموں کی ایسی صورتیں تجویز کیں کہ شرکِ جلی کی تعریف میں نہ آسکیں۔ اس فنی امداد کے بغیر اسلام کے دائرے میں شرک بے چارہ کہاں بار پاسکتا تھا؟

تجدید و احیائے دین ۳۸ - ۳۹

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

ایک مکمل اسلامی زندگی کی عمارت اگر اٹھ سکتی ہے تو صرف اسی اقرار توحید پر اٹھ سکتی ہے جو انسان کی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی پر وسیع ہو۔ جس کے مطابق انسان اپنے آپ کو اور اپنی ہر چیز کو خدا کی ملک سمجھے۔ اس کا اپنا اور تمام دنیا کا ایک ہی جائز مالک، معبود، مطاع اور صاحب امر و نہی تسلیم کرے اسی کو ہدایت کا سرچشمہ مانے اور پورے شعور کے ساتھ اس حقیقت پر مطمئن ہو جائے کہ خدا کی اطاعت سے انحراف، یا اس کی ہدایت سے بے نیازی یا اس کی ذات و صفات اور حقوق و اختیارات میں غیر کی شرکت جس پہلو اور جس رنگ میں بھی ہو سراسر ضلالت ہے۔ پھر اس عمارت میں اگر استحکام پیدا ہو سکتا ہے تو صرف اسی وقت جب کہ آدمی پورے شعور اور پورے ارادے کے ساتھ یہ فیصلہ کرے کہ وہ اور اس کا سب کچھ اللہ کا ہے اور اللہ ہی کے لیے ہے۔ اپنے معیار پسند و ناپسند کو ختم کر کے اللہ

کی پسند وناپسند کے تابع کردے۔ اپنی خودسری کو مٹاکر اپنے نظریات وخیالات، خواہشات جذبات اور اندازِ فکر کو اس علم کے مطابق ڈھال لے جو خدا نے اپنی کتاب میں دیا ہے۔ اپنی تمام ان وفاداریوں کو دریابرد کردے جو خدا کی وفاداری کے تابع نہ ہوں بلکہ اس کے مدمقابل بنی ہوئی ہوں یا بن سکتی ہوں۔ اپنے دل میں سب سے بلند مقام پر خدا کی محبت کو بٹھائے۔ اور ہر اس بت کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے بت خانہ دل سے نکال پھینکے جو خدا کے مقابلے میں عزیز تر ہونے کا مطالبہ کرتا ہو۔ اپنی محبت ونفرت، اپنی دوستی اور دشمنی، اپنی رغبت اور کراہیت، اپنی صلح و جنگ ہر چیز کو خدا کی مرضی میں اس طرح گم کردے کہ اس کا نفس وہی چاہنے لگے جو خدا چاہتا ہے اور اسی سے بھاگنے لگے جو خدا کو ناپسند ہے۔ یہ ہے ایمان باللہ کا حقیقی مرتبہ اور آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ جہاں ایمان ہی ان حیثیات سے اپنی وسعت و ہمہ گیری اور اپنی پختگی ومضبوطی میں ناقص ہو وہاں تقویٰ یا احسان کا کیا امکان ہوسکتا ہے کیا اس نقص کی کسر داڑھیوں کے طول اور لباس کے تراش خراش یا سبحہ گردانی وتہجد خوانی سے پوری کی جاسکتی ہے؟

اس پر دوسرے ایمانیات کو بھی قیاس کرلیجیے۔ نبوت پر ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک انسان کا نفس زندگی کے سارے معاملات میں نبی کو اپنا رہنما نہ مان لے اور اس کی رہنمائی کے خلاف یا اس سے آزاد جتنی رہنمائیاں ہوں ان کو رد نہ کردے۔ کتاب پر ایمان اس وقت تک ناقص ہی رہتا ہے جب تک نفس میں کتاب اللہ کے بتائے ہوئے اصول زندگی کے سوا کسی دوسری چیز کے تسلط پر رضامندی کا شائبہ بھی باقی ہو یا اتباع ما انزل اللہ کو اپنی اور ساری زندگی کا قانون دیکھنے کے لیے قلب و روح کی بے چینی میں کچھ بھی کسر ہو۔ اسی طرح آخرت پر ایمان بھی مکمل نہیں کیا جاسکتا جب تک نفس پوری طرح آخرت پر دنیا کو ترجیح دینے اور اخروی قدروں کے مقابلے میں دنیوی قدروں کو ٹھکرا دینے پر آمادہ نہ ہوجائے اور آخرت کی جواب دہی کا خیال اسے زندگی کی راہ پر چلتے ہوئے قدم قدم پر کھٹکنے نہ لگے۔ یہ بنیادیں ہی جہاں پوری نہ ہوں آخر وہاں اسلامی زندگی کی عالیشان عمارت کس شے پر تعمیر ہوگی؟ جب لوگوں نے ان بنیادوں کی توسیع وتکمیل اور پختگی کے بغیر تعمیر اخلاقِ اسلامی کو ممکن سمجھا، تب ہی نوبت یہاں تک پہنچی کہ کتاب اللہ کے خلاف فیصلہ کرنے والے جج، غیر شرعی قوانین کی بنیاد پر مقدمے لڑانے والے وکیل،

نظام کفر کے مطابق معاملات زندگی کا انتظام کرنے والے کارکن۔ کافرانہ اصول وتمدن وریاست پر زندگی کی تشکیل وتاسیس کے لیے لڑانے والے لیڈر اور ہیرو، غرض سب کے لیے تقویٰ واحسان کے مراتب عالیہ کا دروازہ کھل گیا، بشرطیکہ وہ اپنی زندگی کے ظاہری انداز واطوار کو ایک خاص نقشہ پر ڈھال لیں، اور کچھ نوافل واذکار کی عادت ڈال لیں۔

اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات ۲۸۹ تا ۲۹۱

اپنے بھی خفا مجھ سے بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

میں اس لحاظ سے بہت بدنام ہوں کہ اکابر سلف کو معصوم نہیں مانتا، اور ان کے صحیح کو صحیح کہنے کے ساتھ ان کے غلط کو غلط بھی کہہ گزرتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ اس معاملے میں بھی کچھ صاف صاف کہوں گا تو میری فرد قرارداد جرم میں ایک جریمہ کا اضافہ ہوجائے گا۔ لیکن آدمی کو دنیائے خوف سے بڑھ کر خدا کا خوف ہونا چاہیے۔ اس لیے خواہ کوئی کچھ کہا کرے میں تو یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ ان دونوں بزرگوں کا اپنے مجدد ہونے کی خود تصریح کرنا اور بار بار کشف والہام کے حوالے سے اپنی باتوں کو پیش کرنا ان کے چند غلط کاموں میں سے ایک ہے اور ان کی یہی غلطیاں ہیں جنھوں نے بعد کے بہت سے کم ظرفوں کو طرح طرح کے دعوے کرنے اور امت میں نت نئے فتنے اٹھانے کی جرأت دلائی، کوئی شخص اگر تجدید دین کے لیے کسی قسم کی خدمت انجام دینے کی توفیق پاتا ہو تو اُسے چاہیے کہ خدمت انجام دے اور یہ فیصلہ اللہ پر چھوڑ دے کہ اس کا کیا مقام اس کے ہاں قرار پاتا ہے۔ آدمی کا اصل مقام وہ ہے جو آخرت میں اس کی نیت وعمل کو دیکھ کر اور اپنے فضل سے اس کو قبول کرکے اللہ تعالیٰ اُسے دے۔ نہ کہ وہ جس کا وہ دعوا کرے یا لوگ اسے دیں، اپنے لیے خود القاب وخطابات تجویز کرنا اور دعوؤں کے ساتھ انھیں بیان کرنا اور اپنے مقامات کا ذکر زبان پر لانا کوئی اچھا کام نہیں ہے۔ بعد کے ادوار میں تو صوفیانہ ذوق نے اُسے اتنا گوارا کیا کہ خوشگوار بنا دیا، حتیٰ کہ بڑے بڑے لوگوں کو بھی اس فعل میں کوئی قباحت محسوس نہ ہوئی۔ مگر صحابہ کرام اور تابعین وتبع تابعین وائمہ مجتہدین کے دور میں یہ چیز بالکل ناپید نظر آتی ہے۔۔۔۔

تجدید واحیائے دین ۱۴۳، ۱۴۴

آگ اس کی پھونک دیتی ہے برنا و پیر کو
لاکھوں میں ایک بھی ہو اگر صاحب یقین

حقیقت یہ ہے کہ اس مقام کی تفسیر میں دورِ انحطاط کے مسلمانوں نے کچھ اس ذہنیت کا اظہار کیا ہے جو کبھی یہودیوں کی خصوصیت تھی۔ یہ یہودیوں کا حال تھا کہ جب وہ ذہنی و اخلاقی پستی میں مبتلا ہوئے تو پچھلی تاریخ میں جن جن بزرگوں کی سیرتیں ان کو بلندی پر چڑھنے کا سبق دیتی تھیں ان سب کو وہ نیچے گرا کر اپنے مرتبے پر اتار لائے تاکہ اپنے لیے اور زیادہ نیچے گرنے کا بہانہ پیدا کریں۔ افسوس کہ یہی کچھ مسلمانوں نے بھی کیا۔ انھیں کافر حکومتوں کی چاکری کرنی تھی۔ مگر اس پستی میں گرتے ہوئے اسلام اور اس کے علمبرداروں کی بلندی دیکھ کر انھیں شرم آئی۔ لہٰذا اس شرم کو مٹانے اور اپنے ضمیر کو راضی کرنے کے لیے یہ اپنے ساتھ اس جلیل القدر پیغمبر کو بھی خدمت کفر کی گہرائی میں لے گرے جس کی زندگی دراصل انھیں یہ سبق دے رہی تھی کہ اگر کسی ملک میں ایک اور صرف ایک مردِ مومن بھی خالص اسلامی اخلاق اور ایمانی فراست و حکمت کا حامل ہو تو وہ تن تنہا مجرد اپنے اخلاق اور اپنی حکمت کے زور سے اسلامی انقلاب برپا کر سکتا ہے۔ اور یہ کہ مومن کی اخلاقی طاقت (بشرطیکہ وہ اس کا استعمال جانتا ہو اور اُسے استعمال کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہو) فوج اور اسلحہ اور سروسامان کے بغیر بھی ملک فتح کر سکتی ہے اور سلطنتوں کو مسخر کر لیتی ہے۔

تفہیم القرآن ۲ ۴۱۳

الحذر آئین پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں

(ابلیس کی مجلس شوریٰ)

اس انقلاب میں فقط ملک کا طریق انتظام ہی تبدیل نہیں ہوا بلکہ ذہنیتیں بدل گئیں۔ نگاہ کا زاویہ بدل گیا سوچنے کا طریقہ بدل گیا۔ زندگی کا طرز بدل گیا، اخلاق کی دنیا بدل گئی، عادات و خصائل بدل گئے غرض ایک پوری قوم کی کایا پلٹ کر رہ گئی۔ جو زانی تھے وہ عورتوں کی عصمت کے محافظ بن گئے، جو شرابی تھے وہ منع شراب کی تحریک

کے علمبردار بن گئے، جو چور اور اچکّے تھے ان کا احساس دیانت اتنا نازک ہو گیا کہ دوستوں کے گھر کھانا کھانے میں بھی ان کو اس بنا پر تامل تھا کہ مبادا ناجائز طریقہ پر مال کھانے کا اطلاق اس فعل پر بھی نہ ہو جائے حتیٰ کہ قرآن میں خود اللہ تعالیٰ کو انھیں اطمینان دلانا پڑا کہ اس طرح کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں، جو ڈاکو اور لٹیرے تھے وہ اتنے متدین بن گئے کہ ان کے ایک معمولی سپاہی کو پایہ تخت ایران کی فتح کے موقع پر کروڑوں کی قیمت کا تاج شاہی ہاتھ آیا اور وہ رات کی تاریکی میں اپنے پیوند لگے کمبل میں اسے چھپا کر سپہ سالار کے حوالے کرنے کے لیے پہنچا تاکہ اس غیر معمولی واقعہ سے اس کی دیانت کی شہرت نہ ہو جائے اور اس کے خلوص پر ریاکاری کا میل نہ آ جائے، وہ جن کی نگاہ میں انسانی جان کی کوئی قیمت نہ تھی جو اپنی بیٹیوں کو آپ اپنے ہاتھ سے زندہ دفن کرتے تھے ان کے اندر جان کا اتنا احترام پیدا ہو گیا کہ کسی مرغ کو بھی بے رحمی سے قتل ہوتے نہ دیکھ سکتے تھے، وہ جن کو راست بازی اور انصاف کی ہوا تک نہ لگی تھی ان کے اندر عدل اور راستی کا یہ حال ہو گیا کہ خیبر کی صلح کے بعد جب ان کا تحصیلدار یہودیوں سے سرکاری محاصلہ وصول کرنے گیا تو یہودیوں نے اس کو بیش قرار رقم اس غرض کے لیے پیش کی کہ وہ سرکاری مطالبہ میں کچھ کمی کر دے مگر اس نے رشوت لینے سے انکار کر دیا اور حکومت اور یہودیوں کے درمیان پیداوار کا آدھا حصہ اس طرح تقسیم کیا کہ دو برابر کے ڈھیر آمنے سامنے لگا دیے اور یہودیوں کو اختیار دیا کہ دونوں میں سے جس ڈھیر کو چاہیں اٹھا لیں، اس نرالی قسم کے تحصیلدار کا یہ طرز عمل دیکھ کر یہودی انگشت بدنداں رہ گئے اور بے اختیار ان کی زبان سے نکلا کہ اسی عدل پر زمین و آسمان قائم ہیں۔ ان کے اندر وہ گورنر پیدا ہوئے جو گورنمنٹ ہاؤسوں میں نہیں بلکہ رعایا کے درمیان انہی جیسے گھروں میں رہتے تھے، بازاروں میں پیدل چلتے تھے، دروازوں پر دربان تک نہ رکھتے تھے۔ رات دن بس ہر وقت جو چاہتا تھا ان سے انٹرویو کر سکتا تھا ان کے اندر وہ قاضی پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے ایک یہودی کے خلاف خود خلیفہ وقت کا دعوا اس بنا پر خارج کر دیا کہ خلیفہ اپنے غلام اور اپنے بیٹے کے سوا کوئی گواہ نہ پیش کر سکا ان کے اندر وہ سپہ سالا پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے دورانِ جنگ میں ایک شہر خالی کرتے وقت پورا جزیہ یہ کہہ کر واپس دے دیا کہ اب ہم تمھاری حفاظت سے قاصر ہیں لہٰذا جو ٹیکس ہم نے حفاظت کے معاوضہ میں وصول کیا تھا اُسے رکھنے کا ہمیں کوئی حق نہیں۔ ان میں وہ ایلچی پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے سپہ سالارِ ایران کے

بھرے دربار میں اسلام کے اصول مساوات انسانی کا ایسا مظاہرہ کیا اور ایران کے طبقاتی امتیازات پر ایسی برمحل تنقید کی کہ خدا جانے کتنے ایرانی سپاہیوں کے دلوں میں اس مذہب انسانیت کی عزت و وقعت کا بیج اسی وقت پڑ گیا ہوگا۔ ان میں وہ شہری پیدا ہوئے جن کے اندر اخلاقی ذمہ داری کا احساس اتنا زبردست تھا کہ جن جرائم کی سزا ہاتھ کاٹنے اور پتھر مار مار کر ہلاک کر دینے کی صورت میں دی جاتی تھی ان کا اقبال خود آکر کرتے تھے اور تقاضا کرتے تھے کہ سزا دیکر انھیں گناہ سے پاک کر دیا جائے تاکہ وہ چور یا زانی کی حیثیت سے خدا کے سامنے نہ پیش ہوں۔

اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے ۳۶ ۳۷ ۳۸

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی !

سب سے پہلے بنی امیہ کے عہد میں عراق کے گورنر یزید بن ہُبیرہ نے ان کو منصب قبول کرنے پر مجبور کیا۔ یہ ۱۳۰ھ کا زمانہ تھا جب کہ عراق میں اموی سلطنت کے خلاف فتنوں کے وہ طوفان اٹھ رہے تھے جنھوں نے دو سال کے اندر امویوں کا تختہ الٹ دیا۔ اس موقع پر ابن ہُبیرہ چاہتا تھا کہ بڑے بڑے فقہا کو ساتھ ملا کر ان کے اثر سے فائدہ اٹھائے چنانچہ اس نے ابن ابی لیلیٰ، داؤد بن ابی الہند، ابن شبرمہ وغیرہ کو بلاکر اہم مناصب دیے۔ پھر ابوحنیفہؒ کو بلاکر کہا کہ میں آپ کے ہاتھ میں اپنی مہر دیتا ہوں، کوئی حکم نافذ نہ ہوگا جب تک کہ آپ اس پر مہر نہ لگائیں اور کوئی مال خزانے سے نہ نکلے گا جب تک آپ اس کی توثیق نہ کریں۔ امام نے یہ ذمہ داری قبول سے انکار کیا تو اس نے انھیں قید کر دیا اور کوڑے لگوانے کی دھمکی دی۔ دوسرے فقہا نے امام کو سمجھایا کہ اپنے اوپر رحم کرو، ہم سب اس خدمت سے ناخوش ہیں مگر مجبوراً اُسے قبول کیا ہے، تم بھی مان لو۔ امام نے جواب دیا "اگر وہ مجھ سے چاہے کہ اس کے لیے واسط کی مسجد کے دروازے گنوں تب بھی میں قبول نہ کروں گا، کجا کہ وہ چاہتا ہے کہ وہ کسی آدمی کے قتل کا حکم لکھے اور میں اس فرمان پر مہر لگاؤں، خدا کی قسم، میں اس ذمہ داری میں شریک نہ ہوں گا" اس سلسلہ میں ابن ہبیرہ نے ان کے سامنے اور

خدمات پیش کیں اور وہ انکار کرتے رہے۔ پھر اس نے ان کو قاضی کوفہ بنانے کا فیصلہ کیا اور اس پر قسم کھائی کہ ابوحنیفہ انکار کریں گے تو میں انھیں کوڑے لگواؤں گا۔ ابوحنیفہؒ نے بھی جواب میں قسم کھائی اور کہا " دنیا میں اس کے کوڑے کھالینا میرے لیے آخرت کی سزا بھگتنے سے زیادہ سہل ہے۔ خدا کی قسم میں ہرگز قبول نہ کروں گا، خواہ وہ مجھے قتل ہی کر دے" آخر کار اس نے ان کے سر پر ۲۰ یا ۳۰ کوڑے لگوائے۔ بعض روایات یہ ہیں کہ دس گیارہ روز تک وہ روزانہ دس کوڑے لگواتا رہا۔ مگر ابوحنیفہؒ اپنے انکار پر قائم رہے۔ آخر کار اُسے اطلاع دی گئی کہ یہ شخص مرجائے گا۔ اس نے کہا کیا کوئی ناصح نہیں ہے جو اس شخص کو سمجھائے کہ مجھ سے مہلت ہی مانگ لے۔ امام ابوحنیفہؒ کو ابن ہبیرہ کی یہ بات پہنچائی گئی تو انھوں نے کہا مجھے چھوڑ دو کہ میں اپنے دوستوں سے اس معاملہ میں مشورہ کرلوں۔ ابن ہبیرہ نے یہ پیغام ملتے ہی انھیں چھوڑ دیا اور وہ کوفہ چھوڑ کر مکہ چلے گئے جہاں سے بنی امیہ کی سلطنت ختم ہونے تک وہ پھر نہ پلٹے۔

اس کے بعد عباسی عہد میں المنصور نے ان پر عہدۂ قضا کے لیے اصرار شروع کیا جیساکہ آگے چل کر ہم بتائیں گے، منصور کے خلاف نفس ذکیہؒ اور ان کے بھائی ابراہیم کے خروج میں امام نے کھلّم کھلا ان کا ساتھ دیا تھا جس کی وجہ سے منصور کے دل میں ان کے خلاف گرہ بیٹھی ہوئی تھی۔ الذہبی کے الفاظ میں وہ ان کے خلاف غصہ میں آگ کے بغیر جلا جا رہا تھا مگر ان جیسے بااثر آدمی پر ہاتھ ڈالنا اس کے لیے آسان نہ تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ ایک امام حسینؓ کے قتل نے بنی امیہؒ کے خلاف مسلمانوں میں کتنی نفرت پیدا کر دی تھی اور اس کی بدولت ان کا اقتدار کس آسانی سے اکھاڑ پھینکا گیا۔ اس لیے وہ انھیں مارنے کے بجائے سونے کی زنجیروں سے باندھ کر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا زیادہ بہتر سمجھتا تھا۔ اس نے ان کے سامنے بار ہا قضا کا منصب اسی نیت سے پیش کیا، یہاں تک کہ انھیں تمام سلطنت عباسیہ کا قاضی القضاۃ مقرر کرنے کی پیش کش کی مگر وہ ایک مدت تک طرح طرح کے حیلوں سے اس کو ٹالتے رہے۔ آخر کار جب وہ بہت ہی زیادہ مُصر ہوا تو امام نے اس کو صاف صاف اپنے انکار کے وجوہ بتائے۔ ایک مرتبہ کی گفتگو میں انھوں نے بڑے نرم انداز میں معذرت کرتے ہوئے کہا قضا کے لیے نہیں موزوں ہو سکتا مگر وہ شخص جو اتنی جان رکھتا ہو کہ آپ پر اور آپ کے شاہزادوں اور سپہ سالاروں پر قانون نافذ کر سکے۔ مجھ میں یہ جان نہیں ہے۔ مجھے تو جب

آپ بلاتے ہیں تو واپس نکل کر ہی میری جان میں جان آتی ہے۔" ایک اور موقع پر زیادہ سخت گفتگو ہوئی جس میں انھوں نے خلیفہ کو مخاطب کر کے کہا "خدا کی قسم میں تو اگر رضامندی سے بھی یہ عہدہ قبول کروں تو آپ کے بھروسے کے لائق نہیں ہوں، کجا کہ ناراضی کے ساتھ مجبوراً قبول کروں اگر کسی معاملہ میں میرا فیصلہ آپ کے خلاف ہوا اور پھر آپ نے مجھے دھمکی دی کہ یا تو میں تجھے فرات میں غرق کر دوں گا ورنہ اپنا فیصلہ بدل دے تو میں غرق ہو جانا قبول کر لوں گا مگر فیصلہ نہ بدلوں گا۔ پھر آپ کے بہت سے اہل دربار بھی ہیں، انھیں تو کوئی ایسا قاضی چاہیے جو آپ کی خاطر ان کا بھی لحاظ کرے۔" ان باتوں سے جب منصور کو یقین ہو گیا کہ یہ شخص اس سنہری پنجرے میں بند ہونے کے لیے تیار نہیں ہے تو وہ عریاں انتقام پر اتر آیا۔ انھیں کوڑوں سے پٹوایا، جیل میں ڈال کر کھانے پینے کی سخت تکلیفیں دیں پھر ایک مکان میں نظر بند کر دیا جہاں بقول بعض طبعی موت سے اور بقول بعض زہر سے ان کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔

خلافت و ملوکیت ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

(اجتہاد)

حقیقتاً اس طرز فکر کو فقہ اسلامی میں استعمال کرنا ہی غلط ہے کہ مسلمانوں کو فلاں تکلیف اور فلاں نقصان جو حکومت کفر کے تحت رہتے ہوئے پہنچ رہا ہے اُسے روکنے کے لیے نظام باطل ہی کے اندر کچھ شرعی وسائل پیدا کیے جائیں۔ یہ طریق فکر مسلمانوں کو بدلنے کے بجائے اسلام کو بدلتا ہے یعنی تجدید دین کی جگہ تجدّد کا دروازہ کھولتا ہے جو نظام دینی کے لیے حد درجہ تباہ کن ہے اور افسوس یہ ہے کہ غلبۂ کفر کے زمانہ میں فتویٰ نویسی کچھ اسی راہ پر چلتی رہی ہے۔ اس طریقہ نے مسلمانوں کو نظام باطل کے اندر راضی اور مطمئن زندگی بسر کرنے کا خوگر بنا دیا ہے حالاں کہ یہ دین حق کے عین منشا ہی کے خلاف ہے ہم اس طرز فکر کو ہرگز گوارا نہیں کر سکتے، خواہ کیسے ہی بڑے بڑے علما اس کے حامی ہوں۔ نظام باطل کے تحت مسلمانوں کے لیے تکلیف اور نقصان کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا ہے؟ اس تکلیف اور

نقصان کا تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ مسلمان اس نظام کو بدلنے کے لیے جدوجہد کریں نہ یہ کہ کفر کے زیر سایہ کسی سہولت سے جینے کے لیے شریعت کو موافق حال بنائیں۔

رسائل مسائل اول ۱۲۰

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

(نکتۂ توحید)

جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے دل کڑھنے لگتے ہیں اور جب اس کے سوا دوسروں کا ذکر ہوتا ہے تو یکایک وہ خوشی سے کِھل اُٹھتے ہیں ۶۴ ؎

۶۴ ؎ یہ بات قریب قریب ساری دنیا کے مشرکانہ ذوق رکھنے والے لوگوں میں مشترک ہوتی ہے، حتّٰی کہ مسلمانوں میں بھی جن بدقسمتوں کو یہ بیماری لگ گئی ہے وہ بھی اس عیب سے خالی نہیں ہیں زبان سے کہتے ہیں کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں۔ لیکن حالت یہ ہے کہ اکیلے اللہ کا ذکر کیجیے تو ان کے چہرے بگڑنے لگتے ہیں۔ کہتے ہیں، ضرور یہ شخص بزرگوں اور اولیا کو نہیں مانتا، جبھی تو بس اللہ ہی اللہ کی باتیں کیے جاتا ہے۔ اور اگر دوسروں کا ذکر کیا جائے تو ان کے دلوں کی کلی کھل جاتی ہے اور بشاشت سے ان کے چہرے دمکنے لگتے ہیں۔ اس طرز عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی اصل میں دلچسپی اور محبّت کس سے ہے۔ علّامہ آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں اس مقام پر خود اپنا ایک تجربہ بیان کیا ہے فرماتے ہیں کہ ایک روز میں نے دیکھا کہ ایک شخص اپنی مصیبت میں ایک وفات یافتہ بزرگ کو مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ میں نے کہا اللہ کے بندے، اللہ کو پکار، وہ خود فرماتا ہے کہ وَ اِذَا سَأَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ میری یہ بات سن کر اُسے سخت غصّہ آیا اور بعد میں لوگوں نے مجھے بتایا کہ وہ کہتا تھا یہ شخص اولیا کا منکر ہے اور بعض لوگوں نے اس کو یہ بھی کہتے سنا کہ اللہ کی نسبت ولی جلدی سن لیتے ہیں۔

تفہیم القرآن ۴ ، ۳۷۷

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں

(طلوع اسلام)

ایک اور بیماری جو اس زمانے میں پیدا ہوئی اور پھر برابر بڑھتی چلی گئی وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر سے تمام وفاداریاں ختم ہوگئیں اور صرف اپنی ذاتی وفاداری اور اپنے کنبے کی وفاداری رہ گئی۔ اسلام نے پہلے ساری وفاداریاں نکال دی تھیں، قوم، رنگ، وطن اور زبان ان ساری وفاداریوں کو اسلام ختم کرچکا تھا اور اس نے صرف ایک خدا اس کے رسولؐ اور دین کی وفاداری مسلمانوں کو دی تھی جن کے اوپر ان کا پورا کیریکٹر تعمیر ہوتا تھا لیکن ملوکیت کے دور میں یہ چیز آہستہ آہستہ کمزور ہوتی چلی گئی اور جب یہ وفاداری بھی، جو ان کے کیریکٹر کی بنیاد تھی، ان کے اندر ڈھیلی ہونی شروع ہوگئی تو ظاہر بات ہے کہ خود غرضی کے سوا باقی کیا رہ جاتا ہے۔ جب ایک آدمی کو کوئی اعلاتر وفاداری نہ ملے تو وہ کسی اعلاتر مقصد کے لیے قربانی نہیں کر دیتا۔ پھر وہ جو کچھ کرتا ہے اپنی ذات اور برادری اور کنبے کے لیے کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے اندر بھی کرایے کے سپاہی (Mercenaries) پیدا ہونے شروع ہوگئے۔ کرائے کے سپاہی، کرائے کے ایڈمنسٹریٹر جس کا جی چاہے کچھ ٹکوں کے عوض ان کی خدمات سے فائدہ اٹھالے۔ ان کی حیثیت یہ ہوگئی کہ کوئی پالتو درندہ ہے کہ اس کو کھانے کو دو اور جس پر چاہو شکار دو دوڑ کر لپک جائے گا۔ خود اپنے ملک کی تاریخ میں آپ دیکھیے کہ پہلے کتنے بڑے پیمانے پر ہماری قوم کرائے کے سپاہی مختلف حکومتوں کو فراہم کرتی رہی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مرہٹہ ریاست جو مسلمانوں کی جان و مال و آبرو اور دین کی دشمن تھی اور جس سے ان کی کوئی چیز بھی محفوظ نہ تھی۔ اس ریاست کے اندر مسلمان فوج موجود تھی ان کے گولہ انداز مسلمان تھے۔ ان کی توپیں چلانے والے مسلمان تھے۔ اس کے بعد انگریز آئے اور یہیں سے انھوں نے کرایے کے سپاہی فراہم کیے اور یہیں کے سپاہیوں سے انھوں نے اس ملک کو فتح کیا۔ ان کو باہر سے بہت زیادہ فوج نہیں لانی پڑی۔ یہیں ان کو ملک فتح کرنے والے بھی مل گئے اور یہیں سے مفتوح ملک کا انتظام چلانے والے بھی مل گئے۔ کسی کے اندر یہ احساس نہ تھا کہ ہم کس کے لیے کس ملک کو فتح کر رہے ہیں اور کس کے لیے ملک کا نظم ونسق چلانے کو تیار ہو رہے ہیں۔ اس لیے کہ ساری وفاداریاں ختم ہوچکی تھیں۔ ایک آخری

وفاداری اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کے دین کی تھی اس کو ختم کر دیا گیا تھا آخر کار جو چیز باقی رہ گئی وہ صرف نفس کی وفاداری تھی اور نفس کی وفاداری ہی آدمی کو ایسے کاموں پر آمادہ کرسکتی ہے۔

ماہنامہ تجلی دیوبند فروری مارچ ۶۷ء ۴۴، ۴۵

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

(ساقی نامہ)

جس شخص کے دل میں ایمان راسخ موجود ہوگا اور جو اللہ سے ایسا ڈرنے والا ہوگا جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اس کے لیے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی کو گمراہی میں مبتلا دیکھے اور راہ حق کی طرف دعوت نہ دے، کہیں بدی کا وجود پائے اور اس کو مٹانے کی کوشش نہ کرے۔ طبیعت مومن کی مثال ایسی ہے جیسے مشک کہ رائحۂ ایمان اس کے جرم تک محدود نہیں رہتی بلکہ پھیلتی ہے جہاں تک پھیلنے کا اس کو موقع ملے۔ یا چراغ کہ نور ایمان سے جہاں وہ منور ہوا اور اس نے آس پاس کی فضا میں اپنی شعاعیں پھیلا دیں۔ مشک میں جب تک خوشبو رہے گی وہ مشام جاں کو معطر کرتا رہے گا۔ چراغ جب تک روشن رہے گا روشن کرتا رہے گا۔ مگر جب مشک کی خوشبو قریب سے قریب سونگھنے والے کو بھی محسوس نہ ہو اور چراغ کی روشنی اپنے قریب ترین ماحول کو بھی روشن نہ کرے تو ہر شخص یہی حکم لگائے گا کہ مشک مشک نہیں رہا اور چراغ نے اپنی چراغیت کھو دی۔ یہی حال مومن کا ہے کہ اگر وہ خیر کی طرف دعوت نہ دے نیکی کا حکم نہ دے، بدی کو برداشت کرے اور اس سے روکے نہیں، تو یہ اس بات کی دلیل ہے۔ کہ اس میں خوفِ خدا کی آگ سرد پڑ گئی ہے اور ایمان کی روشنی مدھم ہوگئی ہے۔

تفہیمات ۱ ۱۲۰

بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوتِ فرماں روا کے سامنے بیباک ہے

(سیدؒ کی لوح تربت)

انسان کو دو چیزیں بزدل بناتی ہیں۔ ایک محبت جو وہ اپنی جان، اپنے اہل و عیال اور

اپنے مال سے رکھتا ہے۔ دوسرے خوف جو نتیجہ ہے اس غلط اعتقاد کا کہ نقصان پہنچانے اور ہلاک کر دینے کی قوت دراصل ان اشیا میں ہے جو محض آلہ کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ ایمان باللہ ان دونوں چیزوں کو دل سے نکال دیتا ہے۔ مومن کے رگ وپے میں یہ اعتقاد سرایت کر جاتا ہے کہ خدا سب سے زیادہ محبت کا حق رکھتا ہے۔ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ مال اور اولاد سب دنیا کی زینتیں ہیں جن کا کبھی نہ کبھی ضائع ہونا یقینی ہے۔ کبھی نہ ضائع ہونے والی چیز وہ ہے جو خدا کے ہاں ملے گی۔ دنیا کی زندگی محض چند روزہ ہے۔ اس کو بچانے کی لاکھ کوشش کریں موت بہرحال ایک دن آ کر رہے گی۔ پھر کیوں نہ اس جان کو دائمی مسرت کی زندگی کے لیے قربان کر دیں جو اللہ کے ہاں ملے گی؟ کیوں نہ دنیا کے چند روزہ لطف اور عارضی فائدوں کو اس خدا کی خوشی پر فدا کر دیں جو دراصل ہماری جان ومال کا مالک ہے اور جو ان کے بدلے میں اس سے بہتر زندگی اور ان سے زیادہ حقیقی فائدہ بخشنے والا ہے؟

رہا خوف تو مومن کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ نقصان پہنچانے اور ہلاک کرنے کی حقیقی قوت انسان یا حیوان، توپ یا تلوار، لکڑی یا پتھر میں نہیں ہے بلکہ خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے تمام دنیا کی قوتیں مل کر بھی اگر کسی کو نقصان پہنچانا چاہیں اور خدا کا اذن نہ ہو تو اس کا بال تک بیکا نہیں ہو سکتا۔ موت کا جو وقت خدا نے لکھ دیا ہے اس سے پہلے کسی کے لائے موت نہیں آسکتی اور اگر موت کا لکھا ہوا وقت آن پہنچے تو پھر کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتی پس جب معاملہ یہ ہے تو لوگوں کو ڈرنے کے بجائے خدا سے ڈرنا چاہیے۔ وہی حقیقت میں ایسی ہستی ہے جس سے ڈرا جائے۔ راہ خدا میں لڑنے سے جی چرانا تو ان کا کام ہے جن کے دل میں ایمان نہیں، اس لیے کہ وہ خدا سے زیادہ بندوں سے ڈرتے ہیں ورنہ جو "سچے" مومن ہیں وہ دشمنوں کے دل بادل دیکھ کر بجائے ڈرنے کے اور زیادہ شیر ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کا بھروسہ دنیوی طاقت پر نہیں خدا پر ہے۔

اسلامی تہذیب اصول و مبادی ۱۷۱ تا ۱۷۳

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

اور جب تم قرآن میں اپنے ایک ہی رب کا ذکر کرتے ہو تو وہ نفرت سے منہ

موڑ لیتے ہیں [۵۲]

[۵۲] یعنی انھیں یہ بات سخت ناگوار ہوتی ہے کہ تم بس اللہ ہی کو رب قرار دیتے ہو، ان کے بنائے ہوئے دوسرے ارباب کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ ان کو یہ وہابیت ایک آن پسند نہیں آتی کہ آدمی بس اللہ ہی اللہ کی رٹ لگائے چلا جائے۔ نہ بزرگوں کے تصرفات کا کوئی ذکر۔ نہ آستانوں کی فیض رسانی کا کوئی اعتراف۔ نہ ان شخصیتوں کی خدمت میں کوئی خراج تحسین جن پر، ان کے خیال میں اللہ نے اپنی خدائی کے اختیارات بانٹ رکھے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ عجیب شخص ہے جس کے نزدیک علم غیب ہے تو اللہ کو، قدرت ہے تو اللہ کی، تصرفات و اختیارات ہیں تو بس ایک اللہ ہی کے، آخر یہ ہمارے آستانوں والے بھی کوئی چیز ہیں یا نہیں جن کے ہاں سے ہمیں اولاد ملتی ہے۔ بیماروں کو شفا نصیب ہوتی ہے، کاروبار "چمکتے" ہیں، اور منہ مانگی مرادیں بر آتی ہیں۔

تفہیم القرآن ۲ ۴۲۱

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور
(حال و مقام)

یورپ میں جن تخیلات اور جن اصولوں پر نیشنلزم کا نشوونما ہوا ہے، وہ انسانیت کی عین ضد ہیں۔ انھوں نے انسان کو حیوانیت بلکہ درندگی کے مقام تک گرا دیا ہے۔ وہ خدا کی زمین کو فساد، ظلم اور خونریزی سے بھرنے والے اور انسانی تہذیب کے پُرامن نشوو ارتقا کو روکنے والے اصول ہیں۔ ابتدا سے خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر دنیا میں جن پاک مقاصد کے لیے سعی کرتے رہے ہیں۔ یہ اصول ان سب پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ الٰہی شریعتیں جن اغراض کے لیے دنیا میں آئی ہیں اور آسمانی کتابیں جن اخلاقی و روحانی تعلیمات کو لے کر نازل ہوئی ہیں، یہ شیطانی اصول کے مدمقابل، ان کے مزاحم اور معاند واقع ہوئے ہیں۔ یہ انسان کو تنگ دل، تنگ نظر اور متعصب بناتے ہیں، یہ قوموں اور نسلوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا کر حق اور انصاف اور انسانیت کی طرف سے اندھا کر دیتے ہیں۔ یہ مادی طاقت اور حیوانی زور کو اخلاقی حق کا قائم مقام قرار دے کر شرائع الٰہیہ کی عین بنیاد پر ضرب لگاتے ہیں۔

الہی شریعتوں کا مقصد ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ انسانوں کے درمیان اخلاقی و روحانی رشتے قائم کر کے انھیں وسیع پیمانہ پر ایک دوسرے کا معاون بنایا جائے مگر نیشنلزم نسلی اور وطنی امتیاز کی قینچی لے کر ان رشتوں کو کاٹ دیتا ہے اور قومی منافرت پیدا کر کے انسانوں کو ایک دوسرے کا معاون بنانے کے بجائے مزاحم اور دشمن بنا دیتا ہے۔

الہی شریعتیں چاہتی ہیں کہ انسان اور انسان کے درمیان آزادانہ ربط کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا کیے جائیں کیونکہ انہی پر انسانی تہذیب و تمدن کی ترقی کا انحصار ہے مگر نیشنلزم ان روابط کی راہ میں ہر قسم کی رکاوٹیں پیدا کرتا ہے حتیٰ کہ ایک قوم کے حلقۂ اثر میں دوسری قوم والوں کے لیے سانس لینا تک مشکل کر دیتا ہے۔

الہی شریعتوں کا منشا یہ ہے کہ ہر فرد، ہر قوم اور ہر نسل کو اپنی طبعی خصوصیات اور پیدائشی قابلیتوں کے نشو و نما کا پورا موقع ملے تاکہ وہ مجموعی حیثیت سے انسانیت کی ترقی میں اپنا حصہ ادا کر سکے۔ مگر نیشنلزم ہر قوم اور ہر نسل میں یہ داعیہ پیدا کرتا ہے کہ وہ طاقت حاصل کر کے دوسری قوموں اور نسلوں کو ادنیٰ اور ذلیل اور بے قدر و قیمت قرار دے اور انھیں غلام بنا کر ان کی پیدائشی قابلیتوں کو بڑھنے اور کام کرنے کا موقع ہی نہ دے بلکہ ان سے زندگی کا حق ہی سلب کر کے چھوڑے۔

الہی شریعتوں کا اساسی اصول یہ ہے کہ طاقت کے بجائے اخلاق پر انسانی حقوق کی بنیاد قائم ہوتی کہ ایک طاقتور شخص یا گروہ کمزور شخص یا گروہ کے حق کو بھی ادا کرے جب کہ قانون اخلاق اس کی تائید میں ہو۔ لیکن نیشنلزم اس کے مقابلہ میں یہ اصول قائم کرتا ہے کہ طاقت ہی حق ہے اور کمزور کا کوئی حق نہیں اس لیے کہ وہ اسے حاصل کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔

شرائع الہیہ جس طرح اخلاقی حدود کے اندر نفس پروری کی مخالف نہیں ہیں درحقیقت اسی طرح وہ قوم پروری کی بھی مخالف نہیں ہیں وہ اس کی تائید کرتی ہیں کیونکہ ایک ایک قوم کے اپنی اپنی جگہ ترقی کرنے ہی پر مجموعی حیثیت سے انسانیت کی ترقی کا مدار ہے لیکن آسمانی شریعتیں ایسی قوم پروری چاہتی ہیں جو انسانیت عامہ (Humanity Atlarge) کی طرف ہمدردی، معاونت اور خیر خواہی لیے ہوئے بڑھے اور وہ خدمت انجام دے جو سمندر کے لیے، زمین کے دریا انجام دیتے ہیں

برعکس اس کے نیشنلزم انسان کے اندر یہ ذہنیت پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنی تمام قوتیں اور قابلیتیں صرف اپنی قوم کی بڑائی کے لیے مخصوص کرے اور انسانیت عامہ کا نہ صرف یہ کہ مددگار نہ ہو بلکہ اپنی قوم کے مفاد پر انسانیت کے عمومی مفاد کی قربانی چڑھا دے۔ انفرادی زندگی میں جو حیثیت خودغرضی کی ہے۔ اجتماعی زندگی میں وہی حیثیت قوم پرستی کی ہے۔ ایک قوم پرست فطرتاً تنگ دل ہوتا ہے۔ وہ دنیا کی ساری خوبیاں صرف اپنی قوم یا اپنی نسل ہی میں دیکھتا ہے۔ دوسری قوموں یا نسلوں میں اسے کوئی چیز ایسی قابل قدر نظر نہیں آتی جو زندگی اور بقا کی مستحق ہو۔

مسئلہ قومیت ۱۱۱ - ۱۱۴

پھر نہ کر سکتی حباب اپنا اگر پیدا ہوا
توڑنے میں اس کے یوں ہوتی نہ بے پروا ہوا

(والدہ مرحومہ کی یاد میں)

صاف اور واضح اور ہمارے مشاہدہ و احساس سے قریب تر شواہد پیش کرنے کے بعد قرآن مجید ایک ایسی کھلی ہوئی دلیل پیش کرتا ہے جو بالکل عقل عام Common Sense سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اشیا کو عدم سے وجود میں لانا زیادہ مشکل ہے بہ نسبت اس کے کہ ان کو منتشر اور پراگندہ ہو جانے کے بعد دوبارہ پہلی صورت پر پیدا کیا جائے۔ پس جو طاقت اس دشوار تر کام کو انجام دینے سے عاجز نہ ہوئی، وہ آسان تر کام کو انجام دینے سے کیوں کر عاجز ہو سکتی ہے؟ اگر ایک شخص موٹر ایجاد کرنے پر قادر ہے اور اس کو بنا چکا ہے تو کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ وہ موٹر کے پرزوں کو الگ الگ کرنے کے بعد ان کو جوڑ دینے پر قادر نہیں ہے؟ اسی مثال پر قیاس کر لو کہ صانع عالم جو تم کو عدم سے وجود میں لایا ہے، تمھیں مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کرنے سے ہرگز عاجز نہیں ہو سکتا۔

اسلامی تہذیب اصول و مبادی ۲۸۱ ۲۸۲

پیرِ حرم کو دیکھا ہے میں نے
کردارِ بے سوز گفتار واہی

(۱)

سب سے پہلے نمایاں چیز جو مولانا حسین احمد صاحب کے اس بیان میں نگاہ کو کھٹکتی ہے وہ ان کی زبان ہے جسے ممکن ہے مولانا خود اپنے شایانِ شان سمجھتے ہوں مگر ہم ان کے ساتھ اتنا حسنِ ظن رکھتے ہیں کہ یہ زبان ہمیں ان کے مرتبے سے فروتر نظر آتی ہے۔ کسی شخص یا گروہ سے اختلاف ہونا کوئی بری بات نہیں ہے۔ سخت سے سخت اختلافات ہو سکتے ہیں اور سخت سے سخت اظہارِ رائے شریفانہ زبان میں کیا جا سکتا ہے مگر یہ زبان، کہ جس سے اختلاف ہو اس کے خلاف ٹٹپو نجیے، کم بخت، بد بخت اور خبیث جیسے رکیک الفاظ استعمال کر ڈالے جائیں ایک مہذب آدمی کے شایانِ شان نہیں ہے، کجاکہ ایک ایسا مردِ بزرگ اس کو اختیار کرے جو اس برِّ اعظم کی سب سے بڑی درسگاہ کا مسند نشین ہے اور جس کی طرف ہزارہا آدمی تعلیم دین ہی کے لیے نہیں تزکیۂ نفس کے لیے بھی رجوع کرتے ہیں۔ جب قوم کے مقتدا اور مربی و معلّم اس طرح کی باتوں پر اتر آئیں تو بعید نہیں کہ ان سے اخلاق و تہذیب کا سبق لینے والے اصاغر آدمیت سے بالکل ہی عاری ہو جائیں اور اس قوم میں نام کو بھی ایک دوسرے کی عزّت کا پاس باقی نہ رہ جائے

اذا کان رب البیت بالطبل ضارباً

فلا تلم الاولاد فیہ علی الرقص

مولانا کو اگر یاد نہ ہو تو ہم انھیں یاد دلاتے ہیں کہ کسی وقت ہم نے بھی ان کے نظریۂ قومیت اور ان کی کانگریس سے موافقت پر تنقید کی ہے۔ وہ تنقید اب بھی ہماری کتابوں ("مسئلہ قومیت" اور مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ دوم") میں موجود ہے۔ وہ اور ان کے شاگرد اور مرید ہماری ان تنقیدی عبادات کو دیکھ کر خود رائے قائم فرمائیں کہ دونوں میں کتنا فرق ہے۔ بالفرض دس بارہ برس بعد ان کا بدلہ لینا ہی ضرور تھا تو جزاء سیئۃ مثلہا کے اصول پر لیا جا سکتا تھا۔ یہ تعدّی آخر کس آئین کی رو سے حضرت کے لیے جائز ہو گئی؟

(۲)

دوسری بات جو اس سے بھی زیادہ افسوسناک ہے وہ مولانا کی انتہائی غیر ذمہ دارانہ

روش ہے جو انھوں نے دوسروں کے دین و اعتقاد پر اظہارِ رائے کرنے میں اختیار کی ہے، ان کے سامنے ایک مفروضہ سوال پیش نہیں کیا گیا تھا بلکہ ایک جماعت کا نام لے کر اس پر چند الزامات لگائے گئے تھے تنابزبالالقاب سے قطع نظر "مودودیوں" اور "مودودیت" کے الفاظ سے جس جماعت کا ذکر کیا گیا ہے، مولانا اس سے بالکل ناواقف نہ تھے۔ ان کو خوب معلوم تھا کہ ہندوستان و پاکستان میں ہزارہا مسلمان اس سے وابستہ اور لاکھوں اس سے متاثر ہیں۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس جماعت کے خیالات کہیں چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ بلکہ لکھے لکھائے مطبوعہ شکل میں موجود ہیں۔ اس کے باوجود ایک سائل نے جیسے کچھ بے سروپا الزامات بغیر کسی حوالے اور ثبوت کے اس پر لگا دیے ان کو مولانا نے جوں کا توں تسلیم کر لیا اور ان پر ایک تند و تلخ جواب غالباً یہ جانتے ہوئے سائل کے حوالے کر دیا کہ اس سوال و جواب کو اپنے معتقدین اشتہار بازی کے لیے استعمال کرنے والے ہیں۔ انھوں نے کوئی ضرورت یہ تحقیق کرنے کی نہیں سمجھی کہ جس گروہ کے متعلق یہ سوال کیا جا رہا ہے اس نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور دوسرے بزرگوں کے متعلق فی الواقع کیا لکھا ہے کس سیاق و سباق میں لکھا ہے اور اس کی دوسری تحریرات کیا شہادت دیتی ہیں کہ وہ ان بزرگوں کے متعلق کیا خیالات رکھتا ہے۔ انھوں نے یہ معلوم کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہ سمجھی کہ اس گروہ کے بعض اشخاص کی طرف منسوب کر کے جو باتیں سوال میں لکھی گئی ہیں وہ فی الواقع کس نے کہی ہیں، اس کی اس گروہ میں کیا حیثیت ہے اور اس کی کسی بات کو پورے گروہ کے خیالات کی ترجمانی قرار دیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ بالفرض اگر مولانا کے پاس اس گروہ کی مطبوعات پڑھنے کے لیے وقت نہ تھا اور نہ بیان کردہ امور کی تحقیق ہی کے لیے وہ فرصت پاتے تھے، تو آخر کس طبیب نے مشورہ دیا تھا کہ حضرت اس معاملہ میں رائے ضرور دیں؟ میں پوچھتا ہوں کیا مذہبی پیشوائی کی ایسی ذمّہ دارانہ مسند پر بیٹھ کر ایک متقی عالم کی یہ روش ہونی چاہیے؟ کیا تقویٰ اور دیانت اسی چیز کا نام ہے؟ کیا یہی وہ تزکیۂ نفس ہے جس سے حضرت خود بہرہ مند ہیں اور دوسروں کو بھی بہرہ مند فرما رہے ہیں؟ کیا اس جواب کی تحریر کے وقت حضرت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات یاد نہ تھے کہ سباب المسلم فسق اور کل المسلم علی المسلم حرام دمہ وماله وعرضه؟ کیا یہ جواب لکھتے وقت حضرت نے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ سوچا تھا کہ ہمیں اور انھیں ایک وقت مرنا اور اپنے رب کی عدالت میں حاضر ہونا ہے۔ وہاں

اگر سائل کے الزامات محض بہتان و افترا ثابت ہو گئے تو حضرت اس کی توثیق کی پاداش سے کیا دے کر بچیں گے؟

رسائل مسائل دوم ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳

پیران کلیسا ہوں کہ شیخانِ حرم ہوں
نے جدّت گفتار ہے نے جدّت کردار

(مہدی برحق)

خدا کے ماننے والے بیشتر انسان اس وقت شرک میں مبتلا ہیں۔ انھوں نے اپنے زعم میں خدائی کے اکثر اختیارات، جن کا تعلق ان کی اپنی زندگی سے ہے دوسری ہستیوں پر تقسیم کر دیے ہیں اور ان ہستیوں کا خیالی نقشہ اپنی خواہشات کے مطابق ایسا بنا لیا ہے کہ وہ اپنے ان خدایانہ اختیارات کو ٹھیک اسی طرح استعمال کرتی ہیں جس طرح یہ چاہتے ہیں کہ وہ استعمال کریں۔ یہ گناہ کرتے ہیں، وہ بخشوا لیتی ہیں۔ یہ فرائض سے غافل اور حقوق سے بے پروا ہو کر بے مُہار جانور کی طرح حرام و حلال کی تمیز کے بغیر دنیا کی کھیتی کو چرتے پھرتے ہیں اور وہ کچھ نذر و نیاز کے عوض ان کی نجات کی ضمانت لے لیتی ہیں۔ یہ چوری بھی کرنے جاتے ہیں تو ان کی عنایت سے تھانہ دار سوتا رہ جاتا ہے۔ ان کے اور ان کے درمیان یہ سودا طے ہو گیا ہے کہ یہ ان کی طرف سے عقیدہ اچھا رکھیں اور نذر پیش کرتے رہیں، اور اس کے جواب میں وہ ان کے سب کام، جو کچھ بھی یہ کرنا چاہیں، بناتی رہیں گی اور مرنے کے بعد جب خدا انھیں پکڑنا چاہے گا تو وہ بیچ میں حائل ہو کر کہہ دیں گے کہ یہ ہمارے دامن کے سایہ میں ہیں۔ ان سے کچھ نہ کہا جائے بلکہ بعض جگہ تو اس پکڑ دھکڑ کی نوبت ہی نہ آئے گی، کیونکہ ان کے گناہوں کا کفارہ پہلے ہی کوئی ادا کر چکا ہے۔ ان مشرکانہ عقائد نے زندگی بعد موت کے عقیدے کو بھی بے معنی کر دیا ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ساری اخلاقی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہیں جو مذہب نے تعمیر کی تھیں۔ مذہبی اخلاقیات کتابوں میں لکھے ہوئے موجود ہیں اور زبانوں پر ان کا ذکر بھی احترام کے ساتھ آتا ہے مگر عملاً ان کی پابندی سے بچنے کے لیے شرک نے فرار کی بے شمار راہیں فراہم کر دی ہیں اور کچھ اس شان سے فراہم کی ہیں کہ جس راہ سے بھی یہ چاہیں بھاگیں بہرحال انھیں اطمینان ہے کہ آخر کار پہنچیں گے نجات ہی کی منزل پر۔

شرک سے قطع نظر کر کے جہاں خدا پرستی اور عقیدۂ آخرت کچھ بہتر صورت میں موجود ہے، وہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ خدا کے مطالبات سکڑ کر انسانی زندگی کے ایک بہت چھوٹے سے دائرے میں محدود ہو گئے ہیں۔ چند اعمال، چند رسوم اور چند پابندیاں ہیں، جن کا محدود انفرادی و معاشرتی زندگی میں خدا ان سے مطالبہ کرتا ہے اور انھی کے معاوضے میں اس نے ایک بہت بڑی جنّت ان کے لیے مہیا کر رکھی ہے۔ اگر یہ ان مطالبوں کو پورا کر دیں تو پھر کوئی چیز خدا کی طرف سے اِن کے کرنے کی نہیں رہ جاتی۔ اس کے بعد یہ آزاد ہیں کہ اپنی زندگی کے معاملات جس طرح چاہیں چلائیں۔ اور اگر ان خدائی مطالبوں میں بھی کوتاہی رہ جائے تو اس کی رحمت اور نکتہ نوازی پر بھروسہ ہے کہ وہ گناہوں کے پشتارے ان کے جنت کے دروازے پر رکھوا لیگا اور اندر جانے کے لیے اعزازی ٹکٹ عنایت فرما دے گا اس تنگ مذہبی تصور نے اوّل تو زندگی کے معاملات پر مذہبی اخلاقیات کے انطباق کو بہت محدود کر دیا ہے جس کی وجہ سے زندگی کے تمام بڑے بڑے شعبے ہر اُس اخلاقی رہنمائی اور بندش سے آزاد ہو گئے ہیں جو مذہب سے حاصل ہو سکتی تھی۔ دوسرے اس تنگ دائرے میں بھی اخلاق کی گرفت سے بچ نکلنے کے لیے ایک راستہ یہاں کھلا ہوا ہے جس سے فائدہ اٹھانے میں کم ہی لوگ سستی دکھاتے ہیں۔

ان سب سے بہتر حالت جن مذہبی طبقوں کی ہے، جو شرک سے بھی پاک ہیں، سچائی کے ساتھ خدا کو بھی مانتے ہیں، اور آخرت کے متعلق بھی کسی جھوٹے بھروسے پر تکیہ نہیں کر بیٹھے ہیں، ان کے اندر اخلاق کی پاکیزگی تو بے شک پائی جاتی ہے اور بہترین سیرت و کردار کے لوگ ان میں مل جاتے ہیں، لیکن ان کا بالعموم مذہب و روحانیت کے محدود تصور نے خراب کر رکھا ہے۔ وہ دنیا اور اس کے مسائل زندگی سے بڑی حد تک بے تعلق ہو کر یا تو چند مخصوص کاموں کو جنھیں مذہبی کام سمجھا جاتا ہے، لے بیٹھتے ہیں یا اپنے نفس کو مانجھ مانجھ کر صاف کرتے ہیں تاکہ وہ اس دنیا ہی میں عالم غیب کی آوازیں سننے اور حسن مطلق کی پرچھائیاں دیکھنے کے قابل ہو جائیں۔ ان کے نزدیک نجات کا راستہ دنیوی زندگی کے کنارے کنارے بچ کر نکل جاتا ہے اور خدا کے قرب سے سرفراز ہونے کی سبیل بس یہ ہے کہ ایک طرف مذہب کے دیے ہوئے نقشے پر اپنی زندگی کے ظاہری پہلوؤں کو ڈھال لیا جائے۔ دوسری طرف نفس کی صفائی کے چند طریقوں سے کام لے کر اُسے مجلّی و مُصفّا

کرلیا جائے۔ اور پھر ایک محدود دائرے کے اندر کچھ مذہبی و روحانی مشاغل میں مصروف
رہ کر زندگی کے دن پورے کر دیے جائیں۔ گویا ان کے خدا کو چند خوش وضع شیشے کے
برتن، چند مقطّع لاؤڈ سپیکر، چند عمدہ گراموفون، چند لطیف ریڈیو سیٹ، چند خوشنما
فوٹو کے کیمرے درکار تھے اور اسی غرض کے لیے اس نے زمین میں اتنا کچھ سامان دے کر
انسانوں کو بھیجا تاکہ یہاں سے اپنے آپ کو ان چیزوں میں تبدیل کر کے پھر اس کے پاس
واپس پہنچ جائیں۔ مذہب و رہبانیت کے اس غلط تصوّر کا سب سے بڑا نقصان یہ
ہوا ہے کہ جو نفوس بلند تر اور پاکیزہ تر اخلاقی صلاحیتوں کے حامل تھے انھیں یہ زندگی کے
میدان سے ہٹا کر گوشوں میں لے گیا اور گھٹیا درجہ کے اوصاف رکھنے والوں کے لیے
بغیر مزاحمت کے خود بخود میدان خالی ہو گیا۔

دنیا کی پوری مذہبی صورت حال کا یہ لبِّ لباب ہے اور اس سے آپ اندازہ کر سکتے
ہیں کہ خدا پرستی سے جو اخلاقی طاقت انسان کو ملنی ممکن تھی، بیشتر انسان تو اس کو سرے
سے حاصل ہی نہیں کر رہے ہیں، اور ایک بہت قلیل تعداد اس کو حاصل کر رہی ہے
لیکن انسانیت کی رہنمائی و سربراہ کاری سے وہ خود دست بردار ہو گئی ہے اس لیے اس
کا حال اس بیٹری کا سا ہے جس میں بجلی بھری جائے اور وہ یوں ہی رکھے رکھے اپنی عمر
پوری کر دے۔

اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصوّرات ۲۱۰ تا ۲۱۵

تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے
تا بساط زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہان بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوّف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

(ابلیس کی مجلس شوریٰ)

پہلی دونوں قسم کی جاہلیتوں کے ساتھ اس تیسری قسم کی جاہلیت کا تعاون عموماً

تین صورتوں میں ہوتا ہے۔

(۱) یہ راہبانہ جاہلیت انسانی جماعت کے نیک اور پاک باز افراد کو دنیا کے
کاروبار سے ہٹا کر گوشہ عزلت میں لے جاتی ہے اور بدترین قسم کے شریر افراد کے
لیے میدان صاف کر دیتی ہے۔ بدکار لوگ خدا کی زمین کے متولّی بن کر آزادی کے ساتھ
فساد پھیلاتے ہیں اور نیک لوگ اپنی نجات کی فکر میں تپسیا کیے چلے جاتے ہیں۔

(۲) اس جاہلیت کے اثرات جہاں تک عوام میں پہنچتے ہیں وہ ان کے اندر غلط
قسم کا صبر و تحمّل اور مایوسانہ نقطۂ نظر پیدا کر کے انھیں ظالموں کے لیے نرم نوالہ بنا دیتے
ہیں۔ اسی وجہ سے ہمیشہ بادشاہ، امراء اور مذہبی اقتدار رکھنے والے طبقے اس راہبانہ
فلسفہ و اخلاق کی اشاعت میں خاص دلچسپی لیتے رہے ہیں اور یہ خوب آرام سے ان کی
سرپرستی میں پھیلتا رہا ہے۔ تاریخ میں کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ امپیریلزم، سرمایہ داری
اور پاپائیت سے اس راہبانہ فلسفہ و اخلاق کی کبھی لڑائی ہوئی ہو۔

(۳) جب یہ راہبانہ فلسفہ و اخلاق انسانی فطرت سے شکست کھا جاتا ہے تو
کتاب الحیل کی تصنیف شروع ہو جاتی ہے۔ کہیں کفارے کا عقیدہ ایجاد ہوتا ہے تاکہ
دل کھول کر گناہ کیا جا سکے اور جنت بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ کہیں ہوس رانی کے لیے عشق
مجازی کا حیلہ نکالا جاتا ہے تاکہ دل کی لگی بجھالی جائے اور تقدس بھی جوں کا توں قائم رہے اور
کہیں ترک دنیا کے پردے میں بادشاہوں اور رئیسوں سے سانٹھ گانٹھ کی جاتی ہے اور روحانی
امارت کا وہ جال پھیلایا جاتا ہے جس کی بدترین مثالیں روم کے پاپاؤں اور مشرقی دنیا کے
گدّی نشینوں نے پیش کی ہیں۔

یہ تو اس جاہلیت کا معاملہ اپنی ہم جنس بہنوں کے ساتھ ہے مگر انبیا علیہم السلام
کی امتوں میں جب یہ گھس آتی ہے تو کچھ اور ہی گل کھلاتی ہے۔ خدا کے دین پر اس کی پہلی
ضرب یہ ہوتی ہے کہ دنیا کو دار العمل، دار الامتحان اور مزرعۃ الآخرہ کے بجائے دار العذاب
اور "مایا کے جال" کی حیثیت سے آدمی کے سامنے پیش کرتی ہے۔ نقطۂ نظر کے اس بنیادی
تغیّر کی وجہ سے آدمی یہ حقیقت بھول جاتا ہے کہ وہ اس دنیا میں خدا کے خلیفہ کی حیثیت
سے مامور ہے۔ وہ یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ میں یہاں کام کرنے اور دنیا کے معاملات کو
چلانے نہیں آیا ہوں بلکہ گندگی و نجاست میں پھینکا گیا ہوں جس سے مجھے بچنا اور دور

بھاگنا چاہیے۔ میرے لیے صحیح پوزیشن یہ ہے کہ میں یہاں نان کو آپریٹر کی طرح ہوں اور ذمہ داریوں کو قبول کرنے کے بجائے ان سے کنارہ کروں۔ اس تصور کے ساتھ آدمی دنیا اور اس کے معاملات پر سہمی ہوئی نگاہ ڈالنے لگتا ہے اور بار خلافت کو سنبھالنا تو درکنار بارِ تمدّن کو بھی اپنے سر لیتے ہوئے ڈرتا ہے۔ اس کے لیے پورا نظام شریعت بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ عبادات اور امر و نواہی کا یہ مفہوم بالکل ساقط ہو جاتا ہے کہ یہ حیات دنیا کی اصلاح اور فرائض خلافت کی انجام دہی کے لیے تیار کرنے والی چیزیں ہیں۔ برعکس اس کے آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ عبادات اور چند خاص مذہبی اعمال اس گناہ زندگی کا کفارہ ہیں بس ان ہی کو پورے انہماک سے ٹھیک ناپ تول کے ساتھ انجام دیتے رہنا چاہیے تاکہ آخرت میں نجات حاصل ہو۔

اس ذہنیت نے انبیا کی امتوں میں سے ایک گروہ کو مراقبہ و مکاشفہ، چلّہ کشی و ریاضت، اوراد و وظائف، احزاب و اعمال[1]، سیر مقامات[2]، اور حقیقت کی فلسفیانہ تعبیروں[3] کے چکر میں ڈال دیا اور مستحبات و نوافل کے التزام میں فرائض سے بھی زیادہ منہمک کر کے خلافت الٰہیہ کے اس کام سے غافل کر دیا جس کو جاری کرنے کے لیے انبیا علیہم السلام آئے تھے۔ اور دوسرے گروہ میں تقشف، تعمق فی الدین، غلو، مونسگافی، چھوٹی چھوٹی چیزوں کے ناپ تول اور جزئیات کے ساتھ غیر معمولی اہتمام کی بیماری پیدا کر دی حتیٰ کہ ان کے لیے خدا کا دین ایسا نازک آبگینہ ہو گیا جو ذرا ذرا سی باتوں سے ٹھیس کھا کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان بے چاروں کا سارا وقت بس اسی دیکھ بھال کے نذر ہونے لگا کہ کہیں کچھ اونچ نیچ نہ ہو جائے اور یہ شیشے کا برتن جو سر پر رکھا ہے، کھیل کھیل ہو کر نہ رہ جائے دین میں اتنی باریکیاں نکل آنے کے بعد ناگزیر ہے کہ جمود، تنگ خیالی اور کم حوصلگی پیدا ہو۔ ایسے لوگوں میں کہاں یہ قابلیت باقی رہ سکتی ہے کہ نگاہ جہاں بیں سے انسانی زندگی کے بڑے بڑے مسائل پر نظر ڈالیں۔ دین کے عالم گیر اصول و کلیات پر گرفت حاصل کریں اور زمانہ کی ہر نئی گردش میں دنیا کی امامت و رہنمائی کے لیے مستعد ہوں۔

---

[1] اعمال سے مراد "عملیات ہیں" جن سے بڑھ کر بے عملی کی کوئی صورت انسانی ذہن آج تک ایجاد نہیں کر سکا۔

[2] مقامات ارضی نہیں بلکہ مقامات روحانی

[3] مثلاً وحدۃ الوجود

تجدید و احیائے دین ۲۲-۲۴

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

(مارچ ۱۹۰۷ء)

قدرت الٰہی نے دو زبردست شیطان مغربی قوموں پر مسلّط کر دیے ہیں جو ان کو ہلاکت اور تباہی کی طرف کھینچے لیے جا رہے ہیں۔ ایک قطع نسل کا شیطان ہے اور دوسرا قوم پرستی کا شیطان، پہلا شیطان ان کے افراد پر مسلط ہے اور دوسرا ان کی قوموں اور سلطنتوں پر۔ پہلے نے ان کے مردوں اور ان کی عورتوں کی عقلیں خراب کر دی ہیں۔ وہ خود ان کے اپنے ہاتھوں سے ان کی نسلوں کا استیصال کرا رہا ہے۔ وہ انھیں منع حمل کی تدبیریں سمجھاتا ہے۔ اسقاط حمل پر آمادہ کرتا ہے۔ عمل تعقیم (STERILISATION) کے فوائد بتاتا ہے جس سے وہ اپنی قوت تولید کا بیج ہی مار دیتے ہیں انھیں اتنا شقی القلب بنا دیتا ہے کہ وہ بچوں کو آپ ہلاک کر دیتے ہیں۔ غرض یہ شیطان وہ ہے جو بتدریج ان سے خودکشی کرا رہا ہے۔

دوسرے شیطان نے ان کے بڑے بڑے سیاسی مدبروں اور جنگی سپہ سالاروں سے صحیح فکر اور صحیح تدبّر کی قوت سلب کر لی ہے۔ وہ ان میں خود غرضی، مسابقت، منافرت، عصبیت اور حرص و طمع کے جذبات پیدا کر رہا ہے۔ وہ ان کو مخاصم اور معاند گروہوں میں تقسیم کر رہا ہے۔ انھیں ایک دوسرے کی طاقت کا مزہ چکھاتا ہے کہ یہ بھی عذاب الٰہی کی ایک صورت ہے۔ اَوْ یَلْبِسَکُمْ شِیَعاً وَّ یُذِیْقَ بَعْضَکُمْ بَاْسَ بَعْضٍ۔ وہ ان کو ایک بڑی زبردست خودکشی کے لیے تیار کر رہا ہے جو تدریجی نہیں بلکہ آنی ہو گی۔ اس نے تمام دنیا میں بارود کے خزانے جمع کر دیے ہیں اور جگہ جگہ خطرے کے مرکز بنا رکھے ہیں۔ اب وہ صرف ایک وقت کا منتظر ہے۔ جونہی اس کا وقت آیا وہ کسی ایک خزانۂ بارود کو شیانہ دکھا دے گا اور پھر آن کی آن میں وہ تباہی نازل ہو گی جس کے آگے تمام پچھلی

قوموں کی تباہیاں ہیچ ہو جائیں گی۔

تنقیحات ۶۸

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

لیکن فہم قرآن کی ان ساری تدبیروں کے باوجود آدمی قرآن کی روح سے پوری طرح آشنا نہیں ہونے پاتا جب تک کہ عملاً وہ کام نہ کرے جس کے لیے قرآن آیا ہے۔ یہ محض نظریات اور خیالات کی کتاب نہیں ہے کہ آپ آرام کرسی پر بیٹھ کر اُسے پڑھیں اور اس کی ساری باتیں سمجھ جائیں۔ یہ دنیا کے عام تصور مذہب کے مطابق ایک نری مذہبی کتاب بھی نہیں ہے کہ مدرسے اور خانقاہ میں اس کے سارے رموز حل کر لیے جائیں جیسا کہ اس مقدمہ کے آغاز میں بتایا جا چکا ہے، یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے اس نے آتے ہی ایک خاموش طبع اور نیک نہاد انسان کو گوشۂ عزلت سے نکال کر خدا سے پھری ہوئی دنیا کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ باطل کے خلاف اس سے آواز اٹھوائی اور وقت کے علمبرداران کفر و فسق و ضلالت سے اس کو لڑوا دیا۔ گھر گھر سے ایک ایک سعید روح اور پاکیزہ نفس کو کھینچ کھینچ کر لائی اور داعی حق کے جھنڈے تلے ان سب کو اکٹھا کیا۔ گوشے گوشے سے ایک ایک فتنہ جو اور فساد پرور کو بھڑکا کر اٹھایا اور حامیانِ حق سے ان کی جنگ کرائی۔ ایک فردِ واحد کی پکار سے اپنا کام شروع کر کے خلافتِ الٰہیہ کے قیام تک پورے تیئیس سال یہی کتاب اس عظیم الشان تحریک کی رہنمائی کرتی رہی اور حق و باطل کی اس طویل و جاں گسل کشمکش کے دوران میں ایک ایک منزل اور ایک ایک مرحلے پر اس نے تخریب کے ڈھنگ اور تعمیر کے نقشے بتائے۔ اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سرے سے نزاعِ کفر و دین اور معرکۂ اسلام و جاہلیت کے میدان میں قدم ہی نہ رکھیں اور اس کشمکش کی کسی منزل سے گزرنے کا آپ کو اتفاق ہی نہ ہوا ہو اور پھر محض قرآن کے الفاظ پڑھ پڑھ کر اس کی ساری حقیقتیں آپ کے سامنے بے نقاب ہو جائیں۔ اُسے تو پوری طرح آپ اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب اُسے لے کر

اٹھیں اور دعوت الی اللہ کا کام شروع کریں اور جس جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے اُسی طرح قدم اٹھاتے چلے جائیں۔ تب وہ سارے تجربات آپ کو پیش آئیں گے جو نزولِ قرآن کے وقت پیش آتے تھے۔ مکّے اور حبش اور طائف کی منزلیں بھی آپ دیکھیں گے اور بدر و اُحد سے لے کر حنین اور تبوک تک کے مراحل بھی آپ کے سامنے آئیں گے۔ ابوجہل اور ابولہب سے بھی آپ کو واسطہ پڑے گا، منافقین اور یہود بھی آپ کو ملیں گے اور سابقین اولین سے لے کر مُؤَلَّفَۃُ الْقُلُوْب تک سبھی طرح کے انسانی نمونے آپ دیکھ بھی لیں گے اور برت بھی لیں گے۔ یہ ایک اور ہی قسم کا "سلوک" ہے جس کو میں "قرآنی سلوک" کہتا ہوں۔ اس سلوک کی شان یہ ہے کہ اس کی جس جس منزل سے آپ گزرتے جائیں گے۔ قرآن کی کچھ آیتیں اور سورتیں خود سامنے آ کر آپ کو بتاتی چلی جائیں گی کہ وہ اس منزل میں اتری تھیں اور یہ ہدایت لے کر آئی تھیں۔ اس وقت یہ تو ممکن ہے کہ لغت اور نحو اور معانی اور بیان کے کچھ نکات سالک کی نگاہ سے چھپے رہ جائیں، لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن اپنی روح کو اس کے سامنے بے نقاب کرنے سے بخل برت جائے۔

پھر اس کلیہ کے مطابق قرآن کے احکام، اس کی اخلاقی تعلیمات، اس کی معاشی اور تمدنی ہدایات اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں اس کے بتائے ہوئے اصول و قوانین آدمی کی سمجھ میں اس وقت تک آ ہی نہیں سکتے جب تک کہ وہ عملاً ان کو برت کر نہ دیکھے۔ نہ وہ فرد اس کتاب کو سمجھ سکتا ہے جس نے اپنی انفرادی زندگی کو اس کی پیروی سے آزاد کر رکھا ہو اور نہ وہ قوم اس سے آشنا ہو سکتی ہے جس کے سارے ہی اجتماعی ادارے اس کی بتائی ہوئی روش کے خلاف چل رہے ہوں۔

تفہیم القرآن اول ۳۳، ۳۴

تم نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر
(ابلیس کی مجلس شوریٰ)

موجودہ تہذیب میں جمہوریت کے معنی ہیں جمہور کی حاکمیت یعنی ایک علاقہ

کے لوگوں کی مجموعی خواہش کا اپنے علاقہ میں مختار مطلق ہونا اور ان کا قانون کے تابع نہ ہونا بلکہ قانون کا ان کی خواہش کا تابع ہونا اور حکومت کی غرض صرف یہ ہونا کہ اس کا نظم اور اس کی طاقت لوگوں کی اجتماعی خواہشات کو پورا کرنے کے کام آئے۔ اب غور کیجیے کہ پہلے تو لادینی نے ان لوگوں کو خدا کے خوف اور اخلاق کے مستقل اصولوں کی گرفت سے آزاد کے بے لگام اور غیر ذمہ دار اور بندہ نفس بنادیا پھر قوم پرستی نے ان کو شدید قسم کی قومی خود غرضی اور اندھی عصبیت اور قومی غرور کے نشہ سے بدمست کر دیا اور اب یہ جمہوریت ان ہی بے لگام، بدمست بندگان نفس کی خواہشات کو قانون سازی کے مکمل اختیارات دیتی ہے اور حکومت کا واحد مقصد یہ قرار دیتی ہے کہ اس کی طاقت ہر اس چیز کے حصول میں صرف ہو جس کی یہ اجتماعی طور پر خواہش کریں۔ سوال یہ ہے کہ اس طرح کی خود مختار صاحب حاکمیت قوم کا حال آخر ایک طاقت ور اور آزاد بدمعاش کے حال سے کس بات میں مختلف ہے؟ جو کچھ ایک بدمعاش فرد خود مختار اور طاقت ور ہو کر چھوٹے پیمانہ پر کرے گا وہی تو اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانہ پر اس طرح کی ایک قوم کرے گی۔ پھر جب دنیا میں صرف ایک ہی قوم ایسی نہ ہو بلکہ ساری متمدن قومیں اسی ڈھنگ پر بے دینی قوم پرستی اور جمہوریت کے اصولوں پر منظم ہوں تو دنیا بھیڑیوں کا میدان جنگ نہ بنے گی تو اور کیا بنے گی۔

جماعت اسلامی کی دعوت ۱۷، ۱۸

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

(دنیائے اسلام)

اقامت دین کے لیے کس قسم کا تزکیہ درکار ہے؟

سوال۔ اقامت دین کی دعوت جس فکر اور جس انداز میں اللہ نے آپ کو پیش کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے، اس سے کوئی صاحب ایمان جو سمع و بصر اور شعور کی دولت سے بہرہ ور ہو اتفاق کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس اسلوب میں حاضر کے تقاضوں کا پورا لحاظ اور اس دعوت کے مزاج کی حقیقی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے اور احقاق حق کے

لیے یہی دو چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن اس کام سے تمام و کمال اتفاق کے باوجود ذہن میں یہ سوال بار بار ابھرتا ہے کہ دین کو برپا کرنے کے لیے جس صحبت کامل، جس سیرت سازی اور جس نظر کیمیا اثر کے اعلا اوصاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود تھے۔ وہ کوئی پھر کہاں سے لاسکتا ہے۔ حضورؐ کی عظیم ترین شخصیت، پھر الہام و وحی سے ہر گام پر رہنمائی، پھر استفادہ و استفاضہ کرنے والے قلوب کی غایت توجہ و اشتیاق نے جماعت صحابہ کے ایک ایک فرد میں یقین کی وہ آگ اور خلوص کا وہ لازوال جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ ان کی زندگی کے ہر ہر جزو سے ان کی دعوت اور ان کے مقصد کا عشق ٹپکا پڑتا تھا۔ آج جب کہ نہ وہ پاکیزہ صحبت نہ وہ بے خطا قیادت، اور نہ مخاطبین میں وہ اہلیت و کیفیت اور اس پر آج کے شر و رو فتن کا فکر و ذہن پر استیلائے تام۔ ایسی حالت میں مخلصین و مجاہدین کی وہ جماعت برپا ہو سکے گی؟ اس کا تصوّر بھی دشوار ہے۔

اس کام کی فرضیت سے مجھے انکار نہیں۔ اس احساس کی بنا پر اسے کر بھی رہا ہوں لیکن کیا اس کے نتائج بھی اسی طرح کے ہوں گے؟ یہ بات میرے لیے بڑی تشویش کی موجب بن جاتی ہے۔ سوچتا ہوں کہ اس کے لیے ویسے ظروف و احوال والی شخصیتیں کہاں ہیں؟ ویسی قیادت کے اوصاف کسی میں، نہ ویسی اطاعت کی صلاحیتیں۔ اقامت دین کا کام کرنے والوں سے کچھ وعدے تو ضرور ہیں مگر ان کا بھی ایک معیار مقرر ہے۔ ایک خاص درجہ کا ایمان و ایقان اور خلوص۔ اپنے مقصد سے عشق اور اس کی تربیت کے لیے ویسی ہی ایک صحبت درکار ہے۔ اگر یہ سب چیزیں مہیا نہ ہوئیں تو چاہے قرآن کے سیاسی نظریہ پر ایک گروہ منظم ہو جائے مگر اسلام کی وہ اخلاقی و روحانی اسپرٹ رکھنے والا گروہ پیدا نہ ہو سکے گا۔ جو اس نظام حیات کی صحیح نمائندگی کر سکتا ہو اور جس کے لیے نصرت و تمکّن کے وعدوں کے ساتھ "خیر امت" اور خلفاء اللہ فی الارض کے خطابات استعمال کیے گئے ہیں۔

چنانچہ تحریک اسلامی کا کام اگرچہ جاری ہے اور اس کے افراد میں بہت کچھ تبدیلیاں بھی ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ مگر جس ایمان کامل کی گرمی، جس زندہ یقین کے مظاہر اور جس خلوص مقصد کی تاثیر صحابہ میں ایمان لانے کے بعد ہی محسوس ہونے لگتی تھی وہ مجھے اپنے یہاں بلحاظ مراتب اور ایک مدت کے بعد بھی دکھائی نہیں دیتی۔

الّا ماشاء اللہ۔ اس کی وجہ صحیح تربیت اور پاکیزہ صحبت کی کمی ہے۔ یا اس کام کے معیار کے مطابق ویسے مربّی اور مزکّی نفوس عالیہ کا فقدان۔ بہرحال جو بھی وجہ ہو مذکورہ اشکال یا اشتباہ کو اس سے تقویت ہوتی ہے۔

ایک دوسری بات میرے لیے باعث خلجان یہ بھی ہے کہ اس دور کی ایک دوسری دینی تحریک، جو اتفاق سے اس دور کا نظر و فکر ساتھ نہیں رکھتی بعض ایسے افراد کو ضرور سامنے لاتی ہے جن سے قلب کسی نہ کسی درجہ میں متاثر ہوتا ہے۔ یہ الجھن میرے لیے حل طلب ہے کہ جو کام ٹھیک ٹھیک معیار پر جاری ہے اس میں تو وہ روح نہیں ابھری اور ایک محدود سی تحریک میں اس کے کچھ آثار نظر آتے ہیں۔

ممکن ہے یہ کمی ذکر اللہ کی عادت نہ ہونے سے پیدا ہوئی ہو۔ جس ذکر کی تلقین احادیث میں آئی ہے تاہم اس کا کوئی قابل اطمینان حل تلاش نہیں کر سکا۔ اس لیے جناب کو تکلیف دے رہا ہوں۔ دل میں اس دعوت کا یقین کیسے پیدا ہو اور اس پر ایمان کیسے زندہ ہو؟ اس کی تدبیر اب تک سمجھ میں نہیں آئی، اگر مذکورہ امور کی کوئی اہمیت جناب محسوس فرمائیں تو تفصیل کے ساتھ جواب رقم فرمائیں"۔

جواب - یہ خلجان جس کا ہمارے محترم رفیق نے اظہار کیا ہے۔ اس سے وقتاً فوقتاً ہمیں سابقہ پیش آتا رہتا ہے اور متعدد مواقع پر اس کو رفع کرنے کی کوشش کی جا چکی ہے آپ رسائل مسائل حصہ اول (صفحہ ۴۶۹ - ۴۷۷) میں اس کا ایک مختصر جواب پا سکتے ہیں۔ تفہیم القرآن کے مقدمہ میں بھی "قرآنی سلوک" کی تشریح کرتے ہوئے اس کے بعض پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے۔ ترجمان القرآن میں پچھلے دنوں جو اشارات نکلتے رہے ہیں، ان میں بھی اس کے بعض گوشوں سے تعرّض کیا گیا ہے۔ یہ چیزیں اگر کوئی شخص بغور پڑھے تو امید ہے کہ بڑی حد تک اس کی تشفی ہو جائے گی۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ خلجان پوری طرح رفع نہیں ہو سکتا جب تک آدمی اس کی تشخیص اور اس کا علاج باقاعدگی کے ساتھ نہ کرے۔ پہلے اس کا سرا تلاش کیجیے کہ یہ شروع کہاں سے ہوتا ہے۔

غالباً اس کی ابتدا اس مقام سے ہوتی ہے کہ آپ "اقامت دین" کا جب تصور کرتے ہیں تو معاً آپ کے سامنے دور نبوت اپنی ساری تابناکیوں کے ساتھ آجاتا ہے، اور اس

خیال سے آپ کا دل بیٹھنے لگتا ہے کہ وہ عظیم رہنما اور وہ بے نظیر کارکن آج کہاں ہیں جن کے ہاتھوں یہ کام اس وقت ہوا تھا۔ میں عرض کرتا ہوں کہ تھوڑی دیر کے لیے آپ اسی ابتدائی مقام پر پھر واپس پہنچ جائیں اور کسی دوسرے سوال پر غور کرنے یا آگے بڑھنے سے پہلے اپنے دل کا جائزہ لے کر تحقیق کیجیے کہ یہ سوال آپ کے دل میں ابھرتا ہے تو اس کے ساتھ کس قسم کے رجحانات آپ کے نفس کو اپنی طرف کھینچنا شروع کرتے ہیں؟ آپ گہرا جائزہ لیں گے تو نمایاں طور پر دو رجحانات کی کشش آپ کو خود محسوس ہوگی:۔

ایک یہ کہ مایوس ہو جاؤ۔ اب نہ وہ رہنما اور وہ کارکن میسّر آئیں گے۔ نہ یہ کام ہو سکے گا۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ پورے دین کی اقامت کا تصور ہی چھوڑ دو۔ جو کام ہو نہیں سکتا اس کے پیچھے پڑنے سے کیا حاصل۔ دین کی جزوی خدمات میں سے کوئی ایک خدمت اپنے ہاتھ میں لے لو اور جیسی کچھ بری بھلی بن آئے کرتے رہو۔ میں اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کی بنا پر کہتا ہوں کہ یہ اولین رجحان ہے جو اس مقام پر آدمی کے سامنے آتا ہے اور میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ پہلا دھوکہ ہے جو شیطان ایک نیک نفس مسلمان کو دیتا ہے تاکہ وہ اقامت دین کے نصب العین سے کسی طرح باز آجائے۔ اس لیے آگے کی کوئی بات سوچنے سے پہلے آپ کو چاہیے کہ اس فریب کو اوّل قدم ہی پر پہچان لیں اور اگر آپ نیک نیت ہیں تو پورے شعور اور عزم کے ساتھ اپنے ذہن میں پہلے اس کا اچھی طرح قلع قمع کر دیں۔

دوسرا رجحان جو اس کے بعد سامنے آتا ہے یہ ہے کہ یہ کام ہے تو بے شک ضروری اور فرض، مگر اس کے لیے رہنماؤں اور کارکنوں میں وہی روحانی و اخلاقی اوصاف درکار ہیں جن کی بدولت عہد نبوی میں یہ کام ہوا تھا لہٰذا پہلے ویسے بن جاؤ اور اس طرز کے آدمی بنا لو، پھر اس کام میں لگو۔ یہ دوسرا دھوکہ ہے جو پہلے دھوکے سے بچ نکلنے والے کو شیطانِ رجیم دیا کرتا ہے۔ وہ جب دیکھتا ہے کہ یہ شخص اس نصب العین پر جم گیا ہے اور اس سے ہٹنے پر کسی طرح راضی نہیں ہوتا تو پھر اس کو فکر کے بجائے تدبیر کی ایک غلط راہ پر ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اس سے کہتا ہے کہ بے شک دریا پار جس منزل مقصود کی طرف تو جانا چاہتا ہے وہ ہے تو منزل مقصود ہی، مگر بے وقوف تیرنا سیکھے بغیر دریا میں اترے گا؟ پہلے دریا کے باہر خشکی پر تیرنے کی اچھی طرح مشق کر لے پھر دریا

میں قدم رکھ! اس طرح وہ ناصح مشفق، آدمی کو بے وقوف بنا دیتا ہے اور جو لوگ اس کے داؤں سے مات کھا جاتے ہیں وہ سب نہ صرف خشکی پر تیراکی کی مشق شروع کر دیتے ہیں بلکہ جن جن لوگوں کو اپنے ساتھ لے چلنا چاہتے ہیں ان کو بھی خشکی کا تیراک بنانے میں خوب مہارت فن دکھاتے ہیں۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان ماہرین فن کو اکثر تو عمر بھر دریا میں اترنے کی ہمت نہیں ہوتی، اور اگر کبھی اتر جاتے ہیں تو زمین پاؤں تلے سے نکلتے ہی یا غرق ہو جاتے ہیں، یا دریا کے بہاؤ پر بہہ نکلتے ہیں۔ کیونکہ دریا سے باہر خشکی پر تیراکی میں جو کمال پیدا کیا جاتا ہے وہ دریا کی روانی سے پہلا سابقہ پڑتے ہی کالعدم ہو جاتا ہے۔

اس کی مثال تلاش کرنے کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں، اپنے ہی ملک کے ان علما کا حشر دیکھ لیجیے جنھوں نے درس حدیث و فقہ کی مسندوں اور تزکیۂ نفس کے وادیوں سے نکل کر ملکی سیاست کے بحر مواج میں چھلانگ لگائی تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان نفوس قدسیہ کی برکت سے دریا کی رفتار کا رخ بدل جاتا اور اس کی گندگیاں دور ہو جاتیں۔ مگر ہوا یہ کہ وہ خود اس کی گندگیوں میں لت پت ہو گئے اور دریا کا رخ موڑنے کے بجائے خود اس کے رخ پر مڑ گئے۔ آپ ان بزرگوں کی فہرست پر نگاہ ڈالیں۔ اس میں کیسے کیسے نامور استادان فن سیاحت شریک ہیں۔ مگر اس مشاہدے کو اب کون آنکھوں والا جھٹلا سکتا ہے کہ یہ سارے ہی استاد اپنے مایۂ ناز شاگردوں اور خلیفوں سمیت یا غرق ہوئے یا بہہ گئے۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ شیطان کے اس دھوکے کو بھی اچھی طرح پہچان لیں اور اگر واقعی خدا کی راہ میں کچھ کرنا چاہتے ہیں تو اپنے دل کو اس کی ہر کھٹک سے صاف کیے بغیر ایک قدم بھی آگے نہ بڑھیں۔ ورنہ راستے میں ہر قدم پر یہ آپ کے اندر کمزوری پیدا کرتا رہے گا اور آپ کے توسط سے دوسرے بہت سے ساتھیوں تک بھی اس کا اثر متعدی ہوگا۔

ان دونوں رجحانات کی غلطی کو اگر آغاز ہی میں محسوس کرے تو وہ اس طریق تزکیہ و تربیت کو آپ سے آپ ترجیح دے گا جسے ہم نے ترجیح دی ہے۔ لیکن اس راہ میں چند قدم چلتے ہی یکے بعد دیگرے کچھ دوراہے ایسے آتے ہیں جن میں سے ہر ایک پر پہنچ کر آدمی کا

دل چاہتا ہے کہ دائیں یا بائیں مڑ جائے۔ اور اگر وہ نہ مڑے تب بھی آگے چلتے ہوئے بار بار اس کے دل میں ایک کھٹک پیدا ہوتی ہے کہ وہ ان میں سے کسی موڑ پر کیوں نہ مڑ گیا بلکہ بسا اوقات یہاں تک جی چاہنے لگتا ہے کہ پلٹے اور انہی میں سے کسی موڑ کی طرف مڑ جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ ذرا آپ اپنے ذہن میں اپنا سفر آغاز سے شروع کریں اور ان میں سے ہر موڑ کی کشش محسوس کر کے ذرا اس کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ ادھر کیا ہے اور کیا چیز اس کی طرف مائل کرتی ہے۔

ایک موڑ آتا ہے جہاں آدمی کے دل میں بار بار یہ خیال چٹکیاں لیتا ہے کہ اس کام کے لیے بہرحال تزکیۂ نفس ضروری ہے، اور تزکیۂ نفس کے وہ طریقے جو مکے اور مدینے میں اختیار کیے گئے تھے کچھ واضح اور منضبط نہیں ہیں اور بعد کے ادوار میں جن بزرگوں نے ان طریقوں کو منضبط کیا وہ صوفیائے کرام ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ سب بزرگان دین ہی ہیں لہٰذا اس کام کے لیے جو تزکیہ مطلوب ہے اس کو حاصل کرنے کے لیے تصوف کے معروف طریقوں میں سے کسی کو اختیار کرنا ناگزیر ہے، نئے طرز کے لوگوں میں تو شاید کم ہوں مگر مذہبی خانوادوں میں جن لوگوں نے آنکھیں کھولی ہیں۔ ان سب کو اس موڑ کی کشش کم و بیش متاثر کرتی ہے۔ میں ان تمام لوگوں سے جو اس کشش کو محسوس کرتے ہیں عرض کرتا ہوں کہ براہ کرم اس مقام پر ٹھہر کر خوب اچھی طرح غور و تحقیق کریں اور ذرا بے لاگ طریقے سے کریں۔ کیا واقعی کہیں صوفیانہ لٹریچر میں اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے کہ اقامت دین اپنے وسیع و جامع تصور کے ساتھ ان بزرگوں کے پیش نظر تھی جن سے یہ صوفیانہ طریقے ماثور ہیں؟ کیا کہیں اس بات کا پتہ نشان ملتا ہے جو اس مقصد کے لیے کارکن تیار کرنے کی غرض سے انھوں نے ان طریقوں کو اختیار کیا تھا؟ کیا ان طریقوں سے تیار کیے ہوئے آدمیوں نے کبھی یہ کام کیا ہے؟ اور کیا ہے تو یہ طریقے اس کام میں مفید ثابت ہوتے ہیں؟

پھر قطع نظر اس سے کہ صدر اول کا طریقہ تزکیۂ نفس منضبط ہے یا نہیں، ہمیں قرآن اور سیرت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں اس کے جو اصول اور عمل جزئیات ملتے ہیں ان کا مقابلہ بعد کے صوفیانہ طریقوں سے کر کے آپ خود دیکھیں۔ کیا ان دونوں میں نمایاں فرق نہیں پایا جاتا؟ اس بحث میں نہ پڑیے کہ صوفیانہ طریقوں میں جو مختلف چیزیں پائی جاتی ہیں وہ مناجات کے قبیل سے ہیں یا محظورات کے قبیل سے۔ بحث صرف

یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں اخلاقی وروحانی علاج کے لیے جو نسخہ تجویز کیا گیا تھا آیا صوفیہ
نے اسی نسخے کو جوں کا توں استعمال کیا؟ یا اس نسخے کے بعض اجزا کا اس میں اضافہ کر دیا؟
پہلی صورت کا تو شاید آج تصوف کا کوئی بڑے سے بڑا وکیل بھی دعوا نہیں کر سکتا۔ لامحالہ
دوسری صورت ہی ماننی پڑے گی اور وہی واقعتاً موجود بھی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اجزا
کی مقداروں میں کمی بیشی اور نئے اجزا کے اضافے سے نسخے کا مزاج بدلا ہے یا نہیں؟ اگر بدل
گیا ہے تو یہ اسی مقصد کے لیے کیسے مفید ہو سکتا ہے جس کے لیے حکیم مطلق اور اس کے
بلاواسطہ شاگرد نے اپنا نسخہ مرتب کیا تھا؟ اور اگر کوئی کہتا ہے کہ ان مختلف ترمیمات
اور اضافوں کے باوجود نسخے کا مزاج نہیں بدلا ہے تو میں عرض کروں گا کہ تاریخ حکمت
میں یہ بالکل ہی نرالا واقعہ ہے (بلکہ شاید خرق عادت ہے) کہ اجزائے نسخہ میں مقادیر کی کمی
وبیشی اور مختلف نئے اضافوں کے باوجود نسخے کا مزاج جوں کا توں رہ گیا!

میں توقع رکھتا ہوں کہ اگر کوئی شخص تحقیق میں بے جا عقیدتوں اور موروثی تعصبات
کو دخل نہ دے گا اور ٹھنڈے دل سے بے لاگ تحقیق کرے گا تو اس معاملہ میں پورا اطمینان
ہو جائے گا کہ اقامت دین کے لیے ہمیں اسی طریق تزکیہ پر اعتماد کرنا ہو گا جو قرآن اور سیرت
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ملتا ہے وہ اگر منضبط نہیں ہے تو اب اُسے منضبط کرنا
چاہیے۔

اس موڑ کو جو شخص پورے اطمینان کے ساتھ چھوڑ کر آگے بڑھتا ہے اور ذرا آگے
چل کر ایک اور مقام پر حیرانی پیش آتی ہے۔ سیرت نگاروں نے عہد صحابہؓ کی شخصیتوں کے
جو مرقعے کھینچے ہیں وہ اس کی نگاہ میں گھومنے لگتے ہیں اور یہ دیکھ کر اس کا دل بھر بیٹھنے لگتا ہے
کہ ان کتابی مرقعوں سے ملتی جلتی شخصیتیں تو کہیں نظر نہیں آتیں۔ پھر بھلا یہ کام کیسے ہوگا؟
اس مقام پر آدمی ہر طرف نظر دوڑاتا ہے کہ کہاں کوئی راستہ ملتا ہے جدھر جا کر میں اپنی مطلوب
شخصیتیں پا سکوں اور بسا اوقات شیطان یہاں پھر اس کو مشورہ دیتا ہے کہ بس اسی جگہ سے مُڑ
جاؤ یا مایوس ہو کر یہیں بیٹھ رہو اس مرحلہ میں بھی ٹھہر کر آدمی کو اچھی طرح غور کرنا چاہیے اور
ٹھنڈے دل سے تحقیق کر کے ایک رائے قائم کرنی چاہیے۔ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر یہ
عرض کرتا ہوں کہ یہاں جو کچھ حیرانی و پریشانی آدمی کو لاحق ہوتی ہے دو حقیقتوں سے غفلت کی
بنا پر ہوتی ہے۔ وہ دو حقیقتیں اگر اس کی سمجھ میں آجائیں تو قلب مطمئن ہو جاتا ہے اور آگے

کا راستہ صاف نظر آنے لگتا ہے۔

پہلی حقیقت یہ ہے کہ جن شخصیتوں کے نمونے وہ تلاش کر رہا ہے وہ شخصیتیں نہ ایک
دن میں بنی تھیں۔ نہ آپ ہی آپ بن گئی تھیں۔ وہ بنانے سے بنی تھیں۔ سالہا سال میں بنی
تھیں، اور اگر آپ بے لاگ تحقیق سے کام لیں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ گوشہائے
عزلت میں نہیں بنی تھیں بلکہ قرآن وسنت کی ہدایت کے مطابق اقامت دین کی جدوجہد
میں لگ جانے اور جاہلیت کے خلاف کشمکش کرنے سے بتدریج بن سنور کر وہ اس مرتبے
پر پہنچی تھیں جسے آپ سیرت کی کتابوں میں دیکھ کر عش عش کر رہے ہیں۔ اب کوئی وجہ
نہیں کہ شخصیت سازی کے اس طریقے کی پیروی کرنے سے وہی نتائج حاصل نہ ہوں۔ اس
درجے کے نتائج نہ سہی، اس طرز اور اس نوعیت کے نتائج یقیناً حاصل ہونے ہی چاہئیں۔
بشرطیکہ صبر سے کام لے کر اسی طریقے کی پیروی کی جائے اور حکمت وتفقہ کے ساتھ اس
کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر کی جائے۔

دوسری حقیقت جس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ پریشانی لاحق ہوتی ہے یہ ہے کہ کتابی
شخصیتیں واقعی شخصیتوں سے اچھی خاصی مختلف ہوتی ہیں۔ ایک گزرے ہوئے زمانے کے
جو نقشے صفحہ قرطاس پر کھینچے جاتے ہیں گوشت پوست کی دنیا میں بعینہ وہ نقشے کبھی پیدا
نہیں کیے جا سکتے۔ لہٰذا جس شخص کو خیالی دنیا میں نہ رہنا ہو بلکہ واقعی دنیا میں کچھ کرنا ہو اسے
اس خیال خام میں مبتلا نہ ہونا چاہیے کہ گوشت پوست کے انسان کبھی بشری کمزوریوں سے
بالکل منزہ اور تمام مثالی وکمالات کا مرقع بن سکیں گے۔ آپ حد کمال کو نگاہ سے اوجھل تو نہ ہونے
دیں اور اس تک خود پہنچنے اور دوسروں کو پہنچانے کی کوشش بھی جاری رکھیں، مگر جب کہ
عملاً خدا کی راہ میں کام کرنا اور ہزارہا آدمیوں سے کام لینا ہو تو قرآن وسنت کے مطابق دین کے
تقاضوں اور مطالبات کی حد اوسط آپ کو نگاہ میں رکھنی پڑے گی جس پر آپ کا اور آپ کے
ساتھیوں کا قائم ہو جانا راہ خدا میں کام کرنے کے لیے کافی ہو اور جس سے نیچے گر جانا ناقابل برداشت
نہ ہو۔ یہ حد اوسط خود ساختہ نہ ہونی چاہیے اس کا ماخذ خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت
ہی ہونی چاہیے۔ لیکن بہرحال اس حد کو سمجھنا اور نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر
کوئی عملی کام آدمی نہیں کر سکتا۔ صدر اول میں جن لوگوں نے خدا کا کام کیا تھا وہ سب بھی
یکساں نہ تھے اور نہ ان میں سے کوئی بشری کمزوریوں سے مبرّا تھا۔ آج بھی جن لوگوں کے

ہاتھوں یہ کام ہوگا وہ ہر طرح کی کمزوریوں سے پاک نہ ہوں گے۔ یہ خوبی نظام جماعت میں ہونی چاہیے کہ وہ مجموعی طور پر ایک صالح اور حکیمانہ نظام ہو اور اس کے اندر یہ استعداد بھی موجود ہو کہ افراد اس میں شامل ہو کر دین حق کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دیں اور ان کی کمزوریاں بروئے کار آنے کے کم سے کم مواقع پائیں۔

رسائل مسائل دوم ۵۹۳ تا ۶۰۶

تیری طبیعت ہے اور تیرا زمانہ ہے اور
ترے موافق نہیں خانقہی سلسلہ !

اب جس کسی کو تجدید دین کے لیے کوئی کام کرنا ہو اس کے لیے لازم ہے کہ متصوفین کی زبان و اصطلاحات سے، رموز و اشارات سے، لباس و اطوار سے، پیری مریدی سے، اور ہر اس چیز سے جو اس طریقہ کی یاد تازہ کرنے والی ہو، مسلمانوں کو اس طرح پرہیز کرائے جیسے ذیابیطس کے مریض کو شکر سے پرہیز کرایا جاتا ہے۔

تجدید و احیائے دین ۱۲۱

تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

(تن بہ تقدیر)

بدقسمتی سے اس وقت کوئی اسلامی آبادی ایسی نہیں ہے جو صحیح معنوں میں سیاسی اور ذہنی اعتبار سے پوری طرح آزاد ہو۔ جہاں ان کو سیاسی استقلال اور خود اختیاری حاصل بھی ہے وہاں وہ ذہنی غلامی سے آزاد نہیں ہیں۔ ان کے مدرسے، ان کے دفتر، ان کے بازار، ان کی سوسائٹی، ان کے گھر، حتیٰ کہ ان کے جسم تک اپنی زبان حال سے شہادت دے رہے ہیں کہ ان پر مغرب کی تہذیب، مغرب کے افکار، مغرب کے علوم و فنون حکمراں ہیں۔ وہ مغرب کے دماغ سے سوچتے ہیں، مغرب کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ مغرب کی بتائی ہوئی راہوں پر چلتے ہیں خواہ ان کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو۔ بہر صورت یہ معروضہ ان

کے دماغوں پر مسلّط ہے کہ حق وہ ہے جس کو مغرب حق سمجھتا ہے اور باطل وہ ہے جس کو مغرب نے باطل قرار دیا ہے۔ حق و صداقت، تہذیب، اخلاق، انسانیت، شایستگی، ہر ایک کا معیار ان کے نزدیک وہی ہے جو مغرب نے مقرر کر رکھا ہے۔ اپنے دین و ایمان، اپنے افکار و خیالات، اپنی تہذیب و شایستگی، اپنے اخلاق و آداب، سب کو وہ اسی معیار پر جانچتے ہیں۔ جو چیز اس معیار پر پوری اترتی ہے اُسے درست سمجھتے ہیں، مطمئن ہوتے ہیں۔ فخر کرتے ہیں کہ ہماری فلاں چیز مغرب کے معیار پر اتر آئی اور جو چیز اس معیار پر پوری نہیں اترتی اُسے شعوری یا غیر شعوری طور پر غلط مان لیتے ہیں۔ کوئی اعلانیہ اس کو ٹھکرا دیتا ہے، کوئی دل میں گھٹتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر اسے مغربی معیار کے مطابق کر دے۔

تنقیحات ۶، ۷

جانتا ہوں میں یہ امت حامل قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

(ابلیس کی مجلس شوریٰ)

اس زمانہ میں وہ معاشی نظام جس کو اسلام نے قائم کیا تھا درہم برہم ہو چکا ہے، اس کے اصول و نظریات بھی دلوں سے محو ہو گئے ہیں، اور ہمارے گرد و پیش کی دنیا پر ایک ایسا نظام پوری طرح حاوی ہو گیا ہے جس کی بنیاد "سرمایہ داری" کے اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام معیشت نہ صرف عملاً ہم پر محیط ہے، بلکہ ہمارے دل و دماغ پر بھی اس کے اصول و نظریات چھا گئے ہیں۔ اس لیے جب کسی معاشی مسئلہ پر ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمارا نقطۂ نظر وہی ہوتا ہے جو سرمایہ داری کا نقطۂ نظر ہے۔ ہمارے بحث و تحقیق کی ابتدا ہی اس طرح ہوتی ہے کہ ہم پہلے معاشیات کے سرمایہ دارانہ نظریات اور اصولوں کو مان لیتے ہیں اور اس کے بعد کسی معاشی طریقہ کے جواز و عدم پر گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن اگر تھوڑی سی سمجھ سے کام لیا جائے تو یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ تحقیق کا یہ طریقہ اصلاً غلط ہے۔ اسلام کا نظم معیشت اپنے نظریہ اور اپنے اصول میں سرمایہ داری کے نظم معیشت سے بالکل مختلف ہے۔ دونوں کے مقاصد الگ الگ ہیں۔ دونوں کی روح

جدا جدا ہے ، دونوں کے مناہج علاحدہ علاحدہ ہیں - اب اگر کسی مسئلہ کے متعلق سرمایہ داری کے اصول ونظریات کو تسلیم کرکے اسلام کے معاشی احکام میں سے کسی حکم پر نظر ڈالی جائے گی تو لامحالہ یا تو وہ بالکل غلط نظر آئے گا یا اس میں ایسی ترمیم کردی جائے گی جس سے وہ اسلامی قانون کے اصول سے ہٹ کر بالکل سرمایہ داری کے قالب میں ڈھل جائے گا اور اس میں نہ اسلامی روح باقی رہے گی، نہ اسلامی قانون کے اغراض ومقاصد اس سے حاصل ہوسکیں گے، اور نہ وہ اپنے جوہر میں حقیقتاً ایک اسلامی حکم ہوگا

جوہر انسان عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

والدہ مرحومہ کی یاد میں)

ان سے کہو "موت کا وہ فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تم کو پورا کا پورا اپنے قبضے میں لے لے گا اور پھر تم اپنے رب کی طرف پلٹا لائے جاؤ گے [۲۱]

[۲۱] یعنی تمہارا وہ "ہم" مٹی میں رَل مِل نہ جائے گا، بلکہ اس کی مہلت عمل ختم ہوتے ہی خدا کا فرشتہ موت آئے گا اور اُسے جسم سے نکال کر سموچا اپنے قبضہ میں لے لے گا۔ اس کا کوئی ادنیٰ سا جز بھی جسم کے ساتھ مٹی میں نہ جا سکے گا۔ وہ پورا کا پورا حراست (CUSTODY) میں لے لیا جائے گا اور اپنے رب کے حضور پیش کر دیا جائے گا۔

اس مختصر سی آیت میں بہت سے حقائق پر روشنی ڈالی گئی ہے جن پر سے سرسری طور پر نہ گزر جائیے۔

(۱) اس میں تصریح ہے کہ موت کچھ یوں ہی نہیں آجاتی کہ ایک گھڑی چل رہی تھی، کوک ختم ہوئی اور وہ چلتے چلتے یکایک بند ہو گئی۔ بلکہ دراصل اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص فرشتہ مقرر کر رکھا ہے جو آکر باقاعدہ روح کو ٹھیک اسی طرح وصول کرتا ہے جس طرح ایک سرکاری امین (OEEICIAL RECEIYER) کسی چیز کو اپنے قبضہ میں لیتا ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات پر اس کی مزید تفصیلات جو بیان کی گئی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس افسر موت کے ماتحت فرشتوں کا ایک پورا عملہ ہے جو موت وارد کرنے

اور روح کو جسم سے نکالنے اور اس کو قبضے میں لینے کی بہت سی مختلف النوع خدمات انجام دیتا ہے نیز یہ کہ اس عملے کا برتاؤ مجرم روح کے ساتھ کچھ اور ہوتا ہے اور مومن صالح روح کے ساتھ کچھ اور۔ (ان تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو سورۂ نساء آیت ۹۷ - اور انعام ۹۳- النحل ۲۸ - الواقعہ ۸۳ - ۹۴)۔

(۲) اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ موت سے انسان معدوم نہیں ہوجاتا بلکہ اس کی روح جسم سے نکل کر باقی رہتی ہے۔ قرآن کے الفاظ "موت کا فرشتہ تم کو پورا پورا اپنے قبضے میں لے لے گا" اسی حقیقت پر دلالت کرتے ہیں کیونکہ کوئی معدوم چیز قبضے میں نہیں لی جاتی۔ قبضے میں لینے کا مطلب ہی یہ ہے کہ مقبوضہ چیز قابض کے پاس رہے۔

(۳) اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ موت کے وقت جو چیز قبضے میں لی جاتی ہے وہ آدمی کی حیوانی زندگی (BIOLOGICAL LIFE) نہیں بلکہ اس کی وہ خودی، اس کی وہ اَنا Ego ہے جو "میں" اور "ہم" اور "تم" کے الفاظ سے تعبیر کی جاتی ہے۔ یہ اَنا دنیا میں کام کرکے جیسی کچھ شخصیت بنتی ہے۔ وہ پوری کی پوری، جوں کی توں (Intact.) نکال لی جاتی ہے بغیر اس کے کہ اس کے اوصاف میں کوئی کمی بیشی ہو۔ اور یہی چیز موت کے بعد اپنے رب کی طرف پلٹائی جاتی ہے۔ اس کو آخرت میں نیا جنم اور نیا جسم دیا جائے گا، اس پر مقدمہ قائم کیا جائے گا، اس سے حساب لیا جائے گا۔ اور اسی کو جزا و سزا دیکھنی ہوگی۔

تفہیم القرآن ۴، ۴۳

جو عالم ایجاد میں ہے صاحب ایجاد
ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ

(محراب گل افغان کے افکار)

ذہنی غلبہ و استیلاء کی بنا دراصل فکری اجتہاد اور علمی تحقیق پر قائم ہوتی ہے جو قوم اس راہ میں پیش قدمی کرتی ہے وہی دنیا کی رہنما اور قوموں کی امام بن جاتی ہے اور اسی کے افکار دنیا پر چھا جاتے ہیں اور جو قوم اس راہ میں پیچھے رہ جاتی ہے اسے مقلد اور متبع بننا پڑتا ہے۔ اس کے افکار و معتقدات میں یہ قوت باقی نہیں رہتی کہ وہ دماغوں پر اپنا تسلط قائم رکھ سکیں۔ مجتہد و محقق قوم کے طاقت ور افکار و معتقدات کا سیلاب ان کو بہا لیجاتا

ہے اور ان میں اتنا بل بوتا نہیں رہتا کہ اپنی جگہ پر رہ جائیں۔ مسلمان جب تک تحقیق واجتہاد کے میدان میں آگے بڑھتے رہے تمام دنیا کی قومیں ان کی پیرو اور مقلد رہیں۔ اسلامی فکر ساری نوع انسانی کے افکار پر غالب رہی۔ حسن وقبح، نیکی وبدی، غلط اور صحیح کا جو معیار اسلام نے مقرر کیا وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر تمام دنیا کے نزدیک معیار قرار پایا اور قصداً یا اضطراراً دنیا اپنے افکار واعمال کو اسی معیار کے مطابق ڈھالتی رہی مگر جب مسلمانوں میں ارباب فکر اور اصحاب تحقیق پیدا ہونے بند ہوگئے۔ جب انھوں نے سوچنا اور دریافت کرنا چھوڑ دیا۔ جب وہ اکتساب علم اور اجتہاد فکر کی راہ میں تھک کر بیٹھ گئے تو گویا انھوں نے خود دنیا کی رہنمائی سے استعفا دے دیا۔ دوسری طرف مغربی قومیں اس راہ میں آگے بڑھیں انھوں نے غور وفکر کی قوتوں سے کام لینا شروع کیا۔ کائنات کے راز ٹٹولے اور فطرت کی چھپی ہوئی طاقتوں کے خزانے تلاش کیے، اس کا لازمی نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا مغربی قومیں دنیا کی رہنما بن گئیں اور مسلمانوں کو اسی طرح ان کے اقتدار کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا جس طرح کبھی دنیا نے خود مسلمانوں کے اقتدار کے آگے خم کیا تھا۔

تنقیحات ۸،۷

جہاں تمام ہے میراث مرد مومن کی
مرے کلام پر حجت ہے نکتہ لَوْلَاک

صوم وصلوٰۃ اور حج وزکوٰۃ اور ذکر وتسبیح انسان کو اس بڑی عبادت کے لیے مستعد کرنے والے تمرینات (Traing Courses) ہیں جو انسان کی زندگی کو حیوانی زندگی کے ادنیٰ مقام سے اٹھا کر انسانی زندگی کے بلند ترین مقام پر لے جاتی ہے، اس کو اضطرار واختیار دونوں میں اپنے مالک کا مطیع وفرماں بردار بندہ بنا دیتی ہے اور اُسے بادشاہ حقیقی کی سلطنت کا ایسا ملازم بناتی ہے کہ اس کی خدمت وہ اپنے جسم وجان کی ساری قوتوں کے ساتھ اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں کرتا ہے جب انسان عبادت کے اس مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے تو اس کو وہ شرف حاصل ہوتا ہے جس میں کائنات کی کوئی مخلوق اس کی ہمسری کا دعوا نہیں کر سکتی۔ ملائکہ تک اس کے مقام سے فروتر ہوتے ہیں وہ دنیا میں فی الفضل خدا کا خلیفہ ہوتا ہے اس کو

خدا کے سوا کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ذلّت نہیں دی جاتی۔ اس کی گردن میں خدا کی غلامی کے سوا کسی کی غلامی کا طوق نہیں ہوتا اس کے پاؤں میں خدائی زنجیر کے سوا کسی کی زنجیر نہیں ہوتی۔ اس کا سر خدا کے حکم کے سوا کسی کے حکم کے آگے نہیں جھکتا۔ وہ خدا کا غلام اور سب کا آقا ہوتا ہے۔ وہ خدا کا محکوم اور سب کا حاکم ہوتا ہے۔ اس کو خدا کی طرف سے اس کی زمین پر حکومت کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ فرعون ونمرود کی طرح باغی وغاصب نہیں ہوتا بلکہ فرمان شاہی سے زمین پر خدا کا نائب ہوتا ہے اور حق کے ساتھ فرماں روائی کرتا ہے۔

تفہیمات ۱   ۵۵، ۵۶

جب پیر فلک نے ورق ایام کا الٹا
آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل
دنیا تو ملی، طائر دیں کر گیا پرواز

(فردوس میں ایک مکالمہ)

اس کو بد قسمتی کے سوا اور کیا کہیے کہ جس صدی میں یہ نئی تہذیب اپنی مادہ پرستی، الحاد اور دہریت کی انتہا کو پہنچی، ٹھیک وہی صدی تھی جس میں مراکش سے لے کر مشرق اقصیٰ تک تمام اسلامی ممالک مغربی قوموں کے سیاسی اقتدار اور حاکمانہ استیلا سے مغلوب ہوئے۔ مسلمانوں پر مغربی تلوار اور قلم دونوں کا حملہ ایک ساتھ ہوا۔ جو دماغ مغربی طاقتوں کے سیاسی غلبہ سے مرعوب اور دہشت زدہ ہو چکے تھے ان کے لیے مشکل ہو گیا کہ مغرب کے فلسفہ وسائنس اور اُن کی پروردہ تہذیب کے رعب وداب سے محفوظ رہتے۔ خصوصیت کے ساتھ ان مسلمان قوموں کی حالت اور بھی زیادہ نازک تھی جو براہ راست کسی مغربی ملک کے زیر حکم آگئی تھیں۔ ان کو اپنی دینوی مفاد کی حفاظت کے لیے مجبوراً مغربی علوم حاصل کرنے پڑے اور چوں کہ یہ تحصیل علم خالص تحصیل علم کی خاطر نہ تھی اور مزید برآں ایک مرعوب ذہنیت کے ساتھ مغربی استادوں کے سامنے زانوئے ادب

نہ کیا گیا تھا، اس لیے مسلمانوں کی نئی نسلوں نے شدت کے ساتھ مغربی افکار اور
سائنٹفک نظریات کا اثر قبول کیا۔ ان کی ذہنیتیں مغربی سانچے میں ڈھلتی چلی گئیں۔
ان کے دلوں میں مغربی تہذیب کا نفوذ بڑھتا چلا گیا۔ ان میں وہ ناقدانہ نظر پیدا ہی نہیں
ہوئی جس سے وہ صحیح اور غلط کو پرکھتے اور صرف صحیح کو اختیار کرتے۔ ان میں یہ صلاحیت
ہی پیدا نہ ہو سکی کہ آزادی اور استقلال کے ساتھ غور و فکر کرتے اور اپنے ذاتی
اجتہاد سے کوئی رائے قائم کرتے۔ اسی کا نتیجہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اسلامی تہذیب
جن بنیادوں پر قائم ہے وہ متزلزل ہو گئی ہیں۔ ذہنیتوں کا وہ سانچہ ہی بگڑ گیا ہے۔
جس سے اسلامی طریق پر سوچا اور سمجھا جا سکتا تھا۔ مغربی طریق پر سوچنے اور مغربی
تہذیب کے اصولوں پر اعتقاد رکھنے والے دماغوں کی ساخت ہی ایسی ہے کہ اس
میں اسلام کے اصول ٹھیک نہیں بیٹھ سکتے۔ اور جب اصول ہی اس میں نہیں سما سکتے
تو فروع میں طرح طرح کے شبہات اور نت نئے شکوک پیدا ہونا ہرگز قابل تعجب
نہیں۔

تنقیحات ۱۸، ۱۹

جاتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

(فلسفہ و مذہب)

"اس جماعتی احساس کے فقدان یا خود فراموشی کے بُرے نتائج اتنے زیادہ ہیں کہ ان
کا شمار کرنا مشکل ہے۔ یہ اسی بے حسی و خود فراموشی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان ہر رہرو کے پیچھے
چلنے اور ہر نظریے اور مسلک کی پیروی کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے، خود وہ اسلام
کے نظریے اور اس کے مقاصد اور اس کے اصولوں سے کتنا ہٹا ہوا ہو۔ وہ نیشنلسٹ بھی
بنتا ہے کمیونسٹ بھی بن جاتا ہے۔ فاشسٹی اصول تسلیم کرنے میں بھی اُسے کوئی تامل
نہیں ہوتا۔ مغرب کے مختلف اجتماعی اور مابعد الطبیعی افکار اور علمی نظریات ہیں سے
قریب قریب ہر ایک کے پیرو آپ کو مسلمانوں میں مل جائیں گے۔ دنیا کی کوئی سیاسی
اجتماعی یا تمدنی تحریک ایسی نہیں جس کے ساتھ کچھ نہ کچھ مسلمان شریک نہ ہوں اور
لطف یہ ہے کہ یہ سب اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ سمجھتے ہیں اور سمجھے جاتے ہیں۔

ان مختلف راہوں پر بھٹکنے اور دوڑنے والوں میں سے کسی ایک کو بھی یہ یاد نہیں آتا کہ
"مسلمان" کوئی پیدائشی لقب نہیں ہے بلکہ اسلام کی راہ پر چلنے والے کا اسم صفت
ہے جو شخص اسلام کی راہ سے ہٹ کر کسی دوسری راہ پر چلے اس کو مسلمان کہنا
اس لفظ کا بالکل غلط استعمال ہے۔ مسلم نیشنلسٹ اور مسلم کمیونسٹ اور
اسی قسم کی دوسری اصطلاحیں بالکل اسی طرح متناقض اصطلاحیں ہیں جس طرح
"کمیونسٹ مہاجن" اور "جینی قصائی" کی اصطلاحیں متناقض ہیں۔"

تفہیمات اول ۱۱۵

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

(مرد مسلمان)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد میں یہی
چیز مسلمانوں کو حاصل تھی پھر اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا، تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں۔
اس زمانہ میں جس نے لا الہ الا اللہ کہا اس کی کایا پلٹ گئی۔ مسِ خام سے یکایک وہ
کندن بن گیا۔ اس کی ذات میں وہ کشش پیدا ہوئی کہ دل اس کی طرف کھنچنے لگے۔
اس پر جس کی نظر پڑتی وہ محسوس کرتا کہ گویا تقویٰ اور پاکیزگی اور صداقت کو مجسم دیکھ
رہا ہے۔ وہ اَن پڑھ، مفلس، فاقہ کش، پشمینہ پوش اور بوریا نشین ہوتا، مگر پھر
بھی اس کی ہیبت دلوں میں ایسی بیٹھتی کہ بڑے بڑے شان و شوکت والے فرماں رواؤں
کو نصیب نہ تھی۔ ایک مسلمان کا وجود گویا ایک چراغ تھا کہ جدھر وہ جاتا اس کی روشنی
اطراف و اکناف میں پھیل جاتی اور اس چراغ سے سینکڑوں ہزاروں چراغ روشن
ہو جاتے۔ پھر جو اس روشنی کو قبول نہ کرتا اور اس سے ٹکرانے کی جرأت کرتا تو اس کو
جلانے اور فنا کر دینے کی قوت بھی اس میں موجود تھی۔

ایسی ہی قوت ایمانی اور طاقت و سیرت رکھنے والے مسلمان تھے کہ جب وہ
ساڑھے تین سو سے زیادہ نہ تھے تو انھوں نے تمام عرب کو مقابلہ کا چیلنج دے دیا اور جب
وہ چند لاکھ کی تعداد کو پہنچے تو ساری دنیا کو مسخر کر لینے کے عزم سے اٹھ کھڑے ہوئے اور

جو قوت ان کے مقابلہ پر آئی پاش پاش ہوگئی۔

تنقیہات ۲۶۰ - ۲۶۱

چہ کافرانہ قمارِ حیات می بازی
کہ بہ زمانہ بسازی بخود نمی سازی

(ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض)

قرآن تمہارے سامنے ہے انبیا علیہم السلام کی سیرتیں تمہارے سامنے ہیں۔ ابتدا سے لے کر آج تک کے علمبرداران اسلام کی زندگیاں تمہارے سامنے ہیں کیا ان سب سے تم کو یہی تعلیم ملتی ہے کہ ہوا جدھر اڑا لے اڑ جاؤ؟ پانی جدھر بہائے ادھر بہہ جاؤ؟ زمانہ جو رنگ اختیار کرے اس رنگ میں رنگ جاؤ؟ اگر مدعا یہی ہوتا تو کسی کتاب کے نزول اور کسی نبی کے بعثت کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ہوا کی موجیں تمہاری ہدایت کے لیے اور حیات دنیا کا بہاؤ تمہاری رہنمائی کے لیے اور زمانہ کی نیرنگیاں تمہیں گرگٹ کی روش سکھانے کے لیے کافی تھیں۔ خدا نے کوئی کتاب ایسی ناپاک تعلیم دینے کے لیے نہیں بھیجی اور نہ اس غرض کے لیے کوئی نبی مبعوث کیا۔ اس ذات حق کی طرف سے تو جو پیغام بھی آیا ہے اس لیے آیا ہے کہ دنیا جن غلط راستوں پر چل رہی ہے ان سب کو چھوڑ کر ایک سیدھا راستہ مقرر کرے، اس کے خلاف جتنے راستے ہوں ان کو مٹائے اور دنیا کو ان سے مٹانے کی کوشش کرے۔ ایمانداروں کی ایک جماعت بنائے جو نہ صرف اس سیدھے راستہ پر چلیں بلکہ دنیا کو بھی اس کی طرف کھینچ لانے کی کوشش کریں۔ انبیاءؑ اور ان کے متبعین نے ہمیشہ اسی غرض کے لیے جہاد کیا ہے۔ اس جہاد میں اذیتیں اٹھائی ہیں۔ نقصان برداشت کیے ہیں اور جانیں دی ہیں۔ ان میں سے کسی نے مصائب کے خوف یا منافع کے لالچ سے رفتار زمانہ کو کبھی اپنا مقتدا نہیں بنایا۔ اب اگر کوئی شخص یا کوئی گروہ ہدایت آسمانی کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے میں نقصان اور مشکلات اور خطرات دیکھتا ہے اور ان سے خوف زدہ ہو کر کسی ایسے راستے پر جانا چاہتا ہے جس پر چلنے والے اس کو خوش حال کامیاب اور سر بلند نظر آتے ہیں تو وہ شوق سے اپنے پسندیدہ راستہ پر جائے۔ مگر وہ بزدل اور حریص انسان اپنے نفس کو اور دنیا کو دھوکا دینے کی

کوشش کیوں کرتا ہے کہ وہ خدا کی کتاب اور اس کے نبی کے بتائے ہوئے طریقہ کو چھوڑ کر بھی اس کا پیرو ہے؟ نافرمانی خود ایک بڑا جرم ہے۔ اس پر جھوٹ اور فریب اور منافقت کا اضافہ کر کے آخر کیا فائدہ اٹھانا مقصود ہے؟

تنقیہات ۲۷۰ - ۲۷۱

حریف اپنا سمجھ رہے ہیں مجھے خدایان خانقاہی
انھیں یہ ڈر ہے کہ میرے نالوں سے شق نہ ہو سنگ آستانہ

یہ سارے فتوے اور مضامین اب اس لیے برسنے شروع ہوئے ہیں کہ جماعت اسلامی کی بڑھتی ہوئی تحریک سے اپنے حلقۂ اثر کے آدمیوں کے ٹوٹنے کا اندیشہ ان بزرگوں کو لاحق ہو گیا ہے اور ساری فکر انھیں اب ٹوٹنے والوں کو روکنے کی ہے۔ وہی فکر جس نے اشتراکیوں، مسلم لیگیوں، بریلیوں، قادیانیوں، اہل حدیث اور منکرین حدیث کو ہماری مخالفت میں متحرک کر رکھا ہے۔ تو گستاخی معاف، یہ انداز فکر اہل حق کو زیب نہیں دیتا۔ اور نہ یہ ہتھکنڈے ان کے شایان شان ہیں۔ یہ تو دکانداروں کے سوچنے کا انداز ہے کہ مقابل کی دکان ان کے گاہکوں اور اسامیوں کو توڑنے نہ پائے۔ بلکہ شاید کوئی شریف دکاندار بھی، اگر تھوڑی سی خدا ترسی اس میں ہو، اس حد تک گرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا کہ محض گاہک بچانے کے لیے حریف دکاندار کے مال میں کیڑے ڈالنے لگے۔ بہر حال اپنی پوزیشن مشخص کرنا ان حضرات کا کام ہے رہے ہم، تو الحمد للہ کہ ہم دکاندار نہیں ہیں نہ کسی کے حریف تجارت ہیں جس چیز کو ہم نے کتاب اللہ و سنّتِ رسول اللہ سے حق پایا ہے اُسے خلق اللہ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ جسے حق معلوم ہو قبول کرے، اس کا اپنا بھلا ہے۔ جسے حق نہ معلوم ہو رد کر دے، اس کا معاملہ اس کے خدا سے ہے۔ ساری دنیا اُسے قبول کرلے تو بجز آخرت کی منفعت کے ہمیں کوئی اجر اس سے مطلوب نہیں اور اگر ساری دنیا اُسے رد کر دے تو ہمارا اس سے کوئی نقصان نہیں۔

رسائل مسائل دوم ۵۷۵ - ۵۷۶

حدیث بے خبراں ہے تو بازمانہ بساز !
زمانہ باتو نسازد، تو بازمانہ ستیز !

ہمارے روشن خیال اور "تجدد پسند" حضرات جب کسی مسئلہ پر گفتگو فرماتے ہیں تو ان کی آخری حجت، جو ان کے نزدیک سب سے قوی حجت ہے، یہ ہوتی ہے کہ زمانے کا رنگ یہی ہے، ہوا کا رخ اسی طرف ہے، دنیا میں ایسا ہی ہو رہا ہے۔ پھر ہم اس کی مخالفت کیسے کر سکتے ہیں اور مخالفت کر کے زندہ کیسے رہ سکتے ہیں! اخلاق کا سوال ہو۔ وہ کہیں گے کہ دنیا کا معیار اخلاق بدل چکا ہے۔ مطلب یہ نکلا کہ مسلمان اس پرانے معیار اخلاق پر کیسے قائم رہیں؟ پردے پر بحث ہو، ارشاد ہوگا کہ دنیا سے پردہ اٹھ چکا ہے۔ مراد یہ ہوئی کہ جو چیز دنیا سے اٹھ چکی ہے اس کو مسلمان کیسے نہ اٹھائیں! تعلیم پر گفتگو ہو۔ ان کی آخری دلیل یہ ہوگی کہ دنیا میں اسلامی تعلیم کی مانگ ہی نہیں، مدعا یہ کھلا کہ مسلمان بچے وہ جنس بن کر کیسے نکلیں جس کی مانگ نہیں ہے اور وہ مال کیوں نہ بنیں جس کی مانگ ہے! سود پر تقریر ہو۔ ٹیپ کا بند یہ ہوگا کہ اب دنیا کا کام اس کے بغیر نہیں چل سکتا گویا مسلمان کسی ایسی چیز سے احتراز کیسے کر سکتے ہیں جو اب دنیا کا کام چلانے کے لیے ضروری ہوگئی ہے۔ غرض یہ کہ تمدن، معاشرت، اخلاق، تعلیم معیشت، قانون، سیاست اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں سے جس شعبے میں بھی وہ اصول اسلام سے ہٹ کر فرنگیت کا اتباع کرنا چاہتے ہیں، اس کے لیے زمانہ کا رنگ اور ہوا کا رخ اور دنیا کی رفتار وہ آخری حجت ہوتی ہے جو اس تقلید مغربی یا در حقیقت اس جزوی ارتداد کے جواز پر برہان قاطع سمجھ کر پیش کی جاتی ہے، اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عمارت اسلامی کے اجزا میں سے ہر اس جز کو ساقط کر دینا فرض ہے جس پر اس دلیل سے حملہ کیا جائے۔

ہم کہتے ہیں کہ شکست و ریخت کی یہ تجویزیں جن کو متفرق طور پر پیش کرتے ہو ان کو ملا کر ایک جامع تجویز کیوں نہیں بنا لیتے؟ مکان کی ایک ایک دیوار اور ایک ایک کمرے اور ایک ایک دالان کو گرانے کی علاحدہ علاحدہ تجویزیں پیش کرنے اور ہر ایک پر فرداً فرداً بحث کرنے میں فضول وقت ضائع ہوتا ہے کیوں نہیں کہتے کہ یہ

پورا مکان گرا دینے کی ضرورت ہے کیوں کہ اس کا رنگ زمانے کے رنگ سے مختلف ہے، اس کا رُخ ہوا کے رُخ سے پھرا ہوا ہے اور اس کی وضع ان مکانوں سے کسی طرح نہیں ملتی جو اب دنیا میں بن رہے ہیں۔

جن لوگوں کے حقیقی خیالات یہی ہیں ان سے بحث کرنا فضول ہے۔ ان کے لیے تو صاف اور سیدھا جواب یہی ہے کہ اس مکان کو گرانے اور اس کی جگہ دوسرا مکان بنانے کی زحمت آپ کیوں اٹھاتے ہیں؟ جو دوسرا خوش وضع، خوشنما، خوش رنگ مکان آپ کو پسند آئے اس میں تشریف لے جائیے۔ اگر دریا کے دھارے میں بہنے کا شوق ہے تو اس کشتی کا لیبل کھرچنے کی تکلیف بھی کیوں اٹھائیے؟ جو کشتیاں پہلے سے بہہ رہی ہیں انھی میں سے کسی میں نقل مقام فرما لیجیے۔ جو لوگ اپنے خیالات، اپنے اخلاق، اپنی معاشرت، اپنی معیشت، اپنی تعلیم، غرض اپنی کسی چیز میں بھی مسلمان نہیں ہیں اور مسلمان رہنا نہیں چاہتے۔ ان کے برائے نام مسلمان رہنے سے اسلام کا قطعاً کوئی فائدہ نہیں بلکہ سراسر نقصان ہے۔ وہ خدا پرست نہیں، ہوا پرست ہیں۔ اگر دنیا میں بت پرستی کا غلبہ ہو جائے تو یقیناً وہ بتوں کو پوجیں گے۔ اگر دنیا میں برہنگی کا رواج عام ہو جائے تو یقیناً وہ اپنے کپڑے اتار پھینکیں گے۔ اگر دنیا نجاستیں کھانے لگے تو یقیناً وہ کہیں گے کہ نجاست ہی پاکیزگی ہے اور پاکیزگی تو سراسر نجاست ہے۔ ان کے دل و دماغ غلام ہیں اور غلامی ہی کے لیے گڑھے گئے ہیں۔ آج فرنگیت کا غلبہ ہے، اس لیے اپنے باطن سے لے کر ظاہر کے ایک ایک گوشے تک وہ فرنگی بننا چاہتے ہیں۔ کل اگر حبشیوں کا غلبہ ہو جائے تو یقیناً وہ حبشی بنیں گے۔ اپنے چہروں پر سیاہیاں پھیریں گے، اپنے ہونٹ موٹے کریں گے، اپنے بالوں میں حبشیوں کے سے گھونگھر پیدا کریں گے۔ ہر اس شے کی پوجا کرنے لگیں گے جو حبش سے ان کو پہنچے گی۔ ایسے غلاموں کی اسلام کو قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ بخدا اگر کروڑں کی مردم شماری میں سے ان سب منافقوں اور غلام فطرت لوگوں کے نام کٹ جائیں اور دنیا میں صرف چند ہزار وہ مسلمان رہ جائیں جن کی تعریف یہ ہو کہ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ (وہ اللہ کے محبوب ہوں اور اللہ ان کا محبوب ہو۔ مسلمانوں کے لیے نرم اور کافروں پر سخت ہوں، اللہ

حدیث بے خبراں ہے تو بازمانہ بساز !
زمانہ باتو نسازد، تو بازمانہ ستیز !

ہمارے روشن خیال اور" تجدد پسند" حضرات جب کسی مسئلہ پر گفتگو فرماتے ہیں تو ان کی آخری حجت، جو ان کے نزدیک سب سے قوی حجت ہے، یہ ہوتی ہے کہ زمانے کا رنگ یہی ہے، ہوا کا رخ اسی طرف ہے، دنیا میں ایسا ہی ہو رہا ہے۔ پھر ہم اس کی مخالفت کیسے کر سکتے ہیں اور مخالفت کر کے زندہ کیسے رہ سکتے ہیں! اخلاق کا سوال ہو۔ وہ کہیں گے کہ دنیا کا معیار اخلاق بدل چکا ہے۔ مطلب یہ نکلا کہ مسلمان اس پرانے معیار اخلاق پر کیسے قائم رہیں؟ پردے پر بحث ہو، ارشاد ہوگا کہ دنیا سے پردہ اٹھ چکا ہے۔ مراد یہ ہوئی کہ جو چیز دنیا سے اٹھ چکی ہے اس کو مسلمان کیسے نہ اٹھائیں! تعلیم پر گفتگو ہو۔ ان کی آخری دلیل یہ ہوگی کہ دنیا میں اسلامی تعلیم کی مانگ ہی نہیں، مدعا یہ کھلا کہ مسلمان بچے وہ جنس بن کر کیسے نکلیں جس کی مانگ نہیں ہے اور وہ مال کیوں نہ بنیں جس کی مانگ ہے! سود پر تقریر ہو۔ ٹیپ کا بند یہ ہوگا کہ اب دنیا کا کام اس کے بغیر نہیں چل سکتا گویا مسلمان کسی ایسی چیز سے احتراز کیسے کر سکتے ہیں جو اب دنیا کا کام چلانے کے لیے ضروری ہو گئی ہے۔ غرض یہ کہ تمدن، معاشرت، اخلاق، تعلیم معیشت، قانون، سیاست اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں سے جس شعبے میں بھی وہ اصول اسلام سے ہٹ کر فرنگیت کا اتباع کرنا چاہتے ہیں، اس کے لیے زمانہ کا رنگ اور ہوا کا رخ اور دنیا کی رفتار وہ آخری حجت ہوتی ہے جو اس تقلید مغربی یا در حقیقت اس جزوی ارتداد کے جواز پر برہان قاطع سمجھ کر پیش کی جاتی ہے، اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عمارت اسلامی کے اجزا میں سے ہر اس جز کو ساقط کر دینا فرض ہے جس پر اس دلیل سے حملہ کیا جائے۔

ہم کہتے ہیں کہ شکست و ریخت کی یہ تجویزیں جن کو متفرق طور پر پیش کرتے ہو ان کو ملا کر ایک جامع تجویز کیوں نہیں بنا لیتے؟ مکان کی ایک ایک دیوار اور ایک ایک کمرے اور ایک ایک دالان کو گرانے کی علاحدہ علاحدہ تجویزیں پیش کرنے اور ہر ایک پر فرداً فرداً بحث کرنے میں فضول وقت ضائع ہوتا ہے کیوں نہیں کہتے کہ یہ

پورا مکان گرا دینے کی ضرورت ہے کیوں کہ اس کا رنگ زمانے کے رنگ سے مختلف ہے، اس کا رُخ ہوا کے رُخ سے پھرا ہوا ہے اور اس کی وضع ان مکانوں سے کسی طرح نہیں ملتی جو اب دنیا میں بن رہے ہیں۔

جن لوگوں کے حقیقی خیالات یہی ہیں ان سے بحث کرنا فضول ہے۔ ان کے لیے تو صاف اور سیدھا جواب یہی ہے کہ اس مکان کو گرانے اور اس کی جگہ دوسرا مکان بنانے کی زحمت آپ کیوں اٹھاتے ہیں؟ جو دوسرا خوش وضع، خوشنما، خوش رنگ مکان آپ کو پسند آئے اس میں تشریف لے جائیے۔ اگر دریا کے دھارے میں بہنے کا شوق ہے تو اس کشتی کا لیبل کھرچنے کی تکلیف بھی کیوں اٹھائیے؟ جو کشتیاں پہلے سے بہہ رہی ہیں انھی میں سے کسی میں نقل مقام فرما لیجیے۔ جو لوگ اپنے خیالات، اپنے اخلاق، اپنی معاشرت، اپنی معیشت، اپنی تعلیم، غرض اپنی کسی چیز میں بھی مسلمان نہیں ہیں اور مسلمان رہنا نہیں چاہتے۔ ان کے برائے نام مسلمان رہنے سے اسلام کا قطعاً کوئی فائدہ نہیں بلکہ سراسر نقصان ہے۔ وہ خدا پرست نہیں، ہوا پرست ہیں۔ اگر دنیا میں بت پرستی کا غلبہ ہو جائے تو یقیناً وہ بتوں کو پوجیں گے۔ اگر دنیا میں برہنگی کا رواج عام ہو جائے تو یقیناً وہ اپنے کپڑے اتار پھینکیں گے۔ اگر دنیا نجاستیں کھانے لگے تو یقیناً وہ کہیں گے کہ نجاست ہی پاکیزگی ہے اور پاکیزگی تو سراسر نجاست ہے۔ ان کے دل و دماغ غلام ہیں اور غلامی ہی کے لیے گڑھے گئے ہیں۔ آج فرنگیت کا غلبہ ہے، اس لیے اپنے باطن سے لے کر ظاہر کے ایک ایک گوشے تک وہ فرنگی بننا چاہتے ہیں۔ کل اگر حبشیوں کا غلبہ ہو جائے تو یقیناً وہ حبشی بنیں گے۔ اپنے چہروں پر سیاہیاں پھیریں گے، اپنے ہونٹ موٹے کریں گے، اپنے بالوں میں حبشیوں کے سے گھونگھر پیدا کریں گے۔ ہر اس شے کی پوجا کرنے لگیں گے جو حبش سے ان کو پہنچے گی۔ ایسے غلاموں کی اسلام کو قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ بخدا اگر کروڑوں کی مردم شماری میں سے ان سب منافقوں اور غلام فطرت لوگوں کے نام کٹ جائیں اور دنیا میں صرف چند ہزار وہ مسلمان رہ جائیں جن کی تعریف یہ ہو کہ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ (وہ اللہ کے محبوب ہوں اور اللہ ان کا محبوب ہو۔ مسلمانوں کے لیے نرم اور کافروں پر سخت ہوں، اللہ

کی راہ میں جہاد کرنے والے ہوں اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا انھیں خوف نہ ہو) تو اسلام اب سے بدرجہا طاقت ور ہوگا اور ان کمزوروں کا نکل جانا اس کے حق میں ایسا ہوگا جیسے کسی مریض کے جسم سے پیپ اور کچ لہو نکل جائے نَخْشٰۤى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ہم کو خوف ہے کہ ہم پر مصیبت آجائے گی۔

یہ کوئی نئی آواز نہیں ہے۔ بہت پرانی آواز ہے جو منافقوں کی زبان سے بلند ہوتی رہی ہے۔ یہی آواز نفاق کی بیماری کا پتہ دیتی ہے جو دلوں میں چھپی ہوئی ہے۔ اسی آواز کو بلند کرنے والے ہمیشہ مخالفین اسلام کے کیمپ کی طرف لپکتے رہے۔ ہمیشہ سے انھوں نے اللہ کی قائم کی ہوئی حدوں کو پاؤں کی بیڑیاں اور گلے کا طوق ہی سمجھا ہے۔ ہمیشہ سے ان کو احکام خدا و رسول کا اتباع گراں ہی گزرتا رہا ہے۔ اطاعت میں جان و مال کے زیاں اور نافرمانی میں حیات دنیا کی ساری کامرانیاں ہمیشہ سے ان کو نظر آتی رہی ہیں۔ پس ان کی خاطر خدا کی شریعت کو نہ ابتدا میں بدلا گیا تھا، نہ اب بدلا جا سکتا ہے اور نہ کبھی بدلا جائے گا۔ یہ شریعت بزدلوں اور نامردوں کے لیے نہیں اتری ہے۔ نفس کے بندوں اور دنیا کے غلاموں کے لیے نہیں اتری ہے۔ ہوا کے رخ پر اڑنے والے خس و خاشاک، اور پانی کے بہاؤ پر بہنے والے حشرات الارض اور ہر رنگ میں رنگ جانے والے بے رنگوں کے لیے نہیں اتری ہے۔ یہ ان بہادر شیروں کے لیے اتری ہے جو ہوا کا رخ بدل دینے کا عزم رکھتے ہو، جو دریا کی روانی سے لڑنے اور اس کے بہاؤ کو پھیر دینے کی ہمّت رکھتے ہوں، جو صبغۃ اللہ کو دنیا کے ہر رنگ سے زیادہ محبوب رکھتے ہوں اور اس رنگ میں تمام دنیا کو رنگ دینے کا حوصلہ رکھتے ہوں مسلمان جس کا نام ہے وہ دریا کے بہاؤ پر بہنے کے لیے پیدا ہی نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی آفرینش کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ زندگی کے دریا کو اس راستہ پر رواں کر دے جو اس کے ایمان و اعتقاد میں راہ راست ہے، صراطِ مستقیم ہے۔ اگر دنیا نے رُخ اس راستہ سے پھیر دیا ہے تو اسلام کے دعوا میں وہ شخص جھوٹا ہے جو اس بدلے ہوئے رُخ پر بہنے کے لیے راضی ہوجائے۔ حقیقت میں جو سچّا مسلمان ہے وہ اس غلط رو دریا کی رفتار سے لڑے گا۔ اس کا رخ پھیرنے کی کوشش میں اپنی پوری قوت صرف کر دے گا، کامیابی اور ناکامی کی اس کو قطعاً پروا نہ ہو گی۔ وہ ہر اس نقصان کو گوارا کرے گا جو اس لڑائی میں پہنچے یا

پہنچ سکتا ہو۔ حتیٰ کہ اگر دریا کی روانی سے لڑتے لڑتے اس کے بازو ٹوٹ جائیں، اس کے جوڑ بند ڈھیلے ہو جائیں اور پانی کی موجیں اس کو نیم جاں کرکے کسی کنارے پر پھینک دیں، تب بھی اس کی روح ہرگز شکست نہ کھائے گی، ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے دل میں اپنی اس ظاہری نامرادی پر افسوس، یا دریا کی رو پر بہنے والے کافروں یا منافقوں کی کامرانیوں پر رشک کا جذبہ راہ نہ پائے گا۔

تنقیحات ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰

حلقہ صوفی میں ذکر بے نم و بے سوز و ساز
میں بھی رہا تشنہ کام تو بھی رہا تشنہ کام

درجۂ احسان کی اہمیت اور اس کے حاصل کرنے کی ضرورت سے انکار کا کیا موقع ہے۔ میرے نزدیک تو وہی اصل میں مطلوب ہے، اور میں اس سے بھی انکار نہیں کرتا کہ محسنین سے خدا کی زمین نہ پہلے خالی تھی نہ اب خالی ہے۔ یہ لوگ جہاں بھی ہیں، خدا کی رحمت کا ایک نشان ہیں اور ان کی صحبت، محبّت، رفاقت ہمارے لیے سرمایہ سعادت ہے۔ مگر طول بحث سے بچتے ہوئے میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ جہاں بالعموم ان لوگوں کے زیادہ پائے جانے کا گمان کیا جاتا ہے وہاں یہ سب سے کم پائے جاتے ہیں اور جن گوشوں کو "اہل فن" اتنا حقیر سمجھتے ہیں کہ احسان کی کوئی جھلک تک ان میں دیکھنے کی توقع نہیں رکھتے، وہیں یہ اکثر مل جاتے ہیں۔ اہل فن میں جن شخصیتوں کو مزکّی اور مربّی ہونے کی شہرت حاصل ہے ان میں بہتوں کے ساتھ مجھے کسی نہ کسی طور پر سابقہ پیش آیا ہے اور میں نے ان کے اندر وہ کمزوریاں پائی ہیں جو معمولی انسانوں کے لیے بھی موزوں نہیں ہیں کجا کہ ماہرین تزکیۂ نفس کے لیے اس کے برعکس غیر معروف لوگ جو دنیا کے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں اور جنھیں شاید کوئی مرتبہ بھی کسی اہل فن کے ہاں نہیں مل سکتا، ان کے اندر ایسے ایسے بندۂ حق ملے ہیں جو خوف خدا سے کانپنے والے اور اس کی رضا جوئی کے لیے ہر فائدے کو قربان اور ہر نقصان کو گوارا کرنے والے ہیں اور جنھیں قبول حق اور ادائے حق سے نہ کوئی نفسانیت باز رکھ سکتی ہے اور نہ کوئی عصبیت۔

رسائل مسائل دوم ۲۰۳، ۲۰۴

خموش اے دل! بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی آواز نبی کی آواز سے بلند نہ کرو اور نہ نبی کے ساتھ اونچی آواز سے بات کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو۔[۳] کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیا کرایا سب غارت ہو جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔[۴]

[۳] یہ وہ ادب ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھنے والوں اور آپ کی خدمت میں حاضر ہونے والوں کو سکھایا گیا تھا۔ اس کا منشا یہ تھا کہ حضورؐ کے ساتھ ملاقات اور بات چیت میں اہل ایمان آپ کا انتہائی احترام ملحوظ رکھیں۔ کسی شخص کی آواز آپ کی آواز سے بلند تر نہ ہو۔ آپ سے خطاب کرتے ہوئے لوگ یہ بھول نہ جائیں کہ وہ کسی عام آدمی یا اپنے برابر والے سے نہیں بلکہ اللہ کے رسول سے مخاطب ہیں۔ اس لیے عام آدمیوں کے ساتھ گفتگو اور آپ کے ساتھ گفتگو میں نمایاں فرق ہونا چاہیے اور کسی کو آپ سے اونچی آواز میں کلام نہ کرنا چاہیے۔

یہ ادب اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کے لیے سکھایا گیا تھا اور اس کے مخاطب وہ لوگ تھے جو حضورؐ کے زمانے میں موجود تھے، مگر بعد کے لوگوں کو بھی ایسے تمام مواقع پر یہی ادب ملحوظ رکھنا چاہیے جب آپ کا ذکر ہو رہا ہو یا آپ کا کوئی حکم سنایا جائے یا آپ کی احادیث بیان کی جائیں۔ اس کے علاوہ اس آیت سے یہ ایما بھی نکلتا ہے کہ لوگوں کو اپنے سے بزرگ تر اشخاص کے ساتھ گفتگو میں کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے۔ کسی شخص کا اپنے بزرگوں کے سامنے اس طرح بولنا جس طرح وہ اپنے دوستوں یا عام آدمیوں کے سامنے بولتا ہے۔ دراصل اس بات کی علامت ہے کہ اس کے دل میں ان کے لیے کوئی احترام موجود نہیں ہے اور وہ ان میں اور عام آدمیوں میں کوئی فرق نہیں سمجھتا۔

[۴] اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں ذات رسولؐ کی عظمت کا کیا مقام ہے۔ رسول پاک کے سوا کوئی شخص، خواہ بجائے خود وہ کتنا ہی قابل احترام ہو، بہرحال یہ حیثیت نہیں رکھتا کہ اس کے ساتھ بے ادبی خدا کے ہاں اس سزا کی مستحق ہو جو حقیقت میں کفر کی سزا ہے وہ زیادہ سے زیادہ ایک بدتمیزی ہے، خلاف تہذیب حرکت ہے

مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام میں ذرا سی کمی بھی اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس سے آدمی کی عمر بھر کی کمائی غارت ہو سکتی ہے۔ اس لیے آپ کا احترام دراصل اُس خدا کا احترام ہے جس نے آپ کو اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے اور آپ کے احترام میں کمی کے معنی خدا کے احترام میں کمی کے ہیں۔

تفہیم القرآن ۵ ۷۱، ۷۲

خاکی و نوری نہاد بندہ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

(مسجد قرطبہ)

نائب کا اصلی کمال یہ ہے کہ وہ اپنے آقا کی املاک ہیں اس کی جانشینی کا حق ادا کرنے کی کوشش کرے اور جہاں تک ممکن ہو ان میں اسی شان سے تصرّف کرے جس شان کا تصرّف خود حقیقی مالک کرتا ہے۔ بادشاہ اگر اپنی رعیت پر کسی شخص کو اپنا نائب بنائے تو اس کے لیے اپنے منصب نیابت کے استعمال کا بہترین طریقہ یہ ہو گا کہ رعیت کی خبر گیری، شفقت، مہربانی، حفاظت، عمل اور حسب موقع سختی کرنے میں وہی سیرت اختیار کرے جو خود بادشاہ کی سیرت ہے اور بادشاہ کی املاک اور اس کے اموال میں ویسی ہی حکمت، تدبّر، دانائی اور احتیاط سے تصرّف کرے جس سے خود بادشاہ ان میں تصرّف کرتا ہے۔

بس جب انسان کو خدا کا خلیفہ اور نائب قرار دیا گیا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان خدا کی نیابت و خلافت کا پورا حق اسی وقت ادا کر سکتا ہے جب خدا کی مخلوق کے ساتھ برتاؤ کرنے میں اس کی روش بھی ویسی ہی ہو جیسی خود خدا کی روش ہے۔ یعنی جس شان ربوبیت کے ساتھ خدا اپنی مخلوق کی خبر گیری اور پرورش کرتا ہے ویسی ہی شان کے ساتھ انسان بھی اپنے محدود دائرۂ عمل میں ان چیزوں کی خبر گیری اور پرورش کرے جو اللہ نے اس کے قبضۂ قدرت میں دی ہیں اسی طرح جس شان رحمانی و رحیمی کے ساتھ خدا اپنی ملکیت میں تصرف کرتا ہے جس شان کے ساتھ خدا اپنی مخلوقات میں نظم کرتا ہے، جس شان رحم و کرم کے ساتھ خدا اپنی صفت قہر و جبر کا اظہار کرتا ہے، چھوٹے پیمانہ پر

اسی شان کے ساتھ انسان بھی خدا کی اس مخلوق کے ساتھ معاملہ کرے۔ جس پر اللہ نے اس کو حکومت بخشی ہے اور جسے اس کے لیے مسخر کیا ہے یہی مفہوم ہے جو تخلقوا باخلاق اللہ کے حکیمانہ جملہ میں ادا کیا گیا ہے۔ مگر یہ اعلا و اخلاقی مرتبہ صرف اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب انسان اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ وہ اس دنیا میں کوئی خود مختار فرماں روا نہیں ہے بلکہ اس کے حقیقی فرماں روا کا نائب ہے، اور یہی نیابت کا منصب ہے جو دنیا کی تمام اشیا حتیٰ کہ خود اپنے جسم اور جسمانی و نفسانی قوتوں کے ساتھ اس کے تعلق کی حیثیت اور حدود متعین کرتا ہے۔

اسلامی تہذیب اصول و مبادی ۳۳، ۳۴

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

(اجتہاد)

دین میں یہی وہ عظیم الشان ترمیم تھی جس کی بدولت بڑے بڑے متّقی اور دیندار حضرات تسبیحوں کو گردش دیتے ہوئے وکالت اور منصفی کے پیشوں میں داخل ہوئے تاکہ جس قانون پر ایمان نہیں رکھتے اس کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کریں اور کرائیں اور جس قانون پر ایمان رکھتے ہیں اس کی تلاوت صرف اپنے گھروں میں کرتے رہیں۔ اسی ترمیم کی بدولت بڑے بڑے صلحاء و اتقیاء کے بچے" نئی درسگاہوں میں داخل ہوئے اور وہاں سے بے دینی و مادّہ پرستی اور بداخلاقی کے سبق لے لے کے نکلے اور پھر اس نظام کفر کے صرف عملی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ اکثر حالات میں اخلاقی اور اعتقادی حیثیت سے بھی خدمت گزار بن گئے جو ان کے اسلاف کی غفلتوں اور کمزوریوں کی بدولت ان پر ابتداً محض اوپر سے مسلط ہوا تھا۔ پھر اسی ترمیم نے یہاں تک نوبت پہنچائی کہ مردوں سے گزر کر جاہلیت اور ضلالت اور بداخلاقی کا طوفان عورتوں تک پہنچا۔ وہی فرض کفایہ جسے ادا کرنے کے لیے پہلے مرد اٹھے تھے، عورتوں پر بھی عائد ہو گیا اور ان بے چاروں کو بھی آخر اسی" دینی خدمت" کی بجا آوری کے لیے نکلنا پڑا، نہ نکلتیں تو خطرہ تھا کہ کہیں غیر مسلم ان سے بازی نہ لیجائیں!

اور کہیں یہ گمان نہ کر لیجیے گا کہ دین میں یہ ترمیم آج کچھ نئی ہوئی ہے۔ درحقیقت اس کی بنا آج سے صدیوں پہلے پڑ چکی تھی جب کہ تاتار کے کفّار مسلمانوں پر مسلط ہوئے تھے۔

صرف یہی نہیں کہ "نظام کفر میں اسلامی زندگی" کا نقشہ پہلی مرتبہ اُسی دور کے علما نے مرتب کیا تھا۔ بلکہ اُسی زمانے میں بڑے بڑے علما صلحا نے خود نظامِ کفر کی خدمت گزاری اختیار فرمائی تھی اور ان میں بکثرت لوگ وہ تھے جن کی کتابیں پڑھ پڑھ کر آج ہمارے مدارس عربیہ میں علمائے دین و مفتیان شرعِ متین تیار ہوتے ہیں۔ اسی قدامت کی وجہ سے یہ غلطی اب ایک مقدس غلطی بن چکی ہے اور کوئی تعجب نہیں ہے اگر ہمارے زمانے کے فقیہہ اور محدّث اور مفسّر سب اس میں مبتلا نظر آتے ہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ غلط بات نہ اس دلیل سے صحیح ہو سکتی ہے کہ وہ پہلے سے ہوتی چلی آرہی ہے، اور نہ اس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ بڑے بڑے لوگ اس میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ حق کا اثبات اگر ہو سکتا ہے تو خدا کی کتاب اور رسولوں کی سنّت ہی سے ہو سکتا ہے۔

اس پورے انحطاط کے دوران میں، جو ابتدائی اضطرار کی بنا پر" اسلام زیر سایہ کفر" کے نظریہ سے شروع ہوا۔ پھر رفتہ رفتہ " نظام کفر کی خدمت جائز"، مستحب" فرض کفایہ" کے نظریہ تک پہنچا، اور بالآخر گرتے گرتے اس انتہائی ذلیل نقطۂ نظر کی پستیوں میں جا گرا کہ" مذہبی آزادی دینے والے حکمرانوں کی وفاداری عین مقتضائے دین ہے" مسلمانوں کی کوشش برابر یہی رہی کہ اپنے تنزّل کے ہر مرحلے میں نیچے اور زیادہ نیچے اترنے کے لیے دلیل بہرحال انھیں خدا کے دین ہی سے ملنی چاہیے، یہ مطالبہ بظاہر تو ان کے زعم میں اس فارمولے پر مبنی تھا کہ" خدا کا دین چونکہ ہماری تمام ضرورتوں کا ضامن ہے اس لیے جو ضرورتیں اب ہمیں پیش آرہی ہیں ان کو پورا کرنے کے لیے بھی اسی دین سے ہم کو رہنمائی ملنی چاہیے۔" لیکن دراصل اس ظاہری فارمولے کے باطن میں جو حقیقی فارمولا چھپا ہوا تھا اور جس پر فی الواقع یہ لوگ کام کر رہے تھے وہ یہ تھا کہ" جب ہم نے اس دین پر یہ احسان کیا ہے کہ اس کو اپنے ایمان سے سرفراز کیا تو اس کے بدلے میں کم سے کم جو فرض اس دین پر عائد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ ہمارے آگے چلنے کے بجائے ہمارے پیچھے چلنا شروع کر دے، یعنی اب ہمارا اور اس کا تعلق یہ نہ ہو کہ ہم اسے اپنے اوپر اور خدا کی زمین پر قائم کرنے کی سعی کریں اور اس سعی کے سلسلہ میں جو جو ضرورتیں ہم کو پیش آتی جائیں یہ انھیں پورا کرنے کی ضمانت لیتا جائے بلکہ تعلق کی صورت اب یہ ہونی چاہیے اس کی اقامت کا کام حتیٰ کہ اس کا خیال تک چھوڑ کر اپنے نفس کی پیروی میں جس جس وادی کی خاک چھانتے پھریں اس

میں یہ ہمارے ساتھ گردش کرتا رہے اور جن جن ادیان باطلہ کے ہم تابع فرمان بنتے جائیں ان ماتحت ساری غلامانہ حیثیتیں یہ بھی اختیار کرتا چلا جائے، اور اس کے منشا کے خلاف جو طرزِ زندگی ہم قبول کریں ان میں پیش آنے والی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کا یہ ضامن ہو۔"
چنانچہ اسی غلط نقطۂ نظر کو لیے ہوئے ان لوگوں نے قرآن و سنّت میں رہنمائی تلاش کرنی شروع کی اور حاصل یہ ہوا کہ پورے قرآن میں اگر کسی چیز پر جا کر ان کی نگاہ ٹھہری تو وہ نہ سورہ عنکبوت تھی، نہ بقرہ، نہ آل عمران، نہ انفال، نہ توبہ بلکہ سورۂ یوسف تھی اسی طرح پوری سیرت نبوی میں بھی اگر کوئی چیز ان کو قابل اتباع ملی تو وہ نہ مکّے کی تپتی ریت تھی نہ طائف کی سنگ باری، نہ بدر و احد کے میدان، بلکہ صرف یہ واقعہ کہ مسلمانوں کی ایک جماعت ہجرت کر کے حبش گئی تھی اور وہاں ایک عیسائی بادشاہ کے ماتحت چند سال رعایا بن کر رہی!

تفہیمات دوم ۱۱۲، ۱۱۳

خرد نے کہہ بھی دیا لَا اِلٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

(تصوّف)

مسلمان کی اصلی طاقت یہی ایمان اور سیرت صالحہ کی طاقت ہے جو صرف ایک لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کی حقیقت دل میں بیٹھ جانے سے حاصل ہوتی ہے لیکن اگر یہ حقیقت دل میں جاگزیں نہ ہو، محض زبان پر یہ الفاظ جاری ہوں مگر ذہنیّت اور عملی زندگی میں کوئی انقلاب برپا نہ ہو۔ لا الٰہ الا اللہ کہنے کے بعد بھی انسان وہی کا وہی رہے جو اس سے پہلے تھا، اور اس میں اور لا الٰہ الا اللہ کا انکار کرنے والوں میں اخلاقی و عملی حیثیت سے کوئی فرق نہ ہو۔ وہ بھی انہی کی طرح غیر اللہ کے آگے گردن جھکائے اور ہاتھ پھیلائے۔ انہی کی طرح غیر خدا سے ڈرے اور غیر خدا کی رضا چاہے اور غیر خدا کی محبت میں گرفتار ہو، انہی کی طرح ہوائے نفس کا بندہ ہو اور قانون الٰہی کو چھوڑ کر انسانی قوانین یا اپنے نفس کی خواہشات کا اتباع کرے، اس کے خیالات اور ارادوں اور نیتوں میں بھی وہی گندگی ہو جو ایک غیر مومن کے خیالات، ارادات اور نیّات میں ہو سکتی ہے اور اس کے اقوال و افعال و معاملات بھی ویسے

ہی ہوں جیسے ایک غیر مومن کے ہوتے ہیں تو پھر مسلمان کو نامسلمان پر فوقیت کس بنا پر ہو؟ ....

تنقیہات ۲۶۱، ۲۶۲

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں
زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا!

بس ان سے کہہ دو کہ میرے لیے اللہ ہی کافی ہے۔ بھروسہ کرنے والے اسی پر بھروسہ کرتے ہیں[۵۷]

[۵۷] ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے روایت نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص چاہتا ہو کہ سب انسانوں سے زیادہ طاقت ور ہو جائے اسے چاہیے کہ اللہ پر توکّل کرے اور جو شخص چاہتا ہو کہ سب سے بڑھ کر غنی ہو جائے اُسے چاہیے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے اس پر زیادہ بھروسہ رکھے بہ نسبت اس چیز کے جو اس کے اپنے ہاتھ میں ہے، اور جو شخص چاہتا ہو کہ سب سے زیادہ عزّت والا ہو جائے اُسے چاہیے کہ اللہ عزّ وجل سے ڈرے۔"

تفہیم القرآن ۴ ۳۷۴

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دہلی نہ صفاہان نہ سمرقند!

انسان جس جگہ پیدا ہوتا ہے اس کا رقبہ یقیناً ایک گز مربع سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اس رقبہ کو اگر وہ اپنا وطن قرار دے تو شاید وہ کسی کو اپنا وطن نہیں کہہ سکتا۔ لیکن وہ اس چھوٹے سے رقبہ کے گرد میلوں اور کوسوں اور بسا اوقات سینکڑوں اور ہزاروں میل تک ایک سرحدی خط کھینچ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہاں تک میرا وطن ہے اور اس کے باہر جو کچھ ہے اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ یہ محض اس کی نظر کی تنگی ہے ورنہ کوئی

پھر اُسے روئے زمین کو اپنا وطن کہنے سے مانع نہیں ہے۔ جس دلیل کی بنا پر ایک مربع گز کا وطن پھیل کر ہزاروں مربع گز بن سکتا ہے۔ اسی دلیل کی بنا پر وہ پھیل کر پورا کرۂ ارض بھی بن سکتا ہے۔ اگر آدمی اپنے زاویۂ نظر کو تنگ نہ کرے تو وہ دیکھ سکتا ہے کہ یہ دریا پہاڑ اور سمندر وغیرہ جن کو اس نے محض اپنے خیال میں حدود فاصل قرار دے کر ایک زمین اور دوسری زمین کے درمیان فرق کیا ہے سب کے سب ایک ہی زمین کے اجزا ہیں پھر کس بنا پر اس نے دریاؤں اور پہاڑوں اور سمندروں کو یہ حق دے دیا ہے کہ وہ اُسے ایک خاص خطّہ میں قید کر دیں؟ وہ کیوں نہیں کہتا کہ میں زمین کا باشندہ ہوں۔ سارا کرۂ زمین میرا وطن ہے۔ جتنے انسان ربع مسکون میں آباد ہیں، میرے ہم وطن ہیں، اس پورے سیارے پر میں وہی پیدائشی حقوق رکھتا ہوں جو اس گز بھر زمین پر مجھے حاصل ہیں جہاں میں پیدا ہوا ہوں؟

مسئلہ قومیت ۱۲، ۱۳

دنیا کو ہے اس مہدی برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالم افکار

(مہدی برحق)

تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک کوئی مجدّد کامل پیدا نہیں ہوا ہے۔ قریب تھا کہ عمر ابن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اس منصب پر فائز ہو جاتے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے، ان کے بعد جتنے مجدد پیدا ہوئے ان میں سے ہر ایک نے کسی خاص شعبے یا چند شعبوں ہی میں کام کیا۔ مجدّد کامل کا مقام ابھی تک خالی ہے۔ مگر عقل چاہتی ہے، فطرت مطالبہ کرتی ہے، اور دنیا کے حالات کی رفتار متقاضی ہے کہ ایسا "لیڈر" پیدا ہو، خواہ اس دور میں پیدا ہو یا زمانے کی ہزار گردشوں کے بعد پیدا ہو۔ اسی کا نام الامام المہدی ہو گا۔ جس کے بارے میں صاف پیشین گوئیاں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام میں موجود ہیں۔

صفحہ ۴۸

مجھے اس کے کام میں کرامات و خوارق، کشوف و الہامات اور چلّوں اور "مجاہدوں" کی کوئی جگہ نظر نہیں آتی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک "انقلابی لیڈر" کو دنیا میں جس طرح شدید

جدو جہد اور کشمکش کے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے ان ہی مرحلوں سے مہدی کو بھی گزرنا ہو گا۔ وہ خالص اسلام کی بنیادوں پر ایک نیا مذہب فکر School of thought پیدا کرے گا۔ ذہنیتوں کو بدلے گا۔ ایک زبردست تحریک اٹھائے گا جو بیک وقت تہذیبی بھی ہو گی اور سیاسی بھی۔ جاہلیت اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اس کو کچلنے کی کوشش کرے گی۔ مگر بالآخر وہ جاہلی اقتدار کو الٹ کر پھینک دے گا اور ایک ایسا زبردست اسلامی اسٹیٹ قائم کرے گا جس میں ایک طرف اسلام کی پوری روح کارفرما ہو گی اور دوسری طرف سائنٹیفک ترقی اوجِ کمال پر پہنچ جائے گی، جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہوا ہے:۔

"اس کی حکومت سے آسمان والے بھی راضی ہوں گے اور زمین والے بھی۔ آسمان دل کھول کر اپنی برکتوں کی بارش کرے گا اور زمین اپنے پیٹ کے سارے خزانے اگل دے گی۔"

تجدید و احیائے دین صفحہ ۵۳

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامان موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

کروڑوں مفلس و فاقہ کش مسلمانوں کی یہ بھیڑ اشتراکی مبلّغین کے لیے نہایت سہل الحصول شکار بن گئی ہے۔ بورژوا طبقہ کے جن لوگوں میں حوصلہ مندی اور اقتدار کی حرص ذرا اعتدال سے بڑھی ہوتی ہے وہ ہمیشہ طاقت حاصل کرنے کے لیے نئی نئی تدبیریں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اب روسی انقلاب نے اس طبقہ کے ایک گروہ کو ایک اور تدبیر سکھا دی ہے اور وہ یہ ہے کہ کسان اور مزدور کے حامی بن کر غریب عوام کو اپنے ہاتھ میں لیں۔ ان کے اندر خود غرضی اور حسد کی آگ بھڑکائیں، ان کے جائز حقوق سے بڑھ کر انھیں دولت میں حصّہ دلوانے کا لالچ دلائیں۔ خوشحال طبقوں کی جائز دولت چھین کر ان میں تقسیم کر دینے کا وعدہ کریں اور اس طرح ملک کے سواد اعظم کو اپنی مٹھی میں لے کر وہ اقتدار حاصل کریں جو سرمایہ داری نظام کے بادشاہوں، ڈکٹیٹروں اور کروڑ پتیوں کو حاصل ہے۔ یہ لوگ

غیرمسلم عوام سے بڑھ مسلم عوام سے توقعات رکھتے ہیں کیونکہ معاشی حیثیت سے مسلمان زیادہ خستہ حال ہیں۔ یہ ان کے دلوں پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے پیٹ کی طرف سے راستہ پیدا کر رہے ہیں جو بھوکے آدمی کے جسم کا سب سے زیادہ نازک حصّہ ہوتا ہے۔ یہ ان سے کہتے ہیں کہ آؤ ہم وہ طریقہ بتائیں جس سے امیری اور عزت ملتی ہے اور آسودہ حالی آتی ہے۔ پھر جب بیچارہ بھوکا مسلمان دو روٹیوں کی امید پر ان کی طرف دوڑتا ہے تو یہ اُسے خدا پرستی کے بجائے شکم پرستی کے مذہب کی تلقین کرتے ہیں اور یہ جذبہ اس کے دل میں پیدا کرتے ہیں کہ دین اور ایمان کوئی چیز نہیں، اصل چیز روٹی ہے، وہ جس طریقے سے ملے وہی دین ہے اور اسی میں نجات ہے۔

تنقیحات ۳۱۰، ۳۱۱

رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا
اتر گیا جو ترے دل میں لاشریک لہ

(محراب گل افغان کے افکار)

انسانی زندگی پر عقیدۂ توحید کا اثر

اب ہم تمہیں بتائیں گے کہ لا الٰہ الا اللہ کے اقرار سے انسان کی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے اور اس کو نہ ماننے والا دنیا و آخرت میں کیوں نامراد ہوجاتا ہے۔

۱۔ اس کلمہ پر ایمان رکھنے والا کبھی تنگ نظر نہیں ہوسکتا۔ وہ ایسے خدا کا قائل ہوتا ہے جو زمین و آسمان کا خالق، مشرق و مغرب کا مالک اور تمام جہان کا پالنے پوسنے والا ہے۔ اس ایمان کے بعد ساری کائنات میں کوئی چیز بھی اس کو غیر نظر نہیں آتی۔ وہ سب کو اپنی ذات کی طرح ایک ہی مالک کی ملکیت اور ایک بادشاہ کی رعیت سمجھتا ہے۔ اس کی ہمدردی و محبت و خدمت کسی دائرے کی پابند نہیں ہوتی۔ اس کی نظر ویسی ہی غیر محدود ہوجاتی ہے جیسی خود اللہ تعالیٰ کی بادشاہی غیر محدود ہے۔ یہ بات کسی ایسے شخص کو حاصل نہیں ہوسکتی جو بہت سے چھوٹے چھوٹے خداؤں کا قائل ہو، یا خدا میں انسان کی محدود اور ناقص صفات مانتا ہو یا سرے سے خدا کا قائل ہی نہ ہو۔

۲۔ یہ کلمہ انسان میں انتہا درجہ کی خودداری اور عزت نفس پیدا کر دیتا ہے۔ اس

پر اعتقاد رکھنے والا جانتا ہے کہ صرف ایک خدا تمام طاقتوں کا مالک ہے۔ اس کے سوا کوئی نفع پہنچانے والا نہیں، کوئی مارنے والا اور کوئی جلانے والا نہیں۔ کوئی صاحب اختیار اور با اثر نہیں۔ یہ علم اور یقین اس کو خدا کے سوا تمام قوتوں سے بے نیاز اور بے خوف کر دیتا ہے، اس کی گردن کسی مخلوق کے آگے نہیں جھکتی، اس کا ہاتھ کسی کے آگے نہیں پھیلتا، اس کے دل میں کسی کی بزرگی کا سکّہ نہیں بیٹھتا۔ یہ صفت سوائے عقیدۂ توحید کے اور کسی عقیدہ سے پیدا نہیں ہوسکتی۔ شرک اور کفر اور دہریت کی لازمی خاصیت یہ ہے کہ انسان مخلوقات کے آگے جھکے، ان کو نفع اور نقصان کا مالک سمجھے، ان سے خوف کھائے اور ان ہی سے امیدیں وابستہ رکھے۔

۳۔ خودداری کے ساتھ یہ کلمہ انسان میں انکساری بھی پیدا کرتا ہے۔ اس کا قائل کبھی مغرور اور متکبر نہیں ہوسکتا، اپنی قوت اور دولت اور قابلیت کا گھمنڈ اس کے دل میں سما ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کے پاس جو کچھ ہے خدا ہی کا دیا ہوا ہے۔ اور خدا جس طرح دینے پر قادر ہے اسی طرح چھین لینے پر قادر ہے۔ اس کے مقابلہ میں عقیدۂ الحاد کے ساتھ جب انسان کو کسی قسم کا دنیوی کمال حاصل ہوتا ہے تو وہ متکبر ہوجاتا ہے، کیونکہ وہ اپنے کمال کو محض اپنی قابلیت کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ اسی طرح شرک اور کفر کے ساتھ بھی غرور پیدا ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ مشرک اور کافر اپنے خیال میں یہ سمجھتا ہے کہ خداؤں اور دیوتاؤں سے اس کا کوئی خاص تعلق ہے جو دوسروں کو نصیب نہیں۔

۴۔ اس کلمہ پر اعتقاد رکھنے والا اچھی طرح سمجھتا ہے کہ نفس کی پاکیزگی اور ایک نیک عمل کے سوا اس کے لیے نجات اور فلاح کا کوئی ذریعہ نہیں کیونکہ وہ ایک ایسے خدا پر اعتقاد رکھتا ہے جو بے نیاز ہے، کسی سے کوئی رشتہ نہیں رکھتا۔ بے لاگ عمل کرنے والا ہے اور کسی کو اس کی خدائی میں دخل یا اثر حاصل نہیں۔ اس کے مقابلہ میں مشرکین اور کفار ہمیشہ جھوٹی توقعات پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان میں کوئی سمجھتا ہے کہ خدا کا بیٹا ہی ہمارے لیے کفارہ بن گیا ہے۔ کوئی خیال کرتا ہے کہ ہم خدا کے چہیتے ہیں اور ہمیں سزا مل ہی نہیں سکتی۔ کسی کا گمان یہ ہے کہ ہم اپنے بزرگوں سے خدا کے ہاں سفارش کرالیں گے۔ کوئی اپنے دیوتاؤں کو نذر و نیاز دے کر سمجھ لیتا ہے کہ اب اُسے دُنیا میں سب کچھ کرنے کا

لائسنس مل گیا ہے اس قسم کے چھوٹے اعتقادات ان لوگوں کو ہمیشہ گناہوں اور بدکاریوں کے چکّر میں پھنسائے رکھتے ہیں اور وہ ان کے بھروسے پر نفس کی پاکیزگی اور عمل کی نیکی سے غافل ہو جاتے ہیں۔ رہے دہریے، تو وہ سرے سے یہ اعتقاد ہی نہیں رکھتے کہ کوئی بالاتر ہستی ان سے بھلے اور برے کاموں کی باز پرس کرنے والی بھی ہے۔ اس لیے وہ دنیا میں اپنے آپ کو آزاد سمجھتے ہیں۔ ان کے نفس کی خواہش ان کی خدا ہوتی ہے۔ اور وہ اس کے بندے ہوتے ہیں۔

۵۔ اس کلمہ کا قائل کسی حال میں مایوس اور دل شکستہ نہیں ہوتا۔ وہ ایک ایسے خدا پر ایمان رکھتا ہے جو زمین و آسمان کے سارے خزانوں کا مالک ہے، جس کا فضل و کرم بے حد و حساب ہے اور جس کی قوتیں بے پایاں ہیں۔ یہ ایمان اس کے دل کو غیر معمولی تسکین بخشتا ہے۔ اس کو اطمینان سے بھر دیتا ہے اور ہمیشہ امیدوں سے لبریز رکھتا ہے۔ چاہے وہ تمام دنیا کے دروازوں سے ٹھکرا دیا جائے سارے اسباب کا رشتہ ٹوٹ جائے اور وسائل و ذرائع ایک ایک کر کے اس کا ساتھ چھوڑ دیں۔ پھر بھی ایک خدا کا سہارا کسی حال میں اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا اور اسی کے بل بوتے پر وہ نئی امیدوں کے ساتھ کوشش پر کوشش کیے چلا جاتا ہے۔ یہ اطمینان قلب عقیدہ توحید کے سوا اور کسی عقیدے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ مشرکین اور کفّار اور دہریے چھوٹے دل کے ہوتے ہیں۔ ان کا بھروسہ محدود طاقتوں پر ہوتا ہے، اس لیے مشکلات میں بہت جلد مایوسی ان کو گھیر لیتی ہے اور اکثر ایسی حالتوں میں وہ خودکشی تک کر گزرتے ہیں۔

۶۔ اس کلمہ کا اعتقاد انسان میں عزم اور حوصلہ اور صبر و توکل کی زبردست طاقت پیدا کر دیتا ہے وہ جب خدا کی خوشنودی کے لیے دنیا میں بڑے کام انجام دینے کے لیے اٹھتا ہے تو اس کے دل میں یہ یقین ہوتا ہے کہ میری پشت پر زمین و آسمان کے بادشاہ کی قوت ہے۔ یہ خیال اس میں پہاڑ کی سی مضبوطی پیدا کرتا ہے اور دنیا کی ساری مشکلات اور مصیبتیں اور مخالف طاقتیں مل کر بھی اس کو اپنے عزم سے نہیں ہٹا سکتیں۔

۷۔ یہ کلمہ انسان کو بہادر بنا دیتا ہے۔ دیکھو! آدمی کو بزدل بنانے والی دراصل دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک تو جان اور مال اور بال بچوں کی محبت، دوسرے یہ خیال کہ خدا کے سوا کوئی اور مارنے والا ہے، اور یہ کہ آدمی اپنی تدبیر سے موت ٹال سکتا ہے۔ لا الہ الا اللہ کا اعتقاد

ان دونوں چیزوں کو دل سے نکال دیتا ہے۔ پہلی چیز تو اس لیے نکل جاتی ہے کہ اس کا قائل اپنی جان و مال اور ہر چیز کا مالک خدا ہی کو سمجھتا ہے اور اس کی خوشنودی کے لیے سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ رہی دوسری چیز تو وہ اس وجہ سے باقی نہیں رہتی کہ لا الہ الا اللہ کہنے والے کے نزدیک جان لینے کی قدرت کسی انسان یا حیوان یا توپ یا تلوار یا لکڑی یا پتھر میں نہیں ہے۔ اس کا اختیار صرف خدا کو ہے اور اس نے موت کا جو وقت مقرر کر دیا ہے اس سے پہلے دنیا کی تمام قوتیں مل کر بھی چاہیں تو کسی کی جان نہیں لے سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ پر ایمان رکھنے والے سے زیادہ بہادر دنیا میں کوئی نہیں ہوتا اس کے مقابلہ میں تلواروں کی باڑھ اور گولیوں کی بوچھاڑ اور فوجوں کی یورش سب ناکام رہ جاتی ہیں۔ جب وہ خدا کی راہ میں بڑھنے کے لیے بڑھتا ہے تو اپنے سے دس گنی طاقت کا منہ پھیر دیتا ہے۔ مشرکین اور کفار اور دہریے یہ قوت کہاں سے لائیں گے؟ ان کو تو جان سب سے زیادہ پیاری ہوتی ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ موت دشمن کے لانے سے آتی ہے اور ان کے بھاگنے سے بھاگ سکتی ہے۔

۸۔ لا الہ الا اللہ کا اعتقاد انسان میں قناعت اور بے نیازی کی شان پیدا کرتا ہے۔ حرص و ہوس اور رشک و حسد کے رکیک جذبات اس کے دل سے نکال دیتا ہے۔ کامیابی حاصل کرنے کے ناجائز اور ذلیل طریقے اختیار کرنے کا خیال تک اس کے ذہن میں نہیں آنے دیتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے جس کو چاہے زیادہ دے جس کو چاہے کم کر دے۔ عزت اور طاقت اور ناموری اور حکومت سب کچھ خدا کے اختیار میں ہے۔ وہ اپنی مصلحتوں کے لحاظ سے جس کو جس قدر چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ ہمارا کام صرف اپنی حد تک جائز کوشش کرنا ہے۔ کامیابی اور ناکامی خدا کے فضل پر موقوف ہے۔ وہ اگر دینا چاہے تو دنیا کی کوئی طاقت اُسے روک نہیں سکتی اور نہ دینا چاہے تو کوئی طاقت دلوا نہیں سکتی۔ اس کے مقابلہ میں مشرکین اور کفار اور دہریے اپنی کامیابی و ناکامی کو اپنی کوشش اور دنیوی طاقتوں کی مدد یا مخالفت پر موقوف سمجھتے ہیں اس لیے ان پر حرص اور ہوس مسلّط رہتی ہے۔ کامیابی حاصل کرنے کے لیے رشوت، خوشامد، سازش اور ہر قسم کے بدترین ذرایع اختیار کرنے میں انھیں باک نہیں ہوتا۔ دوسروں کی کامیابی پر رشک و حسد میں جلے مرتے ہیں اور ان کو نیچا دکھانے کی کوئی بُری سے بری تدبیر بھی نہیں چھوڑتے۔

۹۔ سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ لا الہ الا اللہ کا اعتقاد انسان کو خدا کے قانون کا پابند

بنتا ہے۔ اس کلمہ پر ایمان لانے والا یقین رکھتا ہے کہ خدا ہر چھپی اور کھلی چیز سے باخبر ہے۔ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے، اگر ہم رات کو اندھیرے میں اور تنہائی کے گوشے میں بھی کوئی گناہ کریں تو خدا کو اس کا علم ہو جاتا ہے اگر ہمارے دل کی گہرائی میں بھی کوئی برا ارادہ پیدا ہو تو خدا تک اس کی خبر پہنچ جاتی ہے۔ ہم سب سے چھپا سکتے ہیں مگر خدا سے نہیں چھپا سکتے، سب سے بھاگ سکتے ہیں مگر خدائی سلطنت سے نہیں نکل سکتے۔ سب سے بچ سکتے ہیں مگر خدا کی پکڑ سے بچنا غیر ممکن ہے یہ یقین جتنا مضبوط ہوگا۔ اتنا ہی زیادہ انسان اپنے خدا کے احکام کا مطیع ہوگا جس چیز کو خدا نے حرام کیا ہے وہ اس کے پاس بھی نہ پھٹکے گا اور جس چیز کا اس نے حکم دیا ہے وہ اس کو تنہائی اور تاریکی میں بھی بجالائے گا کیونکہ اس کے ساتھ ایک ایسی پولیس لگی ہوئی ہے جو کسی حال میں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی اور اس کو اسی عدالت کا کھٹکا لگا رہتا ہے جس کے وارنٹ سے وہ کہیں بھاگ ہی نہیں سکتا یہی وجہ ہے کہ مسلم ہونے کے لیے سب سے پہلی اور ضروری شرط لا الہ الا اللہ پر ایمان لانا ہے مسلم کے معنی جیسا کہ تم کو ابتدا میں بتایا جا چکا ہے خدا کے فرمانبردار بندے کے ہیں اور خدا کا فرمانبردار ہونا ممکن ہی نہیں جب تک انسان اس بات پر یقین نہ لائے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔

رسالہ دینیات ۹۱ تا ۹۸

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے ید بیضا

اگر آپ اس کی صحیح پیروی کریں اور اپنے قول و عمل سے اس کی سچی شہادت دیں اور آپ کے اجتماعی کردار میں پورے اسلام کا ٹھیک ٹھیک مظاہرہ ہونے لگے تو آپ دنیا میں سربلند اور آخرت میں سرخرو ہو کر رہیں گے۔ خوف اور حزن، ذلّت اور مسکنت مغلوبی و محکومی کے یہ سیاہ بادل جو آپ پر چھائے ہوئے ہیں چند سال کے اندر چھٹ جائیں گے۔ آپ کی دعوت حق اور سیرت صالحہ دلوں کو اور دماغوں کو مسخر کرتی چلی جائے گی۔ آپ کی ساکھ اور دھاک دنیا پر بیٹھتی چلی جائے گی۔ انصاف کی

امیدیں آپ سے وابستہ کی جائیں گی۔ بھروسہ آپ کی امانت و دیانت پر کیا جائیگا۔ سند آپ کے قول کی لی جائے گی۔ بھلائی کی توقعات آپ سے باندھی جائیں گی۔ ائمہ کفر کی کوئی ساکھ آپ کے مقابلہ میں نہ رہ جائے گی۔ ان کے تمام فلسفے اور سیاسی و معاشی نظریے آپ کی سچائی اور راست روی کے مقابلے میں جھوٹے ملمع ثابت ہوں گے جو طاقتیں آج ان کے کیمپ میں نظر آرہی ہیں ٹوٹ ٹوٹ کر اسلام کے کیمپ میں آتی چلی جائیں گی۔ حتیٰ کہ ایک وقت وہ آئے گا جب کمیونزم خود ماسکو میں اپنے بچاؤ کے لیے پریشان ہوگا۔ سرمایہ دارانہ ڈیموکریسی خود واشنگٹن اور نیویاک میں اپنے تحفظ کے لیے لرزہ براندام ہوگی۔ مادہ پرستانہ الحاد خود لندن اور پیرس کی یونیورسٹیوں میں جگہ پانے سے عاجز ہوگا۔ نسل پرستی اور قوم پرستی خود برہمنوں اور جرمنوں میں اپنے معتقد نہ پا سکے گی۔ اور آج کا یہ دور تاریخ میں ایک داستان عبرت کی حیثیت سے باقی رہ جائے گا کہ اسلام جیسی عالمگیر و جہاں کشا طاقت کے نام لیوا کبھی اتنے بیوقوف گئے تھے کہ عصائے موسیٰ بغل میں تھا اور لاٹھیوں اور رسیوں کو دیکھ دیکھ کانپ رہے تھے۔

اسلامی زندگی ۱۳، ۱۴

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

جو دنیا کے معاملات ہی کو چلانے کا ڈھنگ لے کر اٹھے اور اس ڈھنگ کی پیروی میں انسان کی فلاح و نجات ہو اس کے لیے تو بجز اس کے کوئی چارہ ہی نہیں کہ اقتدار کی کنجیوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ جب تک وہ اپنے نقشے پر عمل درآمد کرنے کی طاقت حاصل نہ کرلے اس کا نقشہ واقعات کی دنیا میں قائم نہیں ہو سکتا بلکہ کاغذ اور ذہنوں میں بھی زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رہ سکتا۔ جس جس تہذیب کے ہاتھ میں زمام کار ہوتی ہے دنیا کا سارا کاروبار اُسی کے نقشہ پر چلتا ہے وہی علوم و افکار اور فنون و آداب کی رہنمائی کرتی ہے۔ وہی اخلاق کے

سانچے بناتی ہے۔ وہی تعلیم و تربیت عامہ کا انتظام کرتی ہے۔ اسی کے قوانین پر سارا نظام تمدّن مبنی ہوتا ہے اور اسی کی پالیسی ہر شعبۂ حیات میں کارفرما ہوتی ہے۔ اس طرح زندگی میں کہیں بھی اس تہذیب کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی جو اپنی حکومت نہ رکھتی ہو۔ یہاں تک کہ جب ایک طویل مدت تک حکمراں تہذیب کا دور دورہ رہتا ہے تو غیر حکمراں تہذیب عمل کی دنیا میں خارج از بحث ہو جاتی ہے۔ اس کی طرف ہمدردانہ نقطۂ نظر رکھنے والوں کو بھی اس امر میں شبہ ہو جاتا ہے کہ یہ طریقہ دنیا کی زندگی میں چل سکتا ہے یا نہیں۔

تجدید و احیائے دین ۳۱ ، ۳۲

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

افسوس کہ عبادت کے اس صحیح مفہوم کو مسلمان بھول گئے۔ انھوں نے چند مخصوص اعمال کا نام عبادت رکھ لیا اور سمجھے کہ بس انہی اعمال کو انجام دینا عبادت ہے اور انہی کو انجام دے کر عبادت کا حق ادا کیا جا سکتا ہے اس عظیم الشان غلط فہمی نے عوام اور خواص دونوں کو دھوکے میں ڈال دیا۔ عوام نے اوقات میں سے چند لمحے خدا کی عبادت کے لیے مختص کر کے باقی تمام اوقات کو اس سے آزاد کرا لیا۔ قانون الٰہی کے دفعات میں سے ایک ایک دفعہ کی خلاف ورزی کی۔ حدود اللہ میں سے ایک ایک حد کو توڑا۔ جھوٹ بولے، غیبت کی، بد عہدیاں کیں، حرام کے مال کھائے، حق داروں کے حق مارے، کمزوروں پر ظلم کیا، نفس کی بندگی میں دل، آنکھ، ہاتھ اور پاؤں سب کو نافرمانی کے لیے وقف کر دیا، مگر پانچ وقت کی نماز پڑھ لی، زبان اور حلق کی حد تک قرآن کی تلاوت کر لی۔ سال میں مہینہ بھر کے روزے رکھ لیے، اپنے مال میں سے کچھ خیرات کر دی، ایک مرتبہ حج بھی کر آئے اور

سمجھے کہ ہم خدا کے عبادت گزار بندے ہیں۔ کیا اسی کا نام خدا کی عبادت ہے؟ اس کے سجدے سے سر اٹھاتے ہی ہر معبود باطل کے آگے جھک جاؤ، اس کے سوا ہر زندہ اور مردہ کو حاجت روا بناؤ، ہر اس بندے کو خدا بنا لو جس میں تم کو نقصان پہنچانے یا نفع دینے کی ذرہ برابر بھی قوت نظر آئے، روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے لیے کفار و مشرکین تک کے آگے ہاتھ جوڑو اور ان کے پاؤں چومو۔ انہی کو رازق سمجھو، انہی کو عزت اور ذلت دینے والا سمجھو، انہی کے قانون کو قانون سمجھو اس لیے کہ وہ طاقت رکھتے ہیں اور خدا کے قانون کو بے تکلف توڑو اس لیے کہ تمہارے زعم باطل میں وہ اپنے قانون کو نافذ کرنے کی قوت نہیں رکھتا، کیا یہی تمہارا اسلام ہے؟ یہی تمہارے ایمان کی شان ہے؟ اسی پر تمھیں گمان ہے کہ تم خدا کی عبادت کرتے ہو؟ اگر یہی اسلام اور ایمان ہے اور یہی اللہ کی عبادت ہے تو پھر وہ کیا چیز ہے جس نے تم کو دنیا میں ذلیل و خوار کر رکھا ہے؟ کیا چیز ہے جو تم سے خدا کے سوا ہر در کی گدائی کرا رہی ہے؟ کس چیز نے تمہاری گردنوں میں غلامی اور ذلّت کے طوق ڈال رکھے ہیں؟

خواص نے اس کے برعکس دوسرا راستہ اختیار کیا۔ وہ تسبیح و مصلّی لے کر حجروں میں بیٹھ گئے۔ خدا کے بندے گمراہی میں مبتلا ہیں، دنیا میں ظلم پھیل رہا ہے۔ حق کی روشنی پر باطل کی ظلمت چھائی جا رہی ہے، خدا کی زمین پر باغیوں اور ظالموں کا قبضہ ہو رہا ہے الٰہی قوانین کے بجائے شیطانی قوانین کی بندگی خدا کے بندوں سے کرائی جا رہی ہے مگر یہ ہیں کہ نفل پر نفل پڑھ رہے ہیں تسبیح کے دانوں کو گردش دے رہے ہیں۔ ہو حق کے نعرے لگا رہے ہیں۔ قرآن پڑھتے ہیں مگر محض ثواب تلاوت کی خاطر، حدیث پڑھتے ہیں مگر صرف تبرکاً۔ سیرت پاک اور اسوۂ صحابہ پر وعظ فرماتے ہیں مگر قصّہ گوئی کا لطف اٹھانے کے سوا کچھ مقصود نہیں۔ دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور جہاد فی سبیل اللہ کا سبق نہ ان کو قرآن میں ملتا ہے، نہ حدیث میں نہ سیرت پاک میں، نہ اسوۂ صحابہ میں۔ کیا یہ عبادت ہے؟ کیا عبادت یہی ہے کہ بدی کا طوفان تمہارے سامنے اٹھ رہا ہو، اور تم آنکھیں بند کیے ہوئے مراقبہ میں مشغول رہو؟ کیا عبادت اسی کو کہتے ہیں کہ گمراہی کا سیلاب تمہارے

حجرے کی دیواروں سے ٹکرا رہا ہو اور تم دروازہ بند کرکے نفل پر نفل پڑھے جاؤ؟ کیا عبادت اسی کا نام ہے کہ کفار چار دانگ عالم میں شیطانی فتوحات کے ڈنکے بجاتے پھریں دنیا میں انہی کا علم پھیلے، انہی کی حکمت کارفرما ہو۔ انہی کا قانون رواج پائے، انہی کی تلوار چلے، انہی کے آگے بندگان خدا کی گردنیں جھکیں اور تم خدا کی زمین اور خدا کی مخلوق کو ان کے لیے چھوڑ کر نمازیں پڑھنے، روزے رکھنے اور ذکر وشغل کرنے میں منہمک ہو جاؤ؟ اگر عبادت یہی ہے جو تم کر رہے ہو اور اللہ کی عبادت کا حق اسی طرح ادا ہوتا ہے تو پھر یہ کیا ہے کہ عبادت تم کرو اور زمین کی حکومت و فرماں روائی دوسروں کو ملے؟ کیا معاذاللہ خدا کا وہ وعدہ جھوٹا ہے جو اس نے قرآن میں تم سے کیا تھا کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا (النور - ۷) اگر خدا اپنے وعدے میں سچا ہے اور اگر یہ واقعہ ہے کہ تمہاری اس عبادت کے باوجود نہ تم کو زمین کی خلافت حاصل ہے، نہ تمہارے دین کو تمکن نصیب ہے نہ تم کو خوف کے بدلے امن میسر آرہا ہے۔ تو تم کو سمجھنا چاہیے کہ تم اور تمہاری ساری قوم عبادت گزار نہیں بلکہ تارک عبادت ہے اور اسی ترک عبادت کا وبال ہے جس نے تم کو دنیا میں ذلیل کر رکھا ہے۔

تفہیمات اول ۵۶، ۵۷، ۵۸

سکون محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

(ستارہ)

کائنات کا نظام کچھ اس طور پر واقع ہوا ہے کہ اس میں کہیں سکون اور ٹھہراؤ نہیں ہے۔ ایک پیہم حرکت، تغیر اور گردش ہے جو کسی چیز کو ایک حالت پر قرار نہیں لینے دیتی۔ ہر کون کے ساتھ ایک فساد ہے۔ ہر بناؤ کے ساتھ ایک بگاڑ ہے، ہر بہار کے ساتھ ایک خزاں ہے، ہر چڑھاؤ کے ساتھ ایک اتار ہے اور اس طرح اس کا عکس بھی ہے۔ ایک ماشہ بھر کا دانہ ہوا میں اڑا اڑا پھرتا ہے۔ کل وہی زمین میں استحکام

حاصل کرکے تناور درخت بن جاتا ہے۔ پرسوں وہی سوکھ کر پیوند خاک ہو جاتا ہے اور فطرت کو نمو بخشنے والی قوتیں اُسے چھوڑ کر کسی دوسرے بیج کی پرورش میں لگ جاتی ہیں، یہ زندگی کے اتار چڑھاؤ ہیں۔ انسان جب ان میں سے کسی ایک حالت کو زیادہ طویل مدت تک جاری رہتے دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے کہ یہ حالت دائمی ہے۔ اگر اتار ہے تو سمجھتا ہے اتار ہی رہے گا اگر چڑھاؤ ہے تو خیال کرتا ہے کہ چڑھاؤ ہی رہے گا۔ لیکن یہاں فرق جو کچھ بھی ہے دیر اور سویر کا ہے۔ دوام کسی حالت کو بھی نہیں ہے۔ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔

دنیا کے حالات ایک طرح کی دوری حرکت میں گردش کر رہے ہیں، پیدائش اور موت جوانی اور بڑھاپا قوت اور ضعیف، بہار اور خزاں، شگفتگی اور پژمردگی، سب اسی گردش کے مختلف پہلو ہیں۔ اس گردش میں باری باری سے ہر چیز پر ایک دور اقبال کا آتا ہے جس میں وہ بڑھتی ہے، پھیلتی ہے، قوت اور زور دکھاتی ہے۔ حسن اور بہار کی نمائش کرتی ہے حتیٰ کہ اپنی ترقی کی انتہائی حد کو پہنچ جاتی ہے۔ پھر ایک دوسرا دور آتا ہے جس میں گھٹتی ہے، مرجھاتی ہے۔ ضعف اور ناتوانی میں مبتلا ہوتی ہے اور آخر کار وہی قوتیں اس کا خاتمہ کر دیتی ہیں جنھوں نے اس کی ابتدا کی تھی۔

یہ اپنی مخلوقات میں اللہ تعالیٰ کی سنّت ہے اور دنیا کی سب چیزوں کے مانند یہی سنّت انسان پر بھی جاری ہے خواہ اس کو فرد کی حیثیت سے لیا جائے یا قوم کی حیثیت سے۔ ذلت اور عزت، عسر اور یسر، تنزل اور ترقی اور ایسی ہی دوسری تمام کیفیات اسی دوری حرکت کے ساتھ مختلف افراد اور مختلف قوموں میں تقسیم ہوتی رہتی ہیں۔ باری باری سے سب پر یہ دور گزرتے ہیں۔ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اس تقسیم میں کلیتہً محروم رکھا گیا ہے یا جس پر کسی ایک کیفیت کو دوام بخشا گیا ہو عام اس سے کہ وہ اقبال کی کیفیت ہو یا ادبار کی ۔۔۔۔

تنقیحات ۶۲، ۶۳

سماں الفقر فخری کا رہا شان امارت میں
بآب ورنگ وخال وخط چہ حاجت روئے زیبا را

اس نے اپنے اخلاق سے دشمنوں کو دوست بنایا۔ رحم و شفقت سے دلوں کو

موم کیا۔ عدل و انصاف سے حکومت کی۔ حق و صداقت سے کبھی یک سرمو انحراف نہ کیا۔ جنگ میں بھی کسی سے بدعہدی اور دغا نہ کی اپنے بدترین دشمنوں پر بھی ظلم نہ کیا جو اس کے خون کے پیاسے تھے۔ جنھوں نے اس کو پتھر مارے تھے، اس کو وطن سے نکالا تھا، اس کے خلاف تمام عرب کو کھڑا کر دیا تھا، حتیٰ کہ جنھوں نے جوش عداوت میں اس کے چچا کا کلیجہ تک نکال کر چبا ڈالا تھا، ان کو بھی اس نے فتح پا کر بخش دیا۔ اپنی ذات کے لیے کبھی اس نے کسی سے بدلہ نہ لیا۔

ان سب باتوں کے ساتھ اس کے ضبط نفس بلکہ بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ جب وہ تمام ملک کا بادشاہ ہو گیا اس وقت بھی وہ جیسا فقیر پہلے تھا ویسا ہی فقیر رہا۔ پھوس کے چھپّر میں رہتا تھا بورئیے پر سوتا تھا۔ موٹا جھوٹا پہنتا تھا۔ غریبوں کی سی غذا کھاتا تھا۔ فاقے تک کر گزرتا تھا۔ رات رات بھر اپنے خدا کی عبادت میں کھڑا رہتا تھا۔ غریبوں اور مصیبت زدوں کی خدمت کرتا تھا ایک مزدور کی طرح کام کرنے میں اُسے تامّل نہ تھا۔ آخر وقت تک اس کے اندر شاہانہ تمکّنت اور امیرانہ توقع اور بڑے آدمیوں کے سے تکبّر کی ذرا سی بو بھی پیدا نہ ہوئی۔ وہ ایک عام آدمی کی طرح لوگوں سے ملتا تھا۔ ان کے دُکھ درد میں شریک ہوتا تھا۔ عوام کے درمیان اس طرح بیٹھتا تھا کہ اجنبی آدمی کو یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا تھا کہ اس محفل میں قوم کا سردار، ملک کا بادشاہ کون ہے۔ اتنا بڑا آدمی ہونے کے باوجود چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے ساتھ بھی ایسا برتاؤ کرتا تھا کہ گویا وہ اس جیسا ایک انسان ہے، تمام عمر کی جدوجہد میں اس نے اپنی ذات کے لیے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ اپنا پورا ترکہ اپنی قوم پر وقف کر دیا۔ اپنے پیروؤں پر اس نے اپنے یا اپنی اولاد کے لیے کچھ بھی حقوق قائم نہ کیے۔ حتیٰ کہ اپنی اولاد کو زکوٰۃ لینے کے حق سے بھی محروم کر دیا۔ محض اس خوف سے کہ کہیں آگے چل کر اس کی اولاد ہی کو ساری زکوٰۃ نہ دینے لگ جائیں۔

تفہیمات اول ۲۰۴

سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا
ہے ایسا عقیدہ اثر فلسفہ دانی

(زہد اور رندی)

یہ زبردست قانون جس کی بندش میں بڑے بڑے سیّاروں سے لے کر

زمین کا ایک چھوٹے سے چھوٹا ذرّہ تک جکڑا ہوا ہے ایک بڑے حاکم کا بنایا ہوا قانون ہے۔ ساری کائنات اور کائنات کی ہر چیز اس حاکم کی مطیع اور فرماں بردار ہے، کیونکہ وہ اسی کے بنائے ہوئے قانون کی اطاعت و فرماں برداری کر رہی ہے۔ اس لحاظ سے ساری کائنات کا مذہب اسلام ہے کیونکہ اوپر ہم بیان کر چکے ہیں کہ خدا کی اطاعت و فرماں برداری کو ہی اسلام کہتے ہیں۔ سورج، چاند اور تارے سب مسلم ہیں، زمین بھی مسلم ہے، ہوا اور پانی اور روشنی بھی مُسلم ہیں۔ درخت اور پتھر اور جانور بھی مسلم ہیں اور وہ انسان بھی جو خدا کو نہیں پہچانتا اور خدا کا انکار کرتا ہے، جو خدا کے سوا دوسروں کو پوجتا ہے، جو خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتا ہے۔ ہاں وہ بھی اپنی فطرت اور طبیعت کے لحاظ سے مسلم ہی ہے۔ کیونکہ اس کا پیدا ہونا، زندہ رہنا اور مرنا سب کچھ خدائی قانون ہی کے ماتحت ہے۔ اس کے تمام اعضا اور اس کے جسم کے ایک ایک رونگٹے کا مذہب اسلام ہے، کیونکہ وہ سب خدائی قانون کے مطابق بنتے اور بڑھتے اور حرکت کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس کی وہ زبان بھی اصل میں مسلم ہے جس سے وہ نادانی کے ساتھ شرک اور کفر کے خیالات ظاہر کرتا ہے۔ اس کا وہ سر بھی پیدائشی مسلم ہے جس کو وہ زبردستی خدا کے سوا دوسروں کے سامنے جھکاتا ہے۔ اس کا وہ دل بھی فطرتاً مسلم ہے جس میں وہ بے علمی کی وجہ سے خدا کے سوا دوسروں کی عزت اور محبت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ سب چیزیں خدائی قانون کی فرماں بردار ہیں اور ان کی ہر جنبش خدا ہی کے قانون کے ماتحت ہوتی ہے۔

رسالہ دینیات ۱۱، ۱۲

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

(سلطنت)

ان لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہ کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے[۷۵] (اس کی قدرت کاملہ کا حال تو یہ ہے کہ) قیامت کے روز پوری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے دست راست میں لپٹے ہوئے ہوں گے[۷۶] پاک اور بالاتر ہے وہ اس

شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں ۷۴

۷۵ یعنی ان کو اللہ کی عظمت و کبریائی کا کچھ اندازہ نہیں ہے۔ انھوں نے کبھی یہ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ خداوند عالم کا مقام کتنا بلند ہے اور وہ حقیر ہستیاں کیا شے ہیں جن کو یہ نادان لوگ خدائی میں شریک اور معبودیت کا حق دار بنائے بیٹھے ہیں۔

۷۶ زمین و آسمان پر اللہ تعالیٰ کے کامل اقتدار و تصرّف کی تصویر کھینچنے کے لیے مٹھی میں ہونے اور ہاتھ پر لپیٹے ہونے کا استعارہ استعمال فرمایا گیا ہے جس طرح ایک آدمی کسی چھوٹی سی گیند کو مٹھی میں دبا لیتا ہے اور اس کے لیے یہ ایک معمولی کام ہے یا ایک شخص ایک رومال کو لپیٹ کر ہاتھ میں لے لیتا ہے اور اس کے لیے یہ کوئی زحمت طلب کام نہیں ہوتا، اسی طرح قیامت کے روز تمام انسان (جو آج اللہ کی عظمت و کبریائی کا اندازہ کرنے سے قاصر ہیں) اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ زمین و آسمان اللہ کے دستِ قدرت میں ہیں۔ ایک حقیر گیند اور ایک ذرا سے رومال کی طرح ہیں۔ مسند احمد، بخاری، مسلم، نسائی، ابن ماجہ، ابن جریر وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایات منقول ہوئی ہیں کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ دورانِ خطبہ میں یہ آیت آپؐ نے تلاوت فرمائی اور فرمایا "اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں (یعنی سیاروں) کو اپنی مٹھی میں لے کر اس طرح پھرائے گا جیسے ایک بچّہ گیند پھراتا ہے اور فرمائے گا میں ہوں خدائے واحد، میں ہوں بادشاہ، میں ہوں جبّار، میں ہوں کبریائی کا مالک، کہاں ہیں زمین کے بادشاہ؟ کہاں ہیں جبّار؟ کہاں ہیں متکبّر؟ یہ کہتے کہتے حضور پر ایسا لرزہ طاری ہوا کہ ہمیں خطرہ ہونے لگا کہ کہیں آپ منبر سمیت گر نہ پڑیں۔

۷۷ یعنی کہاں اس کی یہ شان عظمت و کبریائی اور کہاں اس کے ساتھ خدائی میں شریک ہونا۔

تفہیم القرآن ۴ ۳۸۲، ۳۸۳

سوداگری نہیں، یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر، جزا کی تمنّا بھی چھوڑ دے

اسلام نے انسان کو خدا کا خلیفہ اور روئے زمین پر اس کا نائب قرار دیا ہے، تو

اس تصور حیات سے جو نصب العین فطری طور پر پیدا ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیے اس تک آپ کی عقل خود بخود پہنچ جائے گی۔ ایک نائب کا بحیثیت نائب ہونے کے اس کے سوا اور کیا نصب العین ہونا چاہیے کہ وہ جس کا نائب ہے اس کی رضا اور خوشنودی حاصل کرے، اور اس کی نظر میں ایک اچھّا، وفادار، متدیّن اور فرض شناس ملازم قرار پائے؟ اگر وہ کوئی سچا اور نیک نیت آدمی ہے تو کیا وہ اپنے آقا کی خدمت بجا لانے میں اس کی رضا جوئی کے سوا کسی اور چیز کو اپنا مقصود بنا سکتا ہے؟ کیا وہ اپنا فرض اس لیے بجا لائے گا کہ اس کے معاوضہ میں اس کو کسی نفع کی طمع اور کسی ترقی یا انعام یا اضافہ منصب یا جاہ و منزلت کی زیادتی کا لالچ ہے؟ یہ دوسری بات ہے کہ آقا اس سے خوش ہو کر اُسے یہ سب کچھ عطا کر دے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آقا اس کو حسنِ خدمت کے صلہ میں ان چیزوں کو بخش دینے کی امید دلائے اور اس میں بھی مضائقہ نہیں کہ خود اس کو یہ علم ہو کہ اگر میں نے ٹھیک طور سے فرائض انجام دے کر اپنے آقا کو خوش کر دیا تو وہ مجھے یہ انعام دے گا۔ لیکن اگر اس نے انعام کو اپنا مقصود بنا لیا، اور اپنے فرائض منفعت کے خاطر انجام دیے، تو کیا کوئی دانش مند ایسے ملازم کو فرض شناس ملازم کہہ سکتا ہے؟ اسی مثال پر خدا اور اس کے نائب کے معاملہ کو بھی قیاس کر لیجیے۔ اگر انسان روئے زمین پر خدا کا نائب ہے تو اس کی زندگی کا نصب العین خدا کی رضا جوئی اور اس کی خوشنودی کے حصول کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

اسلامی تہذیب اصول و مبادی ۷۹، ۸۰

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرار بولہبی
(ارتقا)

مختصراً میں یہ بات آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام کی دعوت توحید و خدا پرستی محض اس معنی میں ایک مذہبی عقیدہ کی دعوت نہ تھی جس میں اور دوسرے مذہبی عقائد کی دعوت ہوا کرتی ہے، بلکہ حقیقت میں یہ ایک اجتماعی انقلاب (Social Revolution) کی دعوت تھی۔ اس کی ضرب بلاواسطہ ان طبقوں پر پڑتی تھی جنھوں نے مذہبی رنگ میں پروہت بن کر یا سیاسی زندگی میں بادشاہ اور رئیس اور حکمراں گروہ

بن کر، یا معاشی رنگ میں مہاجن اور زمیندار اور اجارہ دار بن کر عامۃ الناس کو اپنا بندہ بنالیا تھا۔ یہ کہیں اعلانیہ اَرْبَابٌ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ بنے ہوئے تھے، دنیا سے اپنے پیدائشی یا طبقاتی حقوق کی بنا پر اطاعت و بندگی کا مطالبہ کرتے تھے اور صاف کہتے تھے مَالَكُمْ مِنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ اور اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى اور اَنَا اُحْيِيْ وَاُمِيْتُ اور مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً اور کسی جگہ انھوں نے عامۃ الناس کی جہالت کو استعمال (Exploit) کرنے کے لیے بتوں اور ہیکلوں کی شکل میں مصنوعی خدا بنا رکھے تھے جن کی آڑ پکڑ کر یہ اپنے خداوندی حقوق بندگان خدا سے تسلیم کراتے تھے۔ پس کفر و شرک اور بت پرستی کے خلاف اسلام کی دعوت، اور خدائے واحد کی بندگی و عبودیت کے لیے اسلام کی تبلیغ براہ راست حکومت اور اس کو سہارا دینے والے یا اس کے سہارے چلنے والے طبقوں کی اغراض سے متصادم ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے جب کبھی کسی نبی نے یا قوم۔ اُعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ کی صدا بلند کی۔ حکومت وقت فوراً اس کے مقابلے میں آن کھڑی ہوئی اور تمام ناجائز انتفاع کرنے والے طبقے اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے، کیونکہ یہ محض ایک مابعد الطبیعی قضیہ Metaphysical Proposition کا بیان نہ تھا بلکہ ایک اجتماعی انقلاب کا اعلان تھا اور اس میں پہلی آواز سنتے ہی سیاسی شورش کی بو سونگھ لی جاتی تھی۔

تفہیمات ۱ ۶۷

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

(مسلمان کا زوال)

عجیب پر لطف استدلال ہے کہ مسلمانوں کی عزت اور قومی طاقت کا مدار دولت مندی پر ہے اور دولت کا مدار معاشی ترقی و خوشحالی کے ذرائع سے فائدہ اٹھانے پر ہے، اور ان سب کا مدار سود کے جواز پر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو ابھی تک یہی خبر نہیں کہ عزّت اور طاقت کا مدار دراصل ہے کس چیز پر۔ محض دولت ہرگز وہ چیز نہیں ہے جو کسی قوم کو معزز اور طاقت ور بناتی ہو، تمھارا ایک ایک شخص اگر لکھ پتی اور کروڑ پتی بن جائے مگر تم میں کیریکٹر کی طاقت نہ ہو تو یقین رکھو کہ

دنیا میں تمھاری کوئی عزّت نہ ہوگی۔ بخلاف اس کے اگر تم میں درحقیقت اسلامی شریعت موجود ہو، تم صادق اور امین ہو، لالچ اور خوف سے پاک ہو، اپنے اصول میں سخت اور اپنے معاملات میں کھرے ہو، حق کو حق اور فرض کو فرض سمجھنے والے ہو۔ حرام و حلال کی تمیز کو ہر حال میں ملحوظ رکھنے والے ہو اور تم میں اتنی اخلاقی قوت موجود ہو کسی نقصان کا خوف اور کسی فائدے کی طمع تم کو راستی سے نہ ہٹا سکے اور کسی قیمت پر تمھارا ایمان نہ خریدا جا سکے، تو دنیا میں تمھاری ساکھ قائم ہو جائے گی۔ دلوں میں تمھاری عزت بیٹھ جائے گی۔ تمھاری بات کا وزن لکھ پتی کی پوری دولت سے زیادہ ہوگا۔ تم جھونپڑیوں میں رہ کر اور پیوند کے کپڑے پہن کر بھی دولت سراؤں میں رہنے والوں سے زیادہ احترام کی نظر سے دیکھے جاؤ گے اور تمھاری قوم کو ایسی طاقت حاصل ہوگی جس کو کبھی نیچا نہیں دکھایا جا سکتا۔ عہد صحابہ کے مسلمان کس قدر مفلس تھے، جھونپڑیوں اور کمبل کے خیموں میں رہنے والے تمدّن کی شان و شوکت سے نا آشنا، نہ ان کے پاس لباس درست نہ غذا درست، نہ ہتھیار درست نہ سواریاں شاندار مگر ان کی دھاک اور ساکھ دنیا میں تھی وہ نہ اموی عہد میں مسلمانوں کو نصیب ہوئی نہ عباسی عہد میں، ان کے پاس دولت نہ تھی مگر کیریکٹر کی طاقت تھی جس نے دنیا میں اپنی عزت اور عظمت کا سکّہ بٹھا دیا تھا بعد والوں کے پاس دولت آئی حکومت آئی، تمدن کی شان و شوکت آئی مگر کوئی چیز بھی کیریکٹر کی کمزوری کا بدل فراہم نہ کر سکی۔

تنقیحات ۲۷۵، ۲۷۶

سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا
چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری

(دین و سیاست)

جن صدیوں میں ہم مسلسل انحطاط کی طرف جا رہے تھے، ٹھیک وہی صدیاں تھیں جن میں یورپ نشاۃٔ جدیدہ کی ایک نئی تحریک کے سہارے ابھر رہا تھا۔ اس تحریک کا آغاز ہی میں دورِ متوسط کے عیسائی مذہب سے تصادم ہو گیا اور یہ تصادم ایک ایسے افسوسناک نتیجے پر ختم ہوا جو نہ صرف یورپ کے لیے بلکہ ساری دنیا کے لیے غارت گر ثابت ہوا۔ پرانے

زمانے کے عیسائی متکلمین نے اپنی مذہبی عقائد کی اور بائیبل کے تصورِ کائنات وانسان کی پوری عمارت یونانی فلسفہ و سائنس کے نظریات، دلائل اور معلومات پر تعمیر کر رکھی تھی اور ان کا گمان یہ تھا کہ ان بنیادوں میں سے کسی کو اگر ذرا سی ٹھیس بھی لگ گئی تو یہ پوری عمارت دھڑام سے زمین پر آ رہے گی اور اس کے ساتھ مذہب بھی ختم ہو جائے گا۔ اس لیے وہ نہ کسی ایسی تنقید و تحقیق کو گوارا کرنے کے لیے تیار تھے جو یونانی فلسفہ و سائنس کے مسلّمات کو مشتبہ بناتی ہو، نہ کسی ایسے فلسفیانہ تفکّر" کو برداشت کر سکتے تھے جو ان مسلّمات سے ہٹ کر کوئی دوسری ایسی فکر پیش کرتی ہو جس کی وجہ سے اہلِ کلیسا کو اپنے علم کلام پر نظرِ ثانی کرنی پڑ جائے، اور نہ کسی ایسی علمی تحقیقات کی اجازت دے سکتے تھے جس سے کائنات وانسان کے بارے میں بائیبل کی دی ہوئی اور متکلّمین کی مانی ہوئی تصویر کا کوئی جز غلط ثابت ہو جائے۔ اس طرح کی ہر چیز کو وہ مذہب کے لیے اور مذہب پر بنے ہوئے پورے نظامِ تمدن و سیاست و معیشت کے لیے براہِ راست خطرہ سمجھتے تھے۔ اس کے برعکس جو لوگ نشاۃِ جدیدہ کی تحریک اور اس کے محرکات کے زیرِ اثر تنقید، تحقیق اور دریافت کا کام کر رہے تھے انھیں قدم قدم پر اس فلسفہ و سائنس کی کمزوریاں معلوم ہو رہی تھیں جن کے سہارے عقائد و کلام کا یہ پورا نظام کھڑا ہوا تھا۔ مگر وہ جوں جوں اس میدان میں آگے بڑھتے تھے، اہلِ کلیسا اپنے مذہبی اور سیاسی اقتدار کے بل بوتے پر روز بروز سختی کے ساتھ ان کی راہ روکنے کی کوشش کرتے تھے۔ آنکھوں کو پچھلے زمانے کی مانی ہوئی حقیقتوں کے خلاف بہت سی چیزیں روزِ روشن میں نظر آ رہی تھیں۔ مگر اہلِ کلیسا کو اصرار تھا کہ ان مسلّمات پر نظرِ ثانی کرنے کے بجائے دیکھنے والی آنکھیں پھوڑ دی جائیں۔ دماغوں کو بہت سے ان نظریات میں جھول محسوس ہو رہا تھا جن کو پہلے بعض عقائد کی اٹل دلیل سمجھا گیا تھا۔ مگر اہلِ کلیسا کہتے تھے کہ ان دلائل پر غور و فکر کرنے کے بجائے ان دماغوں کو پاش پاش کر دینا چاہیے جو ایسی باتیں سوچتے ہیں۔

اس کشمکش کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ جدید علمی بیداری میں اوّل روز ہی سے مذہب اور اہلِ مذہب کے خلاف ایک ضد سی پیدا ہو گئی اور جوں جوں اہلِ مذہب کی سختیاں بڑھتی گئیں، یہ ضد بھی بڑھتی اور پھیلتی چلی گئی۔ یہ ضد صرف مسیحیت اور اس کے کلیسا ہی تک محدود نہ رہی بلکہ مذہب فی نفسہٖ اس کا ہدف بن گیا۔ علومِ جدیدہ اور تہذیبِ جدید کے

علم برداروں نے یہ سمجھ لیا کہ مذہب بجائے خود ایک ڈھونگ ہے۔ وہ کسی عقلی امتحان کی ضرب نہیں سہہ سکتا۔ اس کے عقائد دلیل پر نہیں بلکہ اندھے اذعان پر مبنی ہیں۔ علم کی روشنی بڑھنے سے وہ ڈرتا ہے کہ کہیں اس کا پول نہ کھل جائے۔

پھر جب علم کے میدان سے آگے بڑھ کر سیاست اور معیشت پر اور نظامِ اجتماعی کے مختلف میدانوں میں یہ کشمکش پھیلی اور اہلِ کلیسا کی حتمی شکست کے بعد تہذیبِ جدید کے علم برداروں کی قیادت میں ایک نئے نظامِ زندگی کی عمارت اٹھی تو اس سے دو اور نتیجے برآمد ہوئے جنھوں نے آنے والے دور کی پوری انسانی تاریخ پر گہرا اثر ڈالا۔

ایک یہ کہ نئے نظامِ زندگی کے ہر شعبے سے "مذہب" کو عملاً بے دخل کر دیا گیا اور اس کا دائرہ صرف شخصی عقیدہ و عمل تک محدود کر کے رکھ دیا گیا۔ یہ بات تہذیبِ جدید کے بنیادی اصولوں میں داخل ہو گئی کہ مذہب کو سیاست، معیشت، اخلاق، قانون، علم و فن، غرض اجتماعی زندگی کے کسی شعبے میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ وہ محض افراد کا ایک شخصی معاملہ ہے۔ کوئی شخص اپنی انفرادی زندگی میں خدا اور پیغمبروں کو ماننا چاہے تو مانے اور ان کی دی ہوئی ہدایات کی پیروی کرنا چاہے تو کرتا رہے۔ مگر اجتماعی زندگی کی ساری اسکیم اس سوال سے قطع نظر کر کے بننی اور چلنی چاہیے کہ مذہب اس کے بارے میں کیا ہدایات دیتا ہے اور کیا ہدایات نہیں دیتا۔

دوسرے یہ کہ تہذیبِ جدید کی رگ رگ میں خدا بیزاری اور لامذہبیت کی ذہنیت پیوست ہو گئی۔ علوم و فنون اور ادب کا جو کچھ بھی ارتقا ہوا اس کی جڑ میں وہ ضد برابر موجود رہی جو علمی بیداری کے آغاز میں مذہب اور اس سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کے خلاف پیدا ہو چکی تھی۔ اس فکری غذا سے پرورش پائی ہوئی تہذیب جہاں جہاں بھی پہنچی وہاں اندازِ فکر یہ ہو گیا کہ مذہب جو چیز بھی پیش کرتا ہے، خواہ وہ خدا اور آخرت اور وحی اور رسالت کا عقیدہ ہو یا کوئی اخلاقی و تمدنی اصول بہرحال وہ شک کا مستحق ہے۔ اس کی صحت کا کوئی ثبوت ملنا چاہیے اور نہ ملے تو اس سے انکار کیا جانا چاہیے۔ اس کے برعکس ہر وہ چیز جو دنیوی علوم و فنون کے اساتذہ کی طرف سے آئے وہ مان لینے کے مستحق ہے، اِلّا یہ کہ اس کے غلط ہونے کا کوئی ثبوت مل جائے۔ یہ اندازِ خیال مغرب کے پورے نظامِ فکر پر اثر انداز ہوا ہے اور اس نے علم و ادب ہی کو مذہبی نقطۂ نظر

سے منحرف نہیں کر دیا ہے بلکہ تمام وہ اجتماعی فلسفے اور اجتماعی نظام جو اس نظام فکر کی بنیاد پر بنے ہیں، عملاً خدا پرستی کے تخیل سے خالی اور آخرت کے تصور سے عاری ہیں۔

اسلامی نظام زندگی ۴۳۵ تا ۴۳۸

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا قعود بھی حجاب

اسلام میں جو کچھ بھی ہے خدا کے لیے ہے۔ نماز اگر خدا کے لیے نہ ہو تو وہ ایک بے معنی اٹھک بیٹھک ہے۔ روزہ اگر خدا کے لیے نہ ہو تو وہ محض ایک فاقہ ہے۔ زکوٰۃ و خیرات اگر خدا کے لیے ہو تو خیرات اور انفاق فی سبیل اللہ ہے ورنہ محض اسراف و تبذیر۔ جنگ اور جہاد اگر خالصتہً للہ اور فی سبیل اللہ ہو تو بہترین عبادت ہے ورنہ محض ایک فساد اور ناحق کی خونریزی۔ اسی طرح دوسرے تمام افعال جن کا حکم اسلام میں دیا گیا ہے اگر خدا کے لیے کیے جائیں تو وہ نیک اور قابل اجر ہیں ورنہ بے فائدہ اور بے نتیجہ، اور جن سے اسلام نے منع کیا ہے اگر ان سے اجتناب خدا کی خاطر کیا جاوے تو مفید ہے ورنہ قطعاً لاحاصل۔

اسلامی تہذیب اصول و مبادی ۹۰

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی
رہ گئے صوفی و ملّا کے غلام اے ساقی

آج تمام دنیائے اسلام اسی خوفناک انقلاب کے دور سے گزر رہی ہے۔ درحقیقت یہ علما کا کام تھا کہ جب اس انقلاب کی ابتدا ہو رہی تھی اس وقت وہ بیدار ہوتے۔ آنے والی تہذیب کے اصول و مبادی کو سمجھتے۔ مغربی ممالک کا سفر کر کے ان علوم کا مطالعہ کرتے جن کی بنیاد پر یہ تہذیب اٹھی ہے۔ اجتہاد کی قوت سے کام لے کر ان کار آمد علمی اکتشافات اور عملی طریقوں کو اخذ کرتے جن کے بل پر مغربی

ملکوں نے ترقی کی اور ان نئے کل پرزوں کو اصول اسلام کے ماتحت مسلمانوں کے تعلیمی نظام اور ان کی تمدنی زندگی کی مشین میں اس طرح نصب کر دیتے کہ صدیوں کے جمود سے جو نقصان پہنچا تھا اس کی تلافی ہو جاتی اور اسلام کی گاڑی پھر سے زمانہ کے رفتار کے ساتھ چلنے لگتی۔ مگر افسوس کہ علما (الاماشاءاللہ) خود اسلام کی حقیقی روح سے خالی ہو چکے تھے۔ ان میں اجتہاد کی قوت نہ تھی۔ ان میں تفقہ نہ تھا۔ ان میں حکمت نہ تھی۔ ان میں عمل کی طاقت نہ تھی۔ ان میں یہ صلاحیت ہی نہ تھی کہ خدا کی کتاب اور رسول خدا کی علمی و عملی ہدایت سے اسلام کے دائمی اور لچکدار اصول اخذ کرتے اور زمانہ کے متغیر حالات میں ان سے کام لیتے ان پر تو اسلاف کی اندھی اور جامد تقلید کا مرض پوری طرح مسلّط ہو چکا تھا جس کی وجہ سے وہ ہر چیز کو ان کتابوں میں تلاش کرتے تھے جو خدا کی کتابیں نہ تھیں کہ زمانہ کی قیود سے بالاتر ہوتیں۔

بدقسمتی یہ ہے کہ علمائے اسلام کو اب بھی اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوا ہے قریب قریب ہر اسلامی ملک میں علما کی جماعت اب بھی اُسی روش پر قائم ہے جس کی وجہ سے ابتدا میں ان کو ناکامی ہوئی تھی۔ چند مستثنیٰ شخصیتوں کو چھوڑ کر علما کی عام حالت یہ ہے کہ وہ زمانے کی موجودہ رجحانات اور ذہنیتوں کی نئی ساخت کو سمجھنے کی قطعاً کوشش نہیں کرتے۔"

تنقیحات ۴۰، ۴۱، ۴۲

شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں
خود جلیں، دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

(عبدالقادر کے نام)

اس میں شک نہیں کہ دنیا میں بات وہی چلتی ہے جسے لوگ بالعموم قبول کرلیں اور وہ بات نہیں چلتی جسے لوگ بالعموم رد کر دیں لیکن لوگوں کا ردّ و قبول ہرگز حق و باطل کا معیار نہیں ہے۔ لوگوں کی اکثریت اگر اندھیروں میں بھٹکنا اور ٹھوکریں کھانا چاہتی ہے تو خوشی سے بھٹکے اور ٹھوکریں کھاتی رہے، ہمارا کام بہرحال اندھیروں میں چراغ جلانا ہی ہے اور ہم مرتے دم تک یہی کام کرتے رہیں گے، ہم اس سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں کہ

ہم بھٹکنے یا بھٹکانے والوں میں شامل ہو جائیں۔ خدا کا یہ احسان ہے کہ اس نے ہمیں اندھیروں میں چراغ جلانے کی توفیق بخشی۔ اس احسان کا شکر یہی ہے کہ ہم چراغ ہی جلاتے جلاتے مر جائیں۔

ماہنامہ تجلی دیوبند سالنامہ ۱۹۷۱ صفحہ ۳۶

شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا

تصورات و افکار، اخلاق و خصائل، معیشت و معاشرت، تمدّن و عمران، سیاست و حکومت، غرض انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی تہذیب کا راستہ دوسری تہذیبوں کے راستہ سے الگ ہو جاتا ہے۔ زندگی کے متعلق اسلام کا نظریہ دوسری تہذیبوں کے نظریہ سے الگ ہے۔ زندگی کا مقصد اسلام کے نزدیک اس مقصد سے مختلف ہے جو دوسری تہذیبوں نے متعین کیا ہے۔ لہٰذا اسلام اپنے نظریہ کے مطابق دنیا و مافیہا سے جو معاملہ برتتا ہے، اور اپنے مقصد کی تحصیل کے لیے دنیوی زندگی میں جو طریقہ اختیار کرتا ہے، وہ بھی بنیادی طور پر اس معاملہ اور اس طریقہ سے مختلف ہے جو دوسری تہذیبوں نے اختیار کیا ہے۔ ذہن کے بہت سے افکار و تصورات، نفس کے بہت سے میلانات و رجحانات اور زندگی بسر کرنے کے بہت سے طریقے ایسے ہیں جن کا اتباع دوسری تہذیبوں کے نزدیک نہ صرف جائز بلکہ بسا اوقات لازمۂ تہذیب ہے۔ مگر اسلام ان کو ناجائز، مکروہ اور بعض حالات میں حرام قرار دینے پر مجبور ہے۔ اس لیے کہ وہ اُن تہذیبوں کے تصور حیات سے عین مطابقت رکھتے ہیں اور ان کے مقصد زندگی کی تحصیل میں مددگار ہوتے ہیں مگر اسلام کے تصور حیات سے ان کو کوئی لگاؤ نہیں ہے یا اس کے مقصد زندگی کی تحصیل میں وہ مانع ہیں۔ مثال کے طور پر فنون لطیفہ دنیا کی بہت سی تہذیبوں میں جان تہذیب ہیں اور ان فنون میں اعلا مہارت رکھنے والوں کو قومی ہیرو کا مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے مگر اسلام ان میں سے بعض کو حرام، بعض کو مکروہ اور بعض کو ایک حد تک جائز قرار دیتا ہے۔ اس کے قانون میں ذوق لطیف کی پرورش اور جمال مصنوعی سے لطف اندوزی

کی اجازت صرف اس حد تک ہے جہاں انسان اس کے ساتھ ساتھ خدا کو یاد رکھ سکے، اس کی رضا جوئی کے لیے عمل کر سکے، اپنے منصب خلافت کے فرائض بجا لا سکے۔ مگر جس مقام پر پہنچ کر یہ ذوق لطیف احساس فرض پر غالب آجاتا ہو، جہاں لطف اندوزی کا انہماک انسان کو خدا پرست کے بجائے حسن پرست بنا دیتا ہو، جہاں فنون لطیفہ کی چاشنی سے انسان کو عیش پسندی کا چسکا لگ جاتا ہو، جہاں ان فنون کے اثر سے جذبات و داعیات نفس اس قدر قوت و شدت حاصل کر لیتے ہوں کہ عقل کی گرفت ڈھیلی ہو جائے اور ضمیر کی آواز کے لیے دل کے کان بہرے ہو جائیں اور فرض کے پکار کے لیے سمع و طاعت باقی نہ رہے، ٹھیک اُسی سرحد پر اسلام عدم جواز، کراہیت اور حرمت کے موانع قائم کر دیتا ہے اس لیے کہ اس کا مقصد تان سین اور بنداوین، مانی و بہزاد، چارلی چیلن اور میری پکفورڈ پیدا کرنا نہیں بلکہ وہ ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ، علی بن ابی طالب اور حسین بن علیؓ، ابوذر غفاریؓ اور رابعہؒ بصریہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔

اسلامی تہذیب اصول و مبادی ۱۰۹، ۱۱۰

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

دنیائے اسلام کا بیشتر حصہ ان ممالک پر مشتمل ہے جو صدر اول کے مجاہدین کی کوششوں سے فتح ہوئے ہیں۔ ان کو جن لوگوں نے فتح کیا تھا وہ ملک گیری اور حصول غنائم کے لیے نہیں بلکہ خدا کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے سروں سے کفن باندھ کر نکلے تھے۔ وہ طلب دنیا کے بجائے طلب آخرت کے نشہ میں سرشار تھے اس لیے انھوں نے اپنے مفتوحین کو مطیع و باج گزار بنانے پر اکتفا نہ کیا بلکہ انھیں اسلام کے رنگ میں رنگ دیا۔ ان کی پوری آبادی یا اس کے سواد اعظم کو ملت حنیفی میں جذب کر لیا۔ علم و عمل کی قوت سے ان میں اسلامی فکر اور اسلامی تہذیب کو اتنا راسخ کر دیا کہ وہ خود تہذیب اسلامی کے علمبردار اور علوم اسلامی کے معلّم بن گئے

شاعر بھی ہیں پیدا علما بھی حکما بھی　　خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ
مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک　　ہر ایک ہے گو شرحِ معانی میں یگانہ
بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رمِ آہو　　باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ
کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند
تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ

(نفسیات غلامی)

سوال یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نبی ہونے کی حیثیت سے کس کام کے لیے مبعوث فرمائے گئے تھے؟ "دین اللہ" کی دعوت دینے کے لیے یا "دین الملک" کو فروغ دینے کے لیے؟ اگر خاں بہادر صاحب کی تاویل اور ان حضرات کی تفسیر جن کے بڑے بڑے نام لے کر خان بہادر صاحب ہم کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں، مان لی جائے تو اس سے لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو اپنے نبی کو اس بات پر مامور فرمایا کہ اس کی مخلوق کو اور خصوصاً اس مخلوق کو جو مصر میں رہتی تھی "دین اللہ" اختیار کرنے کی دعوت دے اور دوسری طرف وہی نبی خود اللہ تعالیٰ کی ہدایت و نگرانی میں "دین الملک" کے قیام و استحکام کی خدمت انجام دینے لگا اور لطف یہ ہے کہ اللہ میاں اس صریح متناقض، طرزِ عمل کا تناقض تو کیا محسوس فرماتے الٹا اس نبی کے اس فعل کو خان بہادر صاحب کے اپنے الفاظ میں، سراہنے لگے اور نظامِ کفر میں اپنے نبی کے بعہدۂ وزارت فائز ہو جانے کو "انعامِ خداوندی" سے تعبیر فرمانے لگے۔ گویا اللہ میاں کا حال بھی معاذ اللہ ہمارے موجودہ زمانے کے ان دیندار بزرگوں کا سا ہے جو خود تو پیشانی پر سیاہ گٹّا لیے ہوئے مصلّے پر سبحہ گردانی فرما رہے ہوتے ہیں مگر صاحب زادے جب ایم۔ اے پاس کر کے نیم انگریز بنے ہوئے آبکاری کی انسپکٹری پر فائز ہو جاتے ہیں تو وہی دین مجسم بزرگ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ان کے خاندان کو اپنی نعمت سے نواز دیا آگے چل کر خان بہادر صاحب پھر فرماتے ہیں:

"اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ملک مصر کی وزارت پر متمکن ہو جانے کے بعد حضرت یوسفؑ نے تبلیغ حق کا کام نہیں کیا، یا اپنی رسالت کے اعلان سے گریز کیا، برخلاف اس کے صاحب ممدوح نے اس وقت جب کہ آپ جیل میں تھے اسی وقت وحدانیت کی تبلیغ شروع کر دی تھی۔۔۔۔ البتہ جو بات آیات سے بلا شک و شبہ ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام ایک غیر اسلامی نظامِ حکومت کے رکن خود اپنی خواہش اور درخواست پر بنے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے اس حکومت کے رکن بننے کے بعد بھی ملک میں غیر اسلامی نظامِ حکومت اور غیر اسلامی قانون ہی نافذ رہا۔"

یہاں پھر کھلا ہوا تناقض پایا جاتا ہے جس کی طرف صاحب موصوف نے اپنی مدعا کی دھن میں توجہ نہیں فرمائی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے آخر یہ کس قسم کی وحدانیت کی تبلیغ فرمائی تھی؟ اگر اس "وحدانیت" کے معنی یہ تھے کہ وہ پوجا جو معبدوں میں کی جاتی ہے اور وہ اطاعت قانون جس پر سوسائٹی کا نظم اور ملک کا انتظام قائم ہوتا ہے ایک ہی خدا کے لیے ہو، یعنی پوری زندگی دین اللہ کی تابع ہو جائے، تو خان بہادر صاحب کی تاویل کے لحاظ سے حضرت یوسفؑ نے نوکری کر کے خود اپنی اس تبلیغ حق کے خلاف عمل کیا، اور اگر یہ تبلیغ اس بات کی تھی کہ معبد میں "دین اللہ" جاری ہو اور ملک اور سوسائٹی کا سارا انتظام "دین الملک" پر بدستور چلتا رہے تو ظاہر ہے کہ یہ وحدانیت کی نہیں بلکہ ثنویت اور دو عملی کی تبلیغ تھی۔

پھر مزید سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی رسالت کا اعلان آخر کس معنی میں کیا تھا؟ اگر انھوں نے بادشاہ سمیت تمام لوگوں سے یہ کہا تھا کہ مالک زمین و آسمان کا نمائندہ ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، جیسا کہ تمام انبیا کہتے رہے ہیں فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُونِ، تو اس اعلان کے ساتھ ان کا غیر مسلم بادشاہ کی آقائی تسلیم کرنا اور اس کی اطاعت میں اسلامی نظام کے بجائے غیر اسلامی نظام کی خدمت انجام دینا کسی طرح مطابقت نہیں رکھتا اور اگر انھوں نے یہ کہا تھا کہ لوگو! میں ہوں تو بادشاہ ارض و سما کا نمائندہ مگر میرا مسلک یہ ہے کہ بادشاہ مصر کی اطاعت کروں اور تم کو بھی یہی دعوت دیتا ہوں کہ اسی کی اطاعت کرو تو صرف یہی نہیں کہ یہ ایک صریح متناقض بات کا اعلان تھا جس کا استقبال سنجیدگی کے بجائے قہقہے کے ساتھ ہونا چاہیے تھا اور ایسا اعلان کرنے والے کو ایوانِ وزارت کے بجائے پاگل خانے

ہیں جگہ ملنی چاہیے تھی۔ بلکہ آج بھی ایسی کتاب ہرگز ایمان لائے جانے کے قابل نہیں
رہتی جو ایک طرف خود ہی یہ قاعدہ کلیہ بیان کرتی ہے کہ "خدا نے جو رسول بھی بھیجا ہے
اس لیے بھیجا ہے کہ اذنِ خداوندی کے تحت وہ مطاع بن کر رہے"۔ اور دوسری طرف
وہی کتاب ایک ایسے شخص کو رسول بھی قرار دیتی ہے جو مطاع بن کر نہیں بلکہ غیر اللہ کا
مطیع بن کر رہا اور دوسرے بندگانِ خدا کو بھی اذنِ خداوندی کے تحت اپنا نہیں بلکہ اسی
غیر خدا کا مطیع بناتا رہا۔ قرآن اپنے منجانب اللہ ہونے کے ثبوت میں خود یہ معیار پیش کرتا
ہے کہ اگر یہ کتاب اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتی تو لوگ اس میں بہت کچھ اختلاف
پاتے۔ لیکن اگر ہم خان بہادر صاحب اور ان کے طرزِ خیال کے لوگوں کی تاویلات تسلیم
کر لیں تو قرآن کے بیانات میں ایسے کھلے ہوئے تناقضات پائے جائیں گے جن سے قرآن
آپ اپنے ہی پیش کردہ معیار کی رو سے اللہ کے سوا کسی اور کا کلام قرار پائے گا، بلکہ وہ "اور"
بھی جس کی تصنیف اسے سمجھا جائے گا بہرحال کوئی صحیح الدماغ انسان تو نہ ہوگا۔

تفہیمات دوم ۱۰۷، ۱۰۹

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لاالہ میں ہے

اسلامی جہاد کا مقصود (Objective) غیر اسلامی نظام کی حکومت کو مٹا کر اسلامی
حکومت قائم کرتا ہے۔ اسلام یہ انقلاب صرف ایک ملک یا چند ملکوں میں نہیں بلکہ تمام
دنیا میں برپا کرنا چاہتا ہے اگرچہ ابتداً مسلم پارٹی کے ارکان کا فرض یہی ہے کہ جہاں
جہاں وہ رہتے ہوں وہاں کے نظامِ حکومت میں انقلاب پیدا کریں۔ لیکن ان کی آخری منزل
مقصود ایک عالمگیر انقلاب کے سوا کچھ نہیں ہے کوئی انقلابی مسلک جو قومیت کے
بجائے انسانیت کی فلاح کے اصول لے کر اٹھا ہو، اپنے انقلابی مطمع نظر کو کبھی ایک
ملک یا ایک قوم کے دائرہ میں محدود نہیں کر سکتا، بلکہ وہ اپنی فطرت کے عین اقتضا
ہی سے مجبور ہے کہ عالمگیر انقلاب کو اپنا مطمع نظر بنائے۔ حق جغرافی حدود کو قبول
کرنے سے انکار کرتا ہے اس کا مطالبہ یہ ہے کہ ہیں اگر کسی دریا یا پہاڑ کے اس پار حق ہوں

تو اس پار بھی حق ہی ہوں۔ نوعِ انسانی کے کسی حصہ کو بھی مجھ سے محروم نہ رہنا چاہیے۔
انسان جہاں بھی ظلم و ستم کا اور افراط و تفریط کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے وہاں اس کی
مدد کے لیے پہنچنا میرا فرض ہے، اسی تخیل کو قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں ان مردوں عورتوں اور بچوں کے لیے نہیں لڑتے
جنھیں کمزور پاکر دبا دیا گیا ہے اور جو دعائیں مانگتے ہیں کہ خدایا ہمیں اس بستی سے نکال
جس کے کارفرما ظالم ہیں (النساء، ۱۰)

علاوہ بریں قومی و ملکی تقسیمات کے باوجود انسانی تعلقات اور روابط کچھ ایسی عالمگیری
اپنے اندر رکھتے ہیں کہ کوئی ایک مملکت اپنے اصول و مسلک کے مطابق پوری طرح عمل
نہیں کر سکتی جب تک کہ ہمسایہ ممالک میں بھی وہی اصول و مسلک رائج نہ ہو جائے لہذا
مسلم پارٹی کے لیے اصلاحِ عمومی اور تحفظ خودی، دونوں کی خاطر یہ ناگزیر ہے کہ کسی ایک
خطہ میں اسلامی نظام کی حکومت قائم کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ جہاں تک اس کی قوتیں ساتھ
دیں، اس نظام کو تمام اطرافِ عالم میں وسیع کرنے کی کوشش کرے۔ وہ ایک طرف
اپنے افکار و نظریات کو دنیا میں پھیلائے گی اور تمام ممالک کے باشندوں کو دعوت
دے گی کہ اس مسلک کو قبول کریں جس میں ان کے لیے حقیقی فلاح مضمر ہے دوسری طرف
اگر اس میں طاقت ہو گی تو وہ لڑ کر غیر اسلامی حکومتوں کو مٹا دے گی اور ان کی جگہ اسلامی
حکومت قائم کرے گی۔

تفہیمات ۷۲، ۷۳

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

اسلام کی تنظیم میں یہ قاعدہ اصل اور اساس کی حیثیت رکھتا ہے وہ پہلے
احکام نہیں دیتا بلکہ سب سے پہلے اللہ اور رسول پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے
جتنی حجتیں ہیں سب اسی ایک چیز پر تمام کی گئی ہیں۔ ہر عقلی دلیل اور فطری شہادت
سے انسان کو اس امر پر مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ خدائے واحد ہی اس کا

اللہ ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں آپ جس قدر عقلی جانچ پڑتال کرنا چاہتے ہیں اس بنیادی مسئلہ پر کر لیجیے۔ اگر کسی دلیل اور کسی حجّت سے آپ کا دل اس پر مطمئن نہ ہو تو آپ کو داخل اسلام ہونے پر مجبور نہیں کیا جائے گا اور نہ احکام اسلامی میں سے کوئی حکم آپ پر جاری ہوگا۔ لیکن جب آپ نے اس کو قبول کر لیا تو آپ کی حیثیت ایک "مسلم" کی ہوگئی اور مسلم کے معنی ہی مطیع کے ہیں۔ اب یہ ضروری نہیں کہ اسلام کے ہر ہر حکم پر آپ کے سامنے دلیل و حجّت پیش کی جائے اور احکام کی اطاعت کرنے کا انحصار آپ کے اطمینانِ قلب پر ہو۔ مسلم بن جانے کے بعد آپ کا اوّلین فرض یہ ہے کہ جو حکم آپ کو خدا اور رسول کی طرف سے پہنچے بے چون وچرا اس کی اطاعت میں سر جھکا دیں۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (النور-۷)	ایمان لانے والوں کا کام صرف یہ ہے کہ جب ان کو اللہ اور رسول کی طرف بلایا جائے تاکہ رسول ان کے درمیان حکم کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

ایمان اور ایسی طلب حجّت جو تسلیم و اطاعت کے لیے شرط ہو، باہم متناقض ہیں اور ان دونوں کا اجتماع صریح عقل کے خلاف ہے۔ جو مومن ہے وہ اس حیثیت سے طالب حجّت نہیں ہو سکتا اور جو ایسا طالب حجّت ہے وہ مومن نہیں ہو سکتا۔

کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر کا فیصلہ کر دے تو ان کو اپنے معاملے میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے (الاحزاب-۵)

اسلام نے اصلاح و تنظیم کا جو عظیم الشان کام انجام دیا ہے وہ سب اسی قاعدہ کی وجہ سے ہے۔ دلوں میں ایمان بٹھا دینے کے بعد جس چیز سے روکا گیا تمام اہل ایمان اس سے رُک گئے اور جس چیز کا حکم دیا گیا وہ ایک اشارے پر لاکھوں کروڑں انسانوں میں رائج ہوگئی اگر ایک ایک چیز کے لیے عقلی حجّتیں پیش کرنا ضروری ہوتا اور ہر امر و نہی کی حکمتیں اور مصلحتیں سمجھانے پر اطاعت احکام موقوف ہوتی تو قیامت تک انسانی اخلاق کی وہ اصلاح اور اعمال کی وہ تنظیم نہ ہو سکتی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ سال کی مختصر مدت میں انجام دے دی۔

تنقیہات ۱۳۹، ۱۴۰

عجب واعظ کی دینداری ہے یارب
عداوت ہے اُسے سارے جہاں سے

اگر آپ نے جمعہ کی امامت کے لیے کسی دوسرے گروہ کا انتخاب کرنا چاہا تو لامحالہ اس کے لیے آپ کو علما ہی کے طبقے کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور باستثناءِ چند اس طبقے کے سواد اعظم کا جو حال ہے اُسے بیان کرنا گویا اپنی ٹانگ کھولنا اور آپ ہی لاجوں مرنا ہے۔ ان حضرات کو اگر آپ نے عام فہم زبان میں من مانے خطبے دینے کا موقع دیا تو یقین جانیے کہ آئے دن مسجدوں میں سر پھٹول ہوگی۔ اس لیے کہ ان میں کا ہر شخص اپنا ایک الگ مشرب رکھتا ہے اور اپنے مشرب میں وہ اتنا سخت ہے کہ دوسرے مشرب والوں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کرنا اس کے نزدیک گناہ سے کم نہیں۔ پھر اللہ نے اس کی زبان میں ایک ڈنک رکھ دیا ہے جس سے دلوں کو زخمی کیے بغیر وہ کوئی بات نہیں کر سکتا۔ وہ جس ماحول سے تربیت پاکر آتا ہے اور جس ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے وہاں دین کے مہمات اور قوم کے مصالح کے لیے کوئی جگہ نہیں تمام دلچسپیاں سمٹ کر چند چھوٹی چھوٹی نزاعی باتوں میں جمع ہوگئی ہیں اس لیے لامحالہ وہ جب زبان کھولے گا انہی مسائل پر کھولے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ کے گھر میں گالم گلوچ اور جوتی پیزار ہوگی اور آخر کار ہر مشرب کے مسلمان اپنے جمعے الگ الگ قائم کرنے لگیں گے۔ یہ تو مذہبی ذہنیت رکھنے والوں کا حال ہوا۔ رہے نئے تعلیم یافتہ حضرات جو ان مسائل سے دل چسپی نہیں رکھتے۔ تو ان پر ایک دوسری مصیبت نازل ہوگئی وہ ہر جمعہ کو رسول اللہ کے منبر پر سے وہ وہ موضوع اور ضعیف روایتیں اور لاطائل کہانیاں اور احکام اسلامی کی غلط تعبیریں سُنیں گے کہ جن کو سُن کر غیر مسلموں کا مسلمان ہونا تو درکنار، ذی ہوش مسلمانوں کا مسلمان رہنا بھی مشکل ہے۔

تفہیمات دوم ۳۴۴، ۳۴۵

عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکر معاش

(مدرسہ)

آپ کا کہنا بجا ہے کہ ایک کافرانہ نظام تمدن و سیاست کے اندر رہتے ہوئے

خالص حلال کی روٹی تقریباً محال ہے۔ مگر میں نے وسائل رزق کے معاملہ میں حلال و حرام کی تمیز پر اپنے مضامین میں بار بار جو زور دیا ہے اس سے میرا مقصود یہ نہیں تھا کہ حلال ذرائع یہیں کہیں موجود ہیں۔ لوگ حرام ذرائع کو چھوڑ کر ان کو حاصل کر لیں بلکہ اس سے میرا مقصود یہ تھا کہ حلال و حرام کی تمیز پیدا ہو جانے کے بعد ایک سچا مسلمان جب اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے گا۔ تب اس کو صحیح اندازہ ہوگا کہ اس کفر کے تسلّط کی بدولت وہ کس طرح چاروں طرف سے گندگیوں اور نجاستوں میں گھر گیا ہے۔ پھر اگر واقعی وہ پاکیزگی کا خواہاں ہو تو اس کے اندر اس نجاست خیز نظام کو مٹانے اور بدلنے کا شدید جذبہ پیدا ہوگا اور وہ ہر آن اس نظام سے سخت نفرت و کراہت کرے گا۔

اس اصولی بات کو سمجھ لینے کے بعد عملی نقطۂ نظر سے ہمارے لیے اگر کچھ ممکن ہے تو صرف یہ کہ زیادہ حرام کو چھوڑ کر کم حرام یا ملوّث بہ حرام رزق کو مجبوراً گوارا کریں۔ خالص حلال کی قید کے ساتھ زندگی کا سامان بہم پہنچانا، اس نظام کے اندر رہتے ہوئے ممکن نہیں ہے۔ اب یہ آپ کے حالات پر اور آپ کی قوتوں اور صلاحیتوں پر منحصر ہے کہ عملاً کون سے ذرائع آپ اختیار کر سکتے ہیں جن میں حرام کی آمیزش کم سے کم ہو۔ اور آپ موجودہ کافرانہ نظام کے بقا و استحکام میں کم سے کم مددگار بنیں۔ عملاً اس میں کامیابی کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ آپ اپنے معیار زندگی کو بدلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ بہت سے لوگ جن کے اندر حلال و حرام کی تمیز پیدا ہو چکی ہے۔ یہ شرط لگاتے ہیں کہ حلال تو ملے مگر زندگی کا معیار وہی رہے جو حرام خوری کے زمانے میں ہم نے اختیار کیا تھا۔ یہ شرط مجبوراً اسی حرام خوری میں مبتلا رکھتی ہے۔ حلال خوری پر آدمی قایم اسی وقت رہ سکتا ہے جب کہ وہ اس امر کا فیصلہ کر لے کہ کھانا بہر حال حلال ہے قطع نظر اس سے کہ وہ پلاؤ ہو یا چٹنی، پہننا بہر حال حلال ہے خواہ وہ نفیس کپڑے ہوں یا ٹاٹ کا پیوند لگا ہوا گاڑھا۔

رسائل مسائل اول ۹۲، ۹۳

عام حرّیت کا دیکھا تھا جو خواب اسلام نے
اے مسلمان آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

تقریباً تین صدیوں تک تحقیق و اجتہاد اور حرّیت فکر و نظر اور آزادانہ طلبِ حق

کی وہ اسپرٹ مسلمانوں میں پوری شان کے ساتھ باقی رہی جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے متبعین میں پیدا کر گئے تھے۔ اس کے بعد امرا و حکام اور علما و مشائخ کے استبداد نے اس روح کو کھانا شروع کر دیا۔ سوچنے والے دماغوں سے سوچنے کا حق اور دیکھنے والی آنکھوں سے دیکھنے کا حق اور بولنے والی زبانوں سے بولنے کا حق سلب کر لیا گیا۔ درباروں سے لے کر مدرسوں اور خانقاہوں تک ہر جگہ مسلمانوں کو غلامی کی باقاعدہ تربیت دی جانے لگی۔ دل و دماغ کی غلامی، روح و جسم کی غلامی ان پر پوری طرح مسلّط ہو گئی۔ دربار والوں نے اپنے سامنے رکوع اور سجدے کرا کے غلامانہ ذہنیت پیدا کی۔ مدرسے والوں نے خدا پرستی کے ساتھ اکابر پرستی کا زہر دماغوں میں اتارا۔ خانقاہ والوں نے "بیعت" کے مسنون طریقے کو مسخ کر کے مقدس غلامی کا وہ طوق مسلمانوں کی گردن میں ڈالا جس سے زیادہ سخت اور بھاری طوق انسان نے انسان کے لیے کبھی ایجاد نہ کیا ہوگا۔ جب غیر اللہ کے سامنے زمین تک سر جھکنے لگیں، جب غیر اللہ کے آگے نماز کی طرح ہاتھ باندھے جانے لگیں، جب انسان کے سامنے نظر اٹھا کر دیکھنا سوءِ ادبی ہو جائے۔ جب انسان کے ہاتھ اور پاؤں چومے جانے لگیں، جب انسان انسان کا خداوند اور مالک اور اَن داتا بن جائے۔ جب انسان بذات خود امر و نہی کا مختار اور کتاب اللہ اور سنّت رسول اللہ کی سند سے بے نیاز قرار دیا جائے۔ جب انسان خطا سے پاک اور نقص سے بری اور عیب سے منزّہ سمجھ لیا جائے۔ جب انسان کا حکم اور اس کی رائے اعتقاداً نہ سہی عملاً اس طرح واجب الاطاعت قرار دے لی جائے جس طرح خدا کا حکم واجب الاطاعت ہے تو پھر سمجھ لیجیے کہ اس دعوت سے منہ موڑ لیے گئے جو اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰہُ وَلَا نُشۡرِکَ بِہٖ شَیۡئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعۡضُنَا بَعۡضًا اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ کے الفاظ میں دی گئی تھی۔ اس کے بعد کوئی علمی، اخلاقی روحانی ترقی ممکن ہی نہیں۔ پستی اور زوال اسی کا لازمی نتیجہ ہے۔

تفہیمات اول ۸۹، ۹۰

علاج ضعفِ یقین ان سے ہو نہیں سکتا
غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق!

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کا سواد اعظم اب بھی اسلام کی صداقت

خالص حلال کی روٹی تقریباً محال ہے ۔ مگر میں نے وسائل رزق کے معاملہ میں حلال و حرام کی تمیز پر اپنے مضامین میں بار بار جو زور دیا ہے اس سے میرا مقصود یہ نہیں تھا کہ حلال ذرائع یہیں کہیں موجود ہیں ۔لوگ حرام ذرائع کو چھوڑ کر ان کو حاصل کر لیں بلکہ اس سے میرا مقصود یہ تھا کہ حلال و حرام کی تمیز پیدا ہو جانے کے بعد ایک سچا مسلمان جب اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے گا ۔ تب اس کو صحیح اندازہ ہوگا کہ اس کفر کے تسلّط کی بدولت وہ کس طرح چاروں طرف سے گندگیوں اور نجاستوں میں گھر گیا ہے ۔پھر اگر واقعی وہ پاکیزگی کا خواہاں ہو تو اس کے اندر اس نجاست خیز نظام کو مٹانے اور بدلنے کا شدید جذبہ پیدا ہوگا اور وہ ہر آن اس نظام سے سخت نفرت و کراہت کرے گا ۔

اس اصولی بات کو سمجھ لینے کے بعد عملی نقطۂ نظر سے ہمارے لیے اگر کچھ ممکن ہے تو صرف یہ کہ زیادہ حرام کو چھوڑ کر کم حرام یا ملوّث بہ حرام رزق کو مجبوراً گوارا کریں ۔ خالص حلال کی قید کے ساتھ زندگی کا سامان بہم پہنچانا، اس نظام کے اندر رہتے ہوئے ممکن نہیں ہے ۔ اب یہ آپ کے حالات پر اور آپ کی قوتوں اور صلاحیتوں پر منحصر ہے کہ عملاً کون سے ذرائع آپ اختیار کر سکتے ہیں جن میں حرام کی آمیزش کم سے کم ہو ۔ اور آپ موجودہ کافرانہ نظام کے بقا و استحکام میں کم سے کم مددگار بنیں ۔ عملاً اس میں کامیابی کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ آپ اپنے معیار زندگی کو بدلنے کے لیے تیار ہو جائیں ۔ میں نے دیکھا ہے کہ بہت سے لوگ جن کے اندر حلال و حرام کی تمیز پیدا ہو چکی ہے ۔ یہ شرط لگاتے ہیں کہ حلال تو ملے مگر زندگی کا معیار وہی رہے جو حرام خوری کے زمانے میں ہم نے اختیار کیا تھا ۔ یہ شرط مجبوراً اسی حرام خوری میں مبتلا رکھتی ہے ۔ حلال خوری پر آدمی قایم اسی وقت رہ سکتا ہے جب کہ وہ اس امر کا فیصلہ کر لے کہ کھانا بہر حال حلال ہے قطع نظر اس سے کہ وہ پلاؤ ہو یا چٹنی، پہننا بہر حال حلال ہے خواہ وہ نفیس کپڑے ہوں یا ٹاٹ کا پیوند لگا ہوا گاڑھا ۔

رسائل مسائل اول ۹۲، ۹۳

عام حرّیت کا دیکھا تھا جو خواب اسلام نے
اے مسلمان آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

تقریباً تین صدیوں تک تحقیق و اجتہاد اور حرّیت فکر و نظر اور آزادانہ طلب حق

کی وہ اسپرٹ مسلمانوں میں پوری شان کے ساتھ باقی رہی جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے متبعین میں پیدا کر گئے تھے ۔ اس کے بعد امرا و حکام اور علما و مشائخ کے استبداد نے اس روح کو کھانا شروع کر دیا ۔سوچنے والے دماغوں سے سوچنے کا حق اور دیکھنے والی آنکھوں سے دیکھنے کا حق اور بولنے والی زبانوں سے بولنے کا حق سلب کر لیا گیا ۔درباروں سے لے کر مدرسوں اور خانقاہوں تک ہر جگہ مسلمانوں کو غلامی کی باقاعدہ تربیت دی جانے لگی ۔ دل و دماغ کی غلامی، روح و جسم کی غلامی ان پر پوری طرح مسلّط ہو گئی ۔ دربار والوں نے اپنے سامنے رکوع اور سجدے کرا کے غلامانہ ذہنیت پیدا کی ۔مدرسے والوں نے خدا پرستی کے ساتھ اکابر پرستی کا زہر دماغوں میں اتارا ۔ خانقاہ والوں نے "بیعت" کے مسنون طریقے کو مسخ کر کے مقدس غلامی کا وہ طوق مسلمانوں کی گردن میں ڈالا جس سے زیادہ سخت اور بھاری طوق انسان نے انسان کے لیے کبھی ایجاد نہ کیا ہوگا ۔ جب غیر اللہ کے سامنے زمین تک سر جھکنے لگیں، جب غیر اللہ کے آگے نماز کی طرح ہاتھ باندھے جانے لگیں، جب انسان کے سامنے نظر اٹھا کر دیکھنا سوءِ ادبی ہو جائے ۔جب انسان کے ہاتھ اور پاؤں چومے جانے لگیں، جب انسان انسان کا خداوند اور مالک اور اَن داتا بن جائے ۔ جب انسان بذات خود امر و نہی کا مختار اور کتاب اللہ اور سنّت رسول اللہ کی سند سے بے نیاز قرار دیا جائے ۔ جب انسان خطا سے پاک اور نقص سے بری اور عیب سے منزّہ سمجھ لیا جائے ۔ جب انسان کا حکم اور اس کی رائے اعتقاداً نہ سہی عملاً اس طرح واجب الاطاعت قرار دے لی جائے جس طرح خدا کا حکم واجب الاطاعت ہے تو پھر سمجھ لیجیے کہ اس دعوت سے منہ موڑ لیے گئے جو اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کے الفاظ میں دی گئی تھی ۔اس کے بعد کوئی علمی، اخلاقی روحانی ترقی ممکن ہی نہیں ۔پستی اور زوال اسی کا لازمی نتیجہ ہے ۔

تفہیمات اول ۸۹، ۹۰

علاج ضعفِ یقین ان سے ہو نہیں سکتا
غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق!

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کا سواد اعظم اب بھی اسلام کی صداقت

پر ایمان رکھتا ہے اور مسلمان رہنا چاہتا ہے لیکن دماغ مغربی افکار اور مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر اسلام سے منحرف ہو رہے ہیں اور یہ انحراف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ سیاسی غلبہ و استیلائے سے قطع نظر مغرب کا علمی و فکری داب و تسلّط دنیا کی ذہنی فضا پر چھایا ہوا ہے اور اس نے نگاہوں کے زاویے اس طرح بدل دیے ہیں کہ دیکھنے والوں کے لیے مسلمان کی نظر سے دیکھنا اور سوچنے والوں کے لیے اسلامی طریق پر سوچنا مشکل ہو گیا ہے۔ یہ اشکال اس وقت تک دور نہ ہو گا جب تک مسلمانوں میں آزاد اہل فکر پیدا نہ ہوں گے اسلام میں ایک نشاۃ جدیدہ (Renaissance) کی ضرورت ہے۔ پرانے اسلامی مفکرین و محققین کا سرمایہ اب کام نہیں دے سکتا۔ دنیا اب آگے بڑھ چکی ہے اس کو اب الٹے پاؤں ان منازل کی طرف واپس لے جانا ممکن نہیں ہے جن سے وہ چھ سو برس پہلے گزر چکی ہے۔ علم و عمل کے میدان میں رہنمائی وہی کر سکتا ہے جو دنیا کو آگے کی جانب چلائے نہ کہ پیچھے کی جانب۔ لہذا اب اگر اسلام دوبارہ دنیا کا رہنما بن سکتا ہے تو اس کی بس یہی ایک صورت ہے کہ مسلمانوں میں ایسے مفکر و محقق پیدا ہوں جو فکر و نظر اور تحقیق و اکتشاف کی قوت سے ان بنیادوں کو ڈھا دیں جن پر مغربی تہذیب کی بنیاد قائم ہوئی ہے۔ قرآن کے بتائے ہوئے طریق فکر و نظر پر آثار کے مشاہدے اور حقایق کی جستجو سے ایک نئے نظام فلسفہ کی بنا رکھیں جو خالص اسلامی فکر کا نتیجہ ہو۔ ایک نئی حکمت طبیعی Natural Science کی عمارت اٹھائیں جو قرآن کی ڈالی ہوئی داغ بیل پر اٹھے ملحدانہ نظریہ کو توڑ کر الٰہی نظریہ پر فکر و تحقیق کی اساس قائم کریں اور جدید فکر و تحقیق کی عمارت کو اس قوت کے ساتھ اٹھائیں کہ وہ تمام دنیا پر چھا جائے اور دنیا میں مغرب کی مادّی تہذیب کے بجائے اسلام کی حقانی تہذیب جلوہ گر ہو۔

تنقیحات ۱۹ ۲۰

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

(حسین احمد)

متحدہ قومیت اور اسلام

اس عنوان سے جناب مولانا حسین احمد صاحب صدر دار العلوم دیوبند کا ایک رسالہ حال میں شائع ہوا ہے۔ ایک نامور عالم دین اور ہندوستان کی سب سے بڑی دینی درسگاہ کے صدر ہونے کی حیثیت سے مصنّف کا جو مرتبہ ہے اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمیں توقع تھی کہ اس رسالہ میں "قومیت" کے اہم اور نہایت پیچیدہ مسئلہ کی تنقیح و تحقیق خالص علمی طریقہ پر کی گئی ہو گی اور اس باب میں اسلام کا نقطۂ نظر پوری طرح واضح کر دیا گیا ہو گا لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے رسالہ کو اپنی توقعات سے اور مصنف کی ذمہ دارانہ حیثیت سے بہت فروتر پایا۔ یہ ایسا زمانہ ہے جس میں جاہلی تصورات نے ہر طرف سے اسلامی حقایق پر نرغہ کر رکھا ہے اور اسلام اپنے گھر ہی میں غریب ہو رہا ہے۔ خود مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ وہ خالص اسلامی نگاہ سے مسائل کو نہیں دیکھتے اور کمیٔ علم کی وجہ سے نہیں دیکھتے پھر قومیت کا مسئلہ اتنا اہم ہے کہ اس کے صاف اور واضح فہم و ادراک ہی پر ایک قوم کی زندگی کا مدار ہوتا ہے اگر کوئی قوم اپنی قومیت کے اساسیات ہی کو اجنبی اصول و مبادی میں خلط ملط کر دے تو وہ قوم سرے سے قوم ہی نہیں رہ سکتی۔ ایسے نازک مسئلہ پر قلم اٹھاتے ہوئے مولانا حسین احمد صاحب جیسے شخص کو اپنی ذمہ داری کا پورا احساس ہونا چاہیے تھا اس لیے کہ وہ امانت انبیا کے امین ہیں اور جب اسلامی حقایق جاہلیت کے گرد و غبار میں چھپ رہے ہوں تو یہ انہی جیسے لوگوں کا کام ہے کہ انھیں صاف اور منقح کر کے روشنی میں لائیں، انھیں یہ سمجھنا چاہیے تھا کہ اس فتنہ کے دور میں ان کی ذمہ داری عام مسلمانوں کی ذمہ داری سے زیادہ سخت ہے اور اگر مسلمان کسی گمراہی میں

مبتلا ہوں تو سب سے بڑھ کر وہی ماخوذ ہونے والے ہیں لیکن ہمیں پھر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا کا یہ رسالہ اس ذمہ داری کے احساس سے بالکل خالی ہے۔

غیر علمی زاویۂ نظر

ایک مصنّف کی تصنیف میں سب سے پہلے جس چیز کو تلاش کرنا چاہیے وہ اس کا زاویۂ نظر ہے، اس لیے کہ اپنے موضوع کے ساتھ مصنّف کا برتاؤ اور اس کا صحیح یا غلط نتائج پر پہنچنا، تمامتر اس کے زاویۂ نظر ہی پر منحصر ہوتا ہے۔ سیدھا اور صحیح زاویۂ نظر یہ ہے۔ کہ آدمی محض امرِ حق کا طالب ہو اور اس مسئلے کو جیسا کہ وہ فطرۃً و حقیقتاً ہے اس کے اصلی رنگ میں دیکھے، اور حقیقت کا یہ مشاہدہ جس نتیجہ پر بھی پہنچاتا ہو اس پر پہنچ جائے بلا اس لحاظ کے وہ کسی کے خلاف پڑتا ہے اور کسی کے موافق۔ یہ بحث و تحقیق کا فطری اور علمی زاویۂ نظر ہے اور اسلامی زاویۂ نظر بھی اس کے سوا کوئی نہیں کہ اسلام کی روح ہی الحب فی اللہ والبغض فی اللہ ہے۔ اس سیدھے زاویہ نظر کے علاوہ بہت سے ٹیڑھے زاویۂ ہائے نظر بھی ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ آپ کسی کی محبت میں مبتلا ہیں۔ اس لیے صرف اس نتیجہ پر جانا چاہتے ہیں جو اس کے موافق ہو۔ دوسرا یہ کہ آپ کو کسی سے بغض و عداوت ہے اس لیے آپ کو تلاش صرف انہی چیزوں کی ہے جو آپ کے مبغوض کی مخالف ہوں اس قسم کے ٹیڑھے زاویے جتنے بھی ہیں سب کے سب خلاف حق ہیں۔ انھیں اختیار کر کے کوئی بحث کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتی کسی عالم اور متقی انسان کے لیے یہ زیبا نہیں کہ ایسے کسی زاویہ سے کسی مسئلہ پر نگاہ ڈالے، اس لیے کہ یہ اسلامی نہیں بلکہ جاہلی زاویۂ نظر ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ مولانا نے اس رسالہ میں کونسا زاویۂ نظر اختیار فرمایا ہے اپنی بحث کے آغاز میں وہ فرماتے ہیں :۔

”ضروری معلوم ہوا کہ ان غلطیوں کا ازالہ کردوں جو اس قسم کی قومیت متحدہ سے مخالف اور اس کے خلاف دیانت قرار دینے کے متعلق شائع ہوئی ہیں یا شائع کی جا رہی ہیں۔ کانگریس ۱۸۸۵ء سے اہل ہندوستان سے بنا پر وطنیت اس اتحاد قومی کا مطالبہ کرتی ہوئی بیش از بیش جد و جہد عمل میں لا رہی ہے اور اس کے

مقابل و مخالف قوتیں اس کے غیر قابل قبول ہونے بلکہ ناجائز اور حرام ہونے کی انتہائی کوششیں عمل میں لا رہی ہیں، یقیناً برٹش شہنشاہیت کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی خطرناک چیز نہیں ہے۔ یہ چیز میدان میں آج سے نہیں بلکہ تقریباً ۱۸۵۷ء یا اس سے پہلے لائی گئی ہے اور مختلف عنوانوں سے اس کی وحی ہندوستانیوں کے دل و دماغ پر عمل میں لائی جاتی ہے (صفحہ ۵ - ۶)

پھر چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں :۔

”اگرچہ بہت سے لوگوں سے جن کو برطانیہ سے گہرا تعلق ہے یا جن کے دماغ اور قلب برطانوی مدبرین کے سحر سے ماؤف ہو چکے ہیں امید نہیں ہے کہ وہ اس کو قبول کریں گے۔“

اسی سلسلہ میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان کی ہستی کوئی معمولی ہستی نہ تھی، وہ ایسے اور ایسے تھے مگر باوجود کمالاتِ گوناگوں کے ساحرین برطانیہ کے سحر میں مبتلا ہو گئے تھے۔“

پھر ایک طویل بحث کے بعد اپنے زاویۂ نظر کا صاف صاف اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

”ہندوستانیوں کا وطنیت کی بنا پر متحدہ قومیت بنا لینا انگلستان کے لیے جس قدر خطرناک ہے۔ وہ ہماری اس شہادت سے ظاہر ہے جو ہم نے پرفیسر سیلے کے مقالہ سے نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جذبہ ضعیف سے ضعیف بھی اگر ہندوستانیوں میں پیدا ہو جائے تو اگرچہ ان میں انگریزوں کے نکالنے کی طاقت موجود نہ بھی ہو مگر فقط اس وجہ سے کہ ان میں یہ خیال جاگزیں ہو جائے گا کہ اجنبی قوم کے ساتھ ان کے لیے اشتراک عمل شرمناک امر ہے، انگریزی شہنشاہیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔“ (صفحہ ۳۸)

آگے چل کر ایک حیرت انگیز رائے کا اظہار فرماتے ہیں جسے پڑھ کر آدمی ششدر رہ جاتا ہے کہ کیا یہ کسی متقی عالم کی تحریر ہو سکتی ہے :۔

”اگر قومیت ایسی ہی ملعون اور بدترین چیز ہے تو چونکہ یورپ نے اس کو استعمال کر کے اسلامی بادشاہوں اور عثمانی خلافت کی جڑ کھود دی ہے، مسلمانوں کو چاہیے

تھا کہ اسی ملعون ہتھیار کو برطانیہ کی جڑ کھودنے کے لیے استعمال کرتے۔" (صفحہ ۳۸)

اسی بحث کے دوران میں مولانا پہلے تو اس امر کا اعتراف فرماتے ہیں کہ پچھلی دو صدیوں میں مسلمان سلطنتوں کو جس قدر بھی نقصان پہنچا ہے اسی وجہ سے پہنچا ہے۔ یورپ نے اسلامی وحدت کے خلاف سخت پروپیگنڈہ کیا اور مسلمانوں میں نسلی، وطنی، لسانی امتیاز پیدا کی کہ "جہاد مذہبی و روحانی نہ ہو بلکہ نسلوں اور اوطانوں کے لیے کیا جائے اور مذہبیت کی اسپرٹ درمیان سے نکال دی جائے" ص ۳۵-۳۶

لیکن امر حق کے اس قدر قریب پہنچ جانے کے بعد پھر وہی برطانیہ کا ہوّا مولانا کے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے اور وہ فرماتے ہیں:-

" افسوس مسلمانوں میں اس وقت کوئی شخص مسلمانوں کی متحدہ قومیت اور الغائے وطنیت، نسل ولسان وغیرہ کا واعظ کھڑا نہ ہوا اور نہ یورپ کے اخبار ورسائل اور لکچراروں کی بے حد و بے شمار آندھیوں کا مقابلہ کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پان اسلام ازم ایک قصہ" پارینہ ہو کر فنا کے گھاٹ اتر گیا اور ممالک اسلامیہ یوربین اقوام کے لیے لقمہ تر بن کر رہ گئے۔ اب جب کہ مسلمانوں کو افریقہ، یورپ، ایشیا وغیرہ میں پارہ پارہ کر کے فنا کی گود میں ڈال دیا گیا ہے تو ہم کو کہا جاتا ہے کہ اسلام صرف ملی اتحاد کی تعلیم دیتا ہے وہ کسی غیر مسلم جماعت سے متحد نہیں ہو سکتا، اور نہ کسی غیر مسلم قوم کے ساتھ متحدہ قومیت بنا سکتا ہے۔" ص ۳۶، ۳۷

مندرجہ بالا عبارات سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا کی نگاہ میں حق و باطل کا معیار صرف برطانیہ بن کر رہ گیا ہے۔ وہ مسئلہ کو نہ تو علمی زاویہ نظر سے دیکھتے ہیں کہ حقایق اپنے اصلی رنگ میں نظر آسکیں، نہ وہ مسلمانوں کی خیر خواہی کے زاویہ نظر سے اس پر نگاہ ڈالتے ہیں کہ جو کچھ مسلمانوں کے لیے زہر ہے وہ انھیں زہر دکھائی دے سکے ان دونوں زاویوں کے بجائے ان پر فقط برطانیہ کی عداوت کا زاویہ نظر مستولی ہو گیا ہے جس کی وجہ سے ہر چیز ان کو تریاق نظر آتی ہے جس کے متعلق کسی طرح ان کو معلوم ہو جائے کہ وہ برطانیہ کے لیے زہر ہے۔ اب اگر کوئی شخص اسی چیز کو مسلمانوں کے لیے زہر سمجھتا ہو اور اس بنا پر اس کی مخالفت کرے تو وہ ان کے نزدیک برطانیہ پرست کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ ان کو مسلمانوں کی زندگی سے اتنی دلچسپی نہیں

جتنی برطانیہ کی موت سے ہے اور جب یہ بات ان کے دل میں بیٹھ چکی ہے کہ "متحدہ قومیت" برطانیہ کے لیے مہلک ہے تو جو شخص اس کی مخالفت کرتا ہے۔ وہ "برطانیہ پرست" کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا ہے۔ خیریت یہ ہوگئی کہ کسی نے مولانا کو برطانیہ کی ہلاکت کا ایک دوسرا نسخہ نہ بتا دیا جو متحدہ قومیت سے بھی زیادہ کارگر ہے، یعنی یہ کہ ہندوستان کی ۳۵ کروڑ آبادی یکبارگی خودکشی کرلے جس سے برطانوی سلطنت آن کی آن میں ختم کی جا سکتی ہے۔ یہ تیر بہدف تدبیر اگر مولانا کے دل میں بیٹھ جاتی تو وہ بے تکلف فرماتے کہ جو شخص ہندوستان کے باشندوں کو خودکشی سے روکتا ہے وہ برطانیہ پرست ہے۔ خودکشی اگرچہ "ملعون" اور "بدترین" فعل سہی مگر جب کہ اس سے برطانیہ کی جڑ کھودی جا سکتی ہے تو فرض ہو جاتا ہے کہ اس فعل قبیح کا ارتکاب کیا جائے! ایسی ہی باتوں سے یہ راز سمجھ آتا ہے کہ دین میں الحب فی اللہ والبغض فی اللہ کو معیار حق کیوں قرار دیا گیا ہے۔ اگر خدا کا واسطہ درمیان سے ہٹ جائے اور بجائے خود کوئی شے محبوب یا مبغوض بن جائے تو عصبیت جاہلیہ کی سرحد شروع ہو جاتی ہے جس میں وہ تمام ذرائع و وسائل جائز کر لیے جاتے ہیں جن سے انسان کے جذبات محبت و عداوت کی تشفی ہو سکے، قطع نظر اس سے کہ وہ قانون الٰہی کے مطابق ہوں یا اس کے خلاف۔ اسی لیے کہنے والے نے کہا کہ ذاتی عداوت تو شیطان سے بھی نہ ہونی چاہیے۔ اس میں بھی خدا کا واسطہ بیچ میں رہنا ضروری ہے ورنہ وہ خود ایک قانون بن جائے گی اور تم شیطان کی دشمنی میں خدا کے حدود توڑو گے یعنی اپنے دشمن شیطان ہی کا کام کرو گے۔

اثبات مدعا کے لیے حقائق سے چشم پوشی

اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ مولانا اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے تاریخ کے مشہور اور بیّن واقعات کو بھی نظر انداز کر جاتے ہیں۔ یورپ جب مسلمانوں میں نسلی، وطنی، اور لسانی قومیتوں کی تبلیغ کر رہا تھا تو کیا مسلمانوں میں کوئی اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کھڑا نہیں ہوا؟ کیا ٹیپو سلطان، جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ، مصطفےٰ کامل مصری، امیر شکیب ارسلان، انور پاشا، جلال نوری بے، شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، محمود الحسن، محمد علی، شوکت علی، اقبال، ابوالکلام مرحوم کسی کا نام بھی

مولانا نے نہیں سنا؟ کسی کے کارنامے ان تک نہیں پہنچے ؟ کیا ان میں سے کسی نے بھی مسلمانوں کو متنبہ نہیں کیا کہ یہ جاہلیت کی تفریق تم کو تباہ کرنے کے لیے برپا کرائی جا رہی ہے ؟ شاید مولانا ان سوالات کا جواب نفی میں نہ دیں گے مگر وہ ان سب واقعات کی طرف سے آنکھیں بند کر کے فرماتے ہیں کہ "افسوس مسلمانوں میں اس وقت کوئی مسلمانوں کی متحدہ قومیت کا واعظ کھڑا نہ ہوا" ——— ایسا غلط دعویٰ کرنے کی آخر ضرورت کیا تھی ؟ مقصود صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ پہلے مسلمانوں کی قومی وحدت برطانوی مفاد کے خلاف تھی اس لیے سب مسلمان نسلی، وطنی اور لسانی امتیازات پھیلانے میں لگے ہوئے تھے اور اب اسلامی وحدت برطانوی اغراض کے لیے مفید ہو گئی ہے، اس لیے اس کا وعظ ابھی ابھی شروع ہوا ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ وطن پرستی کے مخالف سب کے سب برطانیہ پرست ہیں اور محض ساحر برطانیہ کا سحر ان کے اندر بول رہا ہے۔

یہ ہے نتیجہ عصبیت جاہلیہ کا۔ چونکہ حق و باطل کا معیار "برطانیہ" ہو گیا ہے۔ اس لیے خلاف واقعہ باتوں کی تصنیف بھی جائز ہو گئی اگر ان سے برطانیہ کے خلاف کوئی کام لیا جا سکے۔

یہی ذہنیت ہے جو ہمیں پورے رسالہ میں کارفرما نظر آتی ہے۔ لغت کو، آیات قرآنی کو، اخبار و احادیث کو، تاریخی واقعات کو غرض ہر چیز کو توڑ مروڑ کر اپنا مدعا ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ہر اس چیز کو بلا تکلف نظر انداز کر دیا گیا ہے جو مدعا کے خلاف ہو، چاہے وہ کیسی ہی ظاہر و باہر حقیقت کیوں نہ ہو، حد یہ ہے کہ لفظی مغالطے دینے اور قیاس مع الفارق اور بنائے فاسد علی الفاسد کا ارتکاب کرنے میں بھی تامل نہیں فرمایا گیا ایک عالم اور متقی عالم کا یہ کارنامہ دیکھ کر آدمی انگشت بدنداں رہ جاتا ہے کہ اسے کیا کہیے۔

قومیں اوطان سے کہاں بنتی ہیں؟

مولانا فرماتے ہیں کہ فی زمانہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں لیکن یہ ایک قطعی اور سراسر بے بنیاد دعویٰ ہے۔ پوری انسانی تاریخ سے ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں جا سکتی کہ کوئی قوم محض وطن سے بنی ہو۔ آج اس زمانہ میں بھی دنیا کی تمام قومیں مولانا کے سامنے موجود ہیں۔ وہ فرمائیں کہ ان میں سے کون سی قوم وطن سے بنی ہے؟ کیا امریکہ کے حبشی

اور ریڈ انڈین اور سفید فام ایک قوم ہیں؟ کیا جرمنی کے یہودی اور جرمن ایک قوم ہیں؟ کیا پولینڈ، روس، ٹرکی، بلغاریہ، یونان، یوگوسلاویہ، چیکوسلواکیہ، لتھوانیا، فن لینڈ کسی جگہ بھی خاک وطن کے اشتراک نے ایک قوم بنائی ؟ کیا انگلستان، فرانس، اٹلی اور جاپان میں وحدت کا رنگ محض خاک وطن نے پیدا کیا؟ کیا ڈیڑھ کروڑ سے زیاد یہودی جو روئے زمین کے اطراف و اکناف میں منتشر ہیں کسی جگہ بھی وطنی قومیت میں جذب ہو گئے ہیں؟ کیا یورپ کے مختلف ممالک میں جرمن، مگیار، سلاق، مورادین وغیرہ مختلف قومی اقلیتیں کسی جگہ بھی وطنی رشتۂ اشتراک میں گم ہوئیں؟ واقعات تو بہرحال واقعات ہیں۔ آپ ان کو اپنی خواہشات کا تابع نہیں بنا سکتے۔ آپ کو یہ کہنے کا حق ہے، اگر آپ ایسا کہنا چاہیں کہ اب قوموں کو اوطان سے بننا چاہیے لیکن آپ کو ثبوت اور شہادت سے بے نیاز ہو کر دنیا کو یہ غلط خبر دینے کا کیا حق ہے کہ اب قومیں اوطان سے بننے لگی ہیں؟ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔

اس میں شک نہیں کہ ایک ملک کے باشندوں کو باہر والے ان کے ملک کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ مثلاً امریکن خواہ حبشی ہو یا فرنگی، باہر والے اس کو امریکن ہی کہیں گے مگر کیا اس سے یہ حقیقت بدل جاتی ہے کہ امریکہ میں یہ دو الگ الگ قومیں ہیں نہ کہ ایک قوم؟ یہ بھی صحیح ہے کہ بین الاقوامی تعلقات میں ایک شخص اصطلاحاً اس سلطنت کا "نیشنل" کہلاتا ہے جس کی وہ رعایا ہو مثلاً اگر مولانا حسین احمد صاحب بیرون ہند تشریف لے جائیں تو ان کو "برٹش نیشنلٹی" (برطانوی قومیت) سے منسوب کیا جائے گا۔ لیکن کیا یہ اصطلاحی قومیت حقیقت میں بھی مولانا کی قومیت بدل دے گی؟ پھر بھلا علمی حیثیت سے اس استدلال کی کیا وقعت ہو سکتی ہے کہ "اس وطن کے رہنے والے کی حیثیت سے سب (یعنی ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی وغیرہ) ایک ہی قوم شمار ہوتے ہیں؟" شمار ہونے اور فی الواقع ہونے میں بڑا فرق ہے ایک کو دوسرے کے لیے نہ تو دلیل بنایا جا سکتا ہے اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کو فی الواقع وہی ہونا چاہیے جیسے وہ شمار کیے جاتے ہیں۔

لغت اور قرآن سے غلط استدلال

اس کے بعد مولانا لغت عربی کی طرف رجوع فرماتے ہیں اور شواہد سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ عربی زبان میں قوم کے معنی ہیں "مردوں کی جماعت"

یا "مردوں اور عورتوں کا مجموعہ" یا " ایک شخص" کے اقربا" یا " دشمنوں کی جماعت" اس کا ثبوت انھوں نے آیات قرآنی سے بھی پیش فرمایا ہے۔ مثلاً وہ آیات جن میں کفار کو نبی کی یا مسلمانوں کی" قوم" قرار دیا گیا ہے جو صریحًا تیسرے اور چوتھے معنی پر دلالت کرتا ہے۔ یا وہ آیات جن میں لفظ" قوم" پہلے یا دوسرے معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ لیکن اس پوری بحث میں مولانا کو ایک مرتبہ بھی یہ خیال نہ آیا کہ اس وقت جو بحث درپیش ہے وہ لفظ قوم کے لغوی معنی یا قدیم معنی سے متعلق نہیں ہے بلکہ موجودہ زمانہ کی اصطلاح سے تعلق رکھتی ہے۔ جواہر لال اور سید محمود لغت عرب اور قرآنی زبان میں کلام نہیں کرتے۔ نہ کانگریس کی کارروائیوں میں یہ پرانی زبان استعمال ہوتی ہے۔ ان کے الفاظ کا وہی مفہوم ہے اور وہی ہو سکتا ہے جو آج کل ان سے مراد لیا جاتا ہے۔ آج کل اردو زبان میں" قوم" اور" قومیت" کے الفاظ انگریزی زبان کے الفاظ Nation اور Nationality کے مقابلہ میں بولے جاتے ہیں۔ جن کی تشریح لارڈ برائس نے اپنی کتاب" بین الاقوامی تعلقات" International Relations میں بدیں الفاظ کی ہے :-

" ایک قومیت سے مراد اشخاص کا ایسا مجموعہ ہے جس کو چند مخصوص جذبات (Sentiments) نے ملا کر باہم مربوط کر دیا ہو۔ ان میں بڑے اور طاقتور جاذبے تو دو ہیں۔ ایک جاذبۂ نسل دوسرا جاذبۂ دین لیکن ایک مشترک زبان کے استعمال اور مشترک لٹریچر سے دلچسپی اور زمانہ ماضی کے مشترک کارناموں اور مشترک مصائب کی یاد اور مشترک رسوم وعوائد، مشترک تخیلات و افکار اور مشترک مقاصد اور حوصلوں کا بھی اس احساس جمعیت کی پیدائش میں بہت کچھ دخل ہوتا ہے۔ کبھی یہ سب رابطے یکجا موجود ہوتے ہیں اور مجموعہ افراد کو بستہ و پیوستہ رکھتے ہیں اور کبھی ان میں سے بعض رابطے موجود نہیں ہوتے لیکن قومیت پھر بھی موجود ہوتی ہے"

صـ ۱۱۷۔

اس کی تشریح" اخلاق و ادیان کی دائرۃ المعارف (Encyclopedia of Religion and Ethics) میں یوں کی گئی ہے :-

" قومیت وہ وصف عام یا متعدد اوصاف کا ایسا مرکب ہے جو ایک گروہ کے افراد میں مشترک ہو اور ان کو جوڑ کر ایک قوم بنا دے ۔ . . . ہر ایسی جماعت

ان افراد پر مشتمل ہوتی ہے جو نسل، مشترک روایات ، مشترک مفاد، مشترک عادات و رسوم اور مشترک زبان کے رابطوں سے باہم مربوط ہوتے ہیں اور ان سب سے اہم رابطہ ان کے درمیان یہ ہوتا ہے کہ وہ باہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، بلا ارادہ ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں اور ان کے درمیان مختلف حیثیات سے الفت و موانست ہوتی ہے۔ غیر قوم کا آدمی ان کو غیر اور اجنبی محسوس ہوتا ہے اس لیے کہ اس کی دلچسپیاں اور اس کی عادات انھیں نرالی معلوم ہوتی ہے اور ان کے لیے اس کے اندر طبیعت اور اس کے خیالات و جذبات کو سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے قدیم زمانے کے لوگ غیر قوم والوں کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے اور اسی وجہ سے آج کا مہذب آدمی بھی غیر قوم والوں کی عادات اور طرز زندگی کو اپنے مذاق کے خلاف پا کر ناک بھوں چڑھاتا ہے"۔

کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ قرآن مجید نے اس معنی میں کفار و مشرکین اور مسلمانوں کا ایک قومیت میں جمع ہونا جائز رکھا ہے ؟ یا کوئی نبی دنیا میں کبھی اس غرض کے لیے بھی بھیجا گیا ہے کہ مومن اور غیر مومن سب کو اس معنی میں ایک بنائے؟ اگر نہیں تو یہ فضول لغوی بحث آخر کیوں چھیڑی جاتی ہے؟ لفظ اپنے معنی تاریخ کے دوران میں بارہا بدلتا ہے۔ کل ایک لفظ کسی معنی میں استعمال ہوتا تھا آج کسی اور معنی میں ہوتا ہے۔ اب یہ لفظی مغالطہ نہیں تو اور کیا ہے کہ آپ معنوی تغیرات کو نظر انداز کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائیں کہ قرآن کی رُو سے" قومیت میں اشتراک مسلم اور کافر کا ہو سکتا ہے" درآں حالیکہ قومیت کا جو مفہوم قرآن کی زبان میں تھا اس کو آج کے مفہوم سے ذرّہ برابر کوئی علاقہ نہیں۔ متقدّمین نے" مکروہ" اور" حرام" میں اصطلاحی فرق نہیں کیا تھا اس لیے اکثر مقامات پر ان کی عبارتوں میں مکروہ بمعنی حرام استعمال ہوا ہے۔ لیکن اب جب کہ ممنوعیت کے ان دونوں مدارج کے لیے الگ الگ اصطلاحیں بن چکی ہیں اگر کوئی شخص کسی حرام کو محض مکروہ بمعنی اصطلاحی ٹھہرائے اور حجّت کے طور پر سلف کی کوئی عبارت پیش کرے تو کیا یہ مغالطہ کے سوا کچھ اور ہوگا؟ اسی طرح لفظ قومیت بھی اب اصطلاح بن چکا ہے اب مسلم و کافر کے لیے مشترک قومیت کا لفظ استعمال کرنا اور معترض کا منہ بند کرنے کے لیے اس لفظ کے پرانے استعمالات کو

حجت میں پیش کرنا بھی محض ایک مغالطہ ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔

ایک اور لفظی مغالطہ

آگے چل کر مولانا دعویٰ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں یہود اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت بنائی تھی اور اس کے ثبوت میں وہ معاہدہ پیش کرتے ہیں جو ہجرت کے بعد حضور اکرم اور یہودیوں کے درمیان ہوا تھا۔ اس معاہدہ میں کہیں یہ فقرہ مولانا کے ہاتھ آگیا کہ :-

وان یہود بنی عوف امۃ مع المومنین ۔ بنی عوف کے یہودی مسلمانوں کے ساتھ "ایک امت" ہوں گے ۔ بس یہ فقرہ کہ "یہودی اور مسلمان ایک امت ہونگے" یہ دعویٰ کرنے کے لیے کافی سمجھ لیا گیا کہ آج بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کی متحدہ قومیت بن سکتی ہے لیکن یہ پھر لفظی مغالطہ ہے۔ لغت عرب میں امت سے مراد وہ جماعت ہے جس کو کوئی چیز جمع کرتی ہو، عام اس سے کہ وہ زمانہ ہو، مقام ہو، دین ہو یا کوئی اور چیز۔ اس لحاظ سے اگر دو مختلف قومیں کسی ایک مشترک مقصد کے لیے عارضی طور پر متفق ہوجائیں تو ان کو بھی ایک امت کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ صاحب لسان العرب لکھتے ہیں :-

وقولہ فی الحدیث ان یہود بنی عوف امۃ المومنین یرید انھم بالصلح الذی وقع بینھم و بین المومنین لجماعۃ منھم کلمتھم وایدیھم واحدۃ

حدیث میں رسول اللہ کا یہ ارشاد کہ ان یہود بنی عوف امۃ من المومنین، اس سے مراد یہ ہے کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان جو صلح واقع ہوئی ہے اس کی وجہ سے گویا مسلمانوں ہی کی ایک جماعت ہوگئے اور ان کا معاملہ واحد ہے"۔

اس لغوی "امت" کو آج کی اصطلاحی "متحدہ قومیت" سے کیا واسطہ؟ زیادہ سے زیادہ اس کو آج کل کی سیاسی زبان میں فوجی اتحاد Military Alliance کہہ سکتے ہیں یہ محض ایک تحالف تھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہود اپنے دین پر اور مسلمان اپنے دین پر رہیں گے، دونوں کی تمدنی و سیاسی ہیئتیں الگ الگ رہیں گی البتہ ایک فریق پر جب کوئی حملہ کرے گا تو دونوں فریق مل کر لڑیں گے اور دونوں اس جنگ

میں اپنا مال خرچ کریں گے۔ دو تین سال کے اندر ہی اس تحالف کا خاتمہ ہو گیا اور مسلمانوں نے کچھ یہودیوں کو جلاوطن کیا اور کچھ کو ہلاک کر دیا۔ کیا اسی کا نام "متحدہ قومیت" ہے؟ کیا کسی معنی میں بھی یہ چیز اس "متحدہ قومیت" . . . . . سے مماثلت رکھتی ہے جو اس وقت معرض بحث میں ہے؟ کیا وہاں کوئی مشترک اسٹیٹ بنایا گیا تھا؟ کیا وہاں کوئی مشترک مجلس قانون ساز بنائی گئی تھی اور یہ طے ہوا تھا کہ یہودی اور مسلمان ایک مجموعہ ہوں گے اور اس مجموعہ میں سے جس کی اکثریت ہوگی وہی مدینہ پر حکومت کرے گا اور اسی کے منظور کیے ہوئے قوانین مدینہ میں نافذ ہوں گے؟ کیا وہاں مشترک عدالتیں قائم ہوئی تھیں جن میں یہودیوں اور مسلمانوں کے قضایا کا یکجا اور ایک ہی ملکی قانون کے تحت فیصلہ ہوتا ہو؟ کیا وہاں کوئی وطنی کانگریس بنائی گئی تھی جس میں یہودی اکثریت کا منتخب کیا ہوا ہائی کمانڈ اپنی انگلیوں پر یہودی اور مسلمان سب کو رقص کراتا ہو؟ کیا وہاں رسول اللہؐ سے معاہدہ کرنے کے بجائے کعب بن اشرف اور عبداللہ بن اُبی براہ راست افراد مسلمین سے ماس کانٹیکٹ کرنے آئے تھے؟ کیا وہاں بھی وردھا اسکیم کے طرز کی کوئی تعلیمی اسکیم تصنیف کی گئی تھی کہ مسلمان اور یہودی بچے ایک مشترک سوسائٹی بنانے کے لیے تیار کیے جائیں اور ان کو یہودیت اور اسلام کی صرف مشترک سچائیاں ہی پڑھائی جائیں؟ کیا وہاں بھی کسی ابو رافع نے کوئی "صومعہ اسکیم" تمام اہل مدینہ کے لیے بنائی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تعلیمی صومعوں میں مسلمان بچوں کو بھیجا جانا قبول فرما لیا تھا؟ مولانا آخر فرمائیں تو کہ جس "متحدہ قومیت" کو وہ رسول خدا کی طرف منسوب فرما رہے ہیں اس میں آج کل کی "متحدہ قومیت" کے عناصر ترکیبی میں کون سا عنصر پایا جاتا تھا؟ اگر وہ کسی ایک عنصر کا پتہ نہیں دے سکتے۔ اور میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہرگز نہیں دے سکتے۔ تو کیا مولانا کو خدا کی بازپرس کا خوف نہیں کہ محض امۃ من المومنین یا امۃ مع المومنین کے الفاظ معاہدۂ نبوی میں دیکھ کر وہ مسلمانوں کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ جیسی متحدہ قومیت آج کانگریس بنا رہی ہے، ویسی متحدہ قومیت کل نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی بنا چکے ہیں لہٰذا آؤ اور اطمینان سے اس میں جذب ہو جاؤ؟ الفاظ کا سہارا لے کر مولانا نے اپنا مدعا ثابت کرنے کی کوشش تو بہت خوبی کے ساتھ کر دی مگر انھیں یہ خیال

نہ آیا کہ حدیث کے الفاظ کو مفہوم نبوی کے خلاف کسی دوسرے مفہوم پر چسپاں کرنا اور اس مفہوم کو نبیؐ کی طرف منسوب کر دینا مَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا کی زد میں آجاتا ہے۔ مولانا خود ایک جلیل القدر عالم اور محدث ہیں میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی شخص حدیث عائشہؓ کان النبیؐ یُقبِلُ ویُباشِرُ وَھُوَ صَائِمٌ کے لفظ مباشرت کو اردو کے معروف معنوں میں لے اور اس سے یہ استدلال کرے کہ روزے میں مباشرت کرنا نعوذ باللہ سنّت سے ثابت ہے لہذا اب مسلمانوں کو روزے میں مباشرت کرنی چاہیے تو آپ اس پر کیا حکم لگائیں گے؟ دونوں استدلالوں کی نوعیت ایک ہے لہذا ان کا حکم بھی ایک ہی ہونا چاہیے اور کوئی وجہ نہیں کہ مستدل کی شخصیت کو دیکھ کر اس باب میں رعایت کی جائے، بلکہ اگر مستدل ان لوگوں میں سے ہے جن کی طرف مسلمان اعتماد اور بھروسے کے ساتھ اپنے دین کا علم حاصل کرنے کے لیے رجوع کرتے ہیں تو معاملہ اور زیادہ اشد ہوجاتا ہے جب شفاخانہ ہی سے زہر تقسیم ہونے لگے تو امرت کہاں تلاش کیا جائے؟

مسئلہ قومیت ۶۵ تا ۸۰

فساد قلب ونظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

(مغربی تہذیب)

موجودہ تہذیب میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ خاندانی نظام بری طرح درہم برہم ہو رہا ہے۔ شوہر اور بیوی، ماں باپ اور اولاد، بھائی اور بہن کے رشتے بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔ بھرے گھر برباد ہو رہے ہیں۔ کم سنی کے جرائم بے تحاشا بڑھ رہے ہیں۔ ٹوٹے ہوئے گھروں Broken Homes کے بچے پورے معاشرے کے لیے ایک نفسیاتی مسئلہ بنتے جا رہے ہیں۔ ناجائز بچوں کی ولادت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ طلاق وتفریق کی کثرت نے انسانی معاشرے کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ دیکھنا چاہیے اور انصاف کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے کہ ایک اسلامی معاشرے میں کبھی یہ مسائل اس شکل میں پیدا نہیں ہو سکے۔ آخر کیوں نہ ان قوانین وضوابط کا مطالعہ کیا جاوے جن کی وجہ سے

اس انتہائی تنزل کے دور میں بھی مسلم معاشرہ ان لعنتوں سے پاک ہے۔ علمائے مغرب اس سے سبق لینے کے بجائے ہمارے قوانین نکاح وطلاق اور ہمارے نظام معاشرت پر الٹی نکتہ چینیاں کرتے ہیں اور اپنے شاگردوں کے ذریعہ سے ہمیں بھی وہ بیماریاں لگانے کی کوشش کر رہے ہیں جو ان کے معاشرے کو تباہ کر رہی ہیں حالانکہ انھیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے قوانین اور قواعد کے اندر کیا چیز ایسی ہے جس کی وجہ سے مسلم معاشرے کے اندر خاندانی نظام کی یہ درہمی وبرہمی پیدا نہیں ہوئی۔ ناجائز بچوں کی یہ کثرت نہیں ہوئی۔ طلاقوں کی یہ بھرمار نہیں ہوئی بچوں کے جرائم کا یہ زور نہیں ہوا۔ اولاد اپنے بوڑھے والدین کے لیے اس قدر بے درد نہیں ہوئی اور والدین اپنی اولاد سے اس درجہ بے پروا نہیں ہوئے کہ بچوں سے بڑھ کر ان کو اپنے کتے زیادہ پیارے ہو جائیں۔ تعصّب سے ذہن کو پاک کیا جاتا تو بعید نہ تھا کہ اپنے محدود دائرے سے باہر کی دنیا کو دیکھ کر کوئی مفید سبق حاصل کیا جاتا۔

اس سلسلے میں ایک اور مثال بھی میں پیش کرتا ہوں۔ آج کی دنیا پے در پے لڑائیوں کے چکر میں پھنسی ہوئی ہے۔ دو عظیم اور خوفناک لڑائیاں ہو چکی ہیں اور ایک تیسری لڑائی کا ہر وقت خطرہ ہے۔ چاروں طرف یوں محسوس ہوتا ہے کہ بارود بچھی ہوئی ہے اور دنیا کو بھڑکا دینے کے لیے بس ایک چنگاری کافی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کے موجودہ نظام میں چند بنیادی خرابیاں موجود ہیں۔ جنھوں نے روئے زمین کو آتش فشاں بنا رکھا ہے۔ ان میں سے ایک خرابی یہ حد سے بڑھی ہوئی قوم پرستی ہے جس نے قوموں کو ایک دوسرے سے پھاڑا ہے اور ایک دوسرے کا حریف بنا دیا ہے اور ایک دوسری وہ خرابی وہ تنگ نظری اور تنگ دلی ہے جس کی وجہ سے فتح یاب ہونے کے بعد مفتوح قوم کے ساتھ کبھی فیاضی کا سلوک نہیں کیا جاتا بلکہ اس کو کچلنے اور دبانے اور اس کی عزّت نفس کو ختم کرنے اور مادی حیثیت سے اس کو بالکل برباد کر دینے اور اس کے ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مفتوح قوم کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور ایک جنگ کے ختم ہوتے ہی دوسری جنگ کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ اہل مغرب کو کھلی آنکھوں سے دیکھنا چاہیے کہ کیا کوئی دوسرا معاشرہ ایسا ہے جس کے پاس کوئی ایسی

ہدایت موجود ہو جس کی بدولت اس کے ہاں کبھی جنگ نے یہ شکل اختیار نہیں کی بلاشبہ مسلمانوں کے اندر بھی اسلام کی پوری پیروی نہ کرنے کے باعث بارہا لڑائیاں پیش آئی ہیں۔ غیر مسلموں سے بھی بارہا ان کا مقابلہ ہوا ہے۔ دنیا کے بہت سے ملک انھوں نے بھی فتح کیے ہیں لیکن اگر کوئی شخص انصاف کی نظر سے دیکھے تو اسے نظر آسکتا ہے کہ مسلمانوں کے اندر کبھی نیشنلزم کا وہ اندھا جنون پیدا نہیں ہوا جو مغربی دنیا میں پایا جاتا ہے اور مسلمانوں نے کبھی مفتوحوں کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جو اہل مغرب نے کیا ہے۔ اسپین کو کبھی مسلمانوں نے فتح کیا تھا اور پھر عیسائیوں نے بھی اسے مسلمانوں سے چھینا۔ دونوں فتوحات کے نتائج ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے۔ فلسطین اور بیت المقدس کبھی مسلمانوں سے بھی چھینے گئے تھے اور کبھی مسلمانوں نے بھی ان کو واپس لیا تھا۔ دونوں کا فرق آخر کس کو معلوم نہیں ہے؟ اس فرق کی وجہ تلاش کیجیے۔ کیا اس کی وجہ اس کے سوا بتائی جاسکتی ہے کہ اسلام نے اپنے پیرو انسانوں کو اس قدر وسیع القلب، اس قدر فیاض اور اس قدر غیر قوم پرست بنا دیا ہے جس کے باعث وہ فتحیاب ہونے کے بعد مفتوح قوم کے ساتھ کبھی وہ سلوک نہیں کرتے جو دوسرے لوگ کرتے ہیں اور ان کے اندر قومیت کا وہ جنون کبھی پیدا نہیں ہوتا جو اپنی قوم کے سوا انسان کو ہر دوسری قوم کا دشمن بنا دیتا ہے۔ اسلام کی ان تعلیمات کو کھلے دل سے دیکھنا چاہیے جن کی بدولت مسلمانوں کو یہ نعمت حاصل ہوئی ہے۔ اگر ان کے اندر کوئی بھلائی پائی جائے۔ اگر ان کے اندر کوئی روشنی نظر آئے تو آخر کیوں نہ اس سے رہنمائی حاصل کی جائے؟ انسان اپنا خود دشمن ہوگا اگر کہیں اُسے داروئے شفا ملتی ہو تو وہ صرف اس لیے اس کو لینے سے انکار کر دے کہ یہ اس کے ہاں کی چیز نہیں ہے۔

ماہنامہ زندگی رام پور - اپریل سنہ ۱۹۶۲ء ۳۰، ۳۱

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر

باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے
یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر

ہم پوچھتے ہیں شیخ کلیسا نواز سے
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر

حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات
اسلام کا محاسبہ، یورپ سے درگزر

(جہاد)

عموماً لفظ "جہاد" کا ترجمہ انگریزی زبان میں Holy War "مقدس جنگ"

کیا جاتا ہے اور اس کی تشریح و تفسیر مدت ہائے دراز سے کچھ اس انداز میں کی جاتی رہی ہے کہ اب یہ لفظ "جوش جنوں" کا ہم معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کو سنتے ہی آدمی کی آنکھوں میں کچھ اس طرح کا نقشہ پھرنے لگتا ہے کہ مذہبی دیوانوں کا ایک گروہ ننگی تلوار ہاتھ میں لیے، داڑھیاں چڑھائے، خونخوار آنکھوں کے ساتھ اللہ اکبر کے نعرے لگاتا چلا آرہا ہے، جہاں کسی کافر کو پاتا ہے پکڑ لیتا ہے اور تلوار اس کی گردن پر رکھ کر کہتا ہے کہ بول لا الہ الا اللہ ورنہ ابھی سر تن سے جدا کر دیا جاتا ہے۔ ماہرین نے ہماری یہ تصویر بڑی قلم کاریوں کے ساتھ بنائی ہے اور اس کے نیچے موٹے حرفوں میں لکھ دیا ہے۔

بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

لطف یہ ہے کہ اس تصویر کے بنانے والے ہمارے وہ مہربان ہیں جو خود کئی صدیوں سے انتہا درجہ کی غیر مقدس جنگ Un Holy War میں مشغول ہیں، ان کی اپنی تصویر یہ ہے کہ وہ دولت و اقتدار کے بھوکے ہر قسم کے اسلحہ سے مسلح ہو کر قزاقوں کی طرح ساری دنیا پر پل پڑتے ہیں اور ہر طرف تجارت کی منڈیاں، خام پیداوار کے ذخیرے نوآبادیاں بسانے کے قابل زمینیں اور معدنیات کی کانیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں تاکہ اپنے نفس کی کبھی نہ بجھنے والی آگ کے لیے ایندھن فراہم کریں۔ ان کی جنگ خدا کی راہ میں نہیں بلکہ پیٹ کی راہ میں ہے۔ ہوس اور نفس امارہ کی راہ میں ہے۔ ان کے نزدیک کسی قوم پر حملہ کرنے کے لیے بس یہ کافی وجہ جواز ہے کہ اس کی زمین میں کانیں ہیں یا اجناس کافی پیدا ہوتی ہیں، یا ان کے کارخانوں کا مال وہاں اچھی طرح کھپایا جا سکتا ہے یا اپنی زاید آبادی کو وہاں آسانی کے ساتھ بسایا جا سکتا ہے یا اور کچھ نہیں تو اس قوم کا یہ گناہ بھی کوئی معمولی گناہ نہیں کہ وہ کسی ایسے ملک کے راستہ میں رہتی ہے جس پر یہ پہلے قبضہ کر چکے ہیں یا اب قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے تو جو کچھ کیا وہ زمانۂ ماضی کا قصہ ہے اور ان کے کارنامے حال کے واقعات ہیں جو شب و روز دنیا کی آنکھوں کے سامنے گزر رہے ہیں۔ ایشیا، افریقہ، یورپ، امریکہ غرض کرۂ زمین کا کون سا حصہ ایسا بچا رہ گیا ہے جو ان کی اس غیر مقدس جنگ سے لالہ زار نہیں ہو چکا؟ مگر ان کی مہارت قابل داد ہے۔ انھوں نے ہماری تصویر اتنی بڑی بنائی کہ خود ان کی تصویر اس کے پیچھے چھپ گئی اور سادہ لوحی بھی قابل داد ہے۔ جب ہم نے غیروں کی بنائی ہوئی اپنی یہ تصویر دیکھی تو ایسے

دہشت زدہ ہوئے کہ ہمیں اس تصویر کے پیچھے جھانک کر خود مصوروں کی صورت دیکھنے
کا ہوش ہی نہ آیا اور لگے معذرت کرنے کہ حضور! بھلا ہم جنگ وجدال کیا جانیں، ہم تو
بھکشوؤں اور پادریوں کی طرح پرامن مبلّغ لوگ ہیں۔ مذہبی عقائد کی تردید کرنا اور ان
کی جگہ کچھ دوسرے عقائد لوگوں سے تسلیم کرا لینا، بس یہ ہمارا کام ہے۔ ہمیں تلوار سے
کیا واسطہ؟ البتہ اتنا قصور کبھی کبھار ہم سے ضرور ہوا ہے کہ جب کوئی ہمیں مارنے آیا
تو ہم نے بھی جواب میں ہاتھ اٹھا دیا۔ سو اب تو ہم اس سے بھی توبہ کر چکے ہیں حضور کی طمانیت
کے تلوار والے جہاد کو "سرکاری طور پر" منسوخ کر دیا گیا ہے اب تو جہاد لفظ زبان وقلم
کی کوشش کا نام ہے۔ توپ اور بندوق چلانا سرکار کا کام ہے اور زبان وقلم چلانا
ہمارا کام۔

تفہیمات اول ۵۹، ۶۰

فقیہہ شہر بھی رہبانیت پر ہے مجبور
کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست
(شکست)

۵۲ اور رہبانیت انھوں نے خود ایجاد کر لی، ہم نے اُسے اُن پر فرض نہیں کیا
تھا، مگر اللہ کی خوشنودی کی طلب میں انھوں نے آپ ہی یہ بدعت نکالی۔ ۵۳

---

۵۲ اس کا تلفظ رَہبانیت بھی کیا جاتا ہے اور رُہبانیت بھی۔ اس کا مادّہ
رَہب ہے جس کے معنی خوف کے ہیں۔ رہبانیت کا مطلب ہے مسلک
خوف زدگی، اور رُہبانیت کے معنی ہیں مسلک خوف زدگان۔ اصطلاحاً اس سے
مراد ہے کسی شخص کا خوف کی بنا پر (قطع نظر اس سے کہ وہ کسی کے ظلم کا خوف ہو، یا دنیا کے
فتنوں کا خوف، یا اپنے نفس کی کمزوریوں کا خوف) تارک الدنیا بن جانا اور دنیوی زندگی
سے بھاگ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں پناہ لینا یا گوشہائے عزلت میں جا بیٹھنا۔

۵۳ اصل الفاظ ہیں اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰہِ۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔
ایک یہ کہ ہم نے ان پر اس رہبانیت کو فرض نہیں کیا تھا بلکہ جو چیز ان پر فرض کی تھی وہ یہ
تھی کہ وہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کریں اور دوسرا مطلب یہ کہ یہ

رہبانیت ہماری فرض کی ہوئی نہ تھی بلکہ اللہ کی خوشنودی کی طلب میں انھوں نے اُسے
خود اپنے اوپر فرض کر لیا تھا۔ دونوں صورتوں میں یہ آیت اس بات کی صراحت کرتی ہے
کہ رہبانیت ایک غیر اسلامی چیز ہے اور یہ کبھی دین حق میں شامل نہیں رہی ہے۔
یہی بات ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے کہ "اسلام میں کوئی رہبانیت
نہیں" (مسند احمد) ایک اور حدیث میں حضور نے فرمایا "اس وقت کی رہبانیت
جہاد فی سبیل اللہ ہے۔" (مسند احمد، مسند ابی یعلیٰ)۔ یعنی اس وقت کے لیے
روحانی ترقی کا راستہ ترک دنیا نہیں بلکہ اللہ کی راہ میں جہاد ہے۔ اور یہ امت فتنوں
سے ڈر کر جنگلوں اور پہاڑوں کی طرف نہیں بھاگتی بلکہ راہ خدا میں جہاد کر کے ان کا مقابلہ
کرتی ہے، بخاری ومسلم کی متفق علیہ روایت ہے کہ صحابہ میں سے ایک صاحب نے
کہا میں ہمیشہ ساری رات نماز پڑھا کروں گا۔ دوسرے نے کہا میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا
اور کبھی ناغہ نہ کروں گا۔ تیسرے نے کہا میں کبھی شادی نہ کروں گا اور عورت سے کوئی واسطہ
نہ رکھوں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ باتیں سنیں تو فرمایا "خدا کی قسم میں
تم سے زیادہ اللہ سے ڈرتا اور اس سے تقویٰ کرتا ہوں۔ مگر میرا طریقہ یہ ہے کہ میں
روزہ رکھتا بھی ہوں اور نہیں بھی رکھتا، راتوں کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور
عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں جس کو میرا طریقہ پسند نہ ہو اس کا مجھ سے کوئی واسطہ
نہیں۔" حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔ "اپنے
اوپر سختی نہ کرو کہ اللہ تم پر سختی کرے۔ ایک گروہ نے یہی تشدّد اختیار کیا تھا تو اللہ نے
بھی اسے سخت پکڑا۔ دیکھ لو، وہ ان کے بقایا راہب خانوں اور کنیسوں میں موجود
ہیں۔" (ابو داؤد)

تفہیم القرآن ۳۲۴، ۳۲۵

فریب نظر ہے سکون وثبات   تڑپتا ہے ہر ذرّۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروان وجود   کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
(ساقی نامہ)

۱۔ عالم وجود کے تمام آثار اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ اس نظام کے

جتنے تغیرات و تحولات ہیں ان سب کا رخ ارتقا کی جانب ہے۔ اس کی معیاری گردشوں کا مقصود یہ ہے کہ یہ نقص کو کمال کی طرف لے جائیں اور اشیا کی ناقص صورتوں کو مٹا کر انھیں کامل اور کامل سے کامل تر صورتیں بخشیں۔

۲۔ اس قانون ارتقا کا عمل چونکہ تغیر کی روش پر ہوتا ہے اس لیے ہر کون کے لیے ایک فساد ضروری ہے۔ ایک صورت کا وجود میں آنا اس کا مقتضی ہے کہ پہلی صورت فاسد ہو جائے اور ناقص صورت کا زائل ہونا کامل تر کے وجود میں آنے کا دیباچہ ہوا کرتا ہے۔ یہ تغیرات و استحالات اگرچہ ہر آن ہوتے رہتے ہیں، لیکن بہت سے خفی تغیرات کے بعد ایک جلی اور نمایاں تغیر واقع ہوا کرتا ہے جس میں ایک جلی اور نمایاں فساد پیش آتا ہے۔ یہی دوسری قسم کا فساد ہے جس کو ہم عرف عام میں موت یا زوال سے تعبیر کرتے ہیں اور ایک صورت کے وجود میں آنے سے لے کر اس کی موت یا اس کے قطعی فساد تک ایک وقفہ ہوتا ہے جس کو ہم اپنی زبان میں عمر کہتے ہیں۔

۳۔ ہر صورت اپنے لیے ایک خاص محل چاہتی ہے جو اس کے مناسب حال ہوا کرتا ہے۔ کوئی صورت کسی ایسے محل میں نہیں رہ سکتی جو اس کے لیے مناسب حال نہ ہو۔ مثلاً صورت نباتی کے لیے حیوانی جسم غیر مناسب ہے اور صورت انسانی اسی جسم اور اسی مخصوص طور کے نظام جسمانی کی طالب ہے جو انسان کے لیے بنایا گیا ہے۔ پس اگر کسی شے کو ایک ترقی یافتہ صورت دینی ہو تو لازم ہے کہ فروتر درجہ کی صورت کے لیے جو محل بنایا گیا تھا اس کو توڑ دیا جائے اور نئی صورت کے لیے اس کے مناسب حال محل تیار کیا جائے۔

۴۔ اجزائے عالم کے حق میں قانون ارتقا کی ہمہ گیری کو جس شخص نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے اس کے نزدیک یہ بات ہرگز مستبعد نہیں ہے کہ یہی قانون اس پورے نظام عالم پر بھی حاوی ہو، اس وقت جو نظام عالم ہم دیکھ رہے ہیں، اس کے متعلق ہم نہیں کہہ سکتے کہ جب سے خلق و ابداع کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ اس سے پہلے نہ معلوم کتنے اور نظامات گزر چکے ہوں گے جن میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی عمر پوری کر کے دوسرے ترقی یافتہ نظام کے لیے جگہ خالی کر دی، اور ارتقا کے تدریجی مراتب سے گزر کر سلسلۂ وجود ہمارے اس نظام تک پہنچا۔ اسی طرح یہ نظام بھی کوئی آخری نظام نہیں ہے۔ یہ بھی جب اپنے امکانی کمالات کو پہنچ جائے گا اور کمال کے بالاتر درجہ کو قبول کرنے کی

استعداد اس میں باقی نہ رہے گی تو اس کو توڑ دیا جائے گا اور اس کے بجائے کوئی دوسرا نظام قایم کیا جائے گا جس کے قوانین کچھ اور ہوں گے اور جس میں وجود کے کامل تر مراتب قبول کرنے کی صلاحیت ہوگی۔

اسلامی تہذیب اصول و مبادی ۲۹۳ تا ۲۹۵

فطرت افراد سے اغماز بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف
(دین و تعلیم)

ہماری غلامی کے اسباب

پچھلی صدی میں جو غلامی ہم پر مسلّط ہوئی تھی وہ درحقیقت ہمارے صدیوں کے مسلسل مذہبی اخلاقی، ذہنی انحطاط کا نتیجہ تھی، مختلف حیثیتوں سے ہم روز بروز پستی کی طرف جارہے تھے یہاں تک کہ گرتے گرتے ہم اس مقام پر پہنچ گئے تھے۔ جہاں اپنے بل بوتے پر کھڑا رہنا ہمارے لیے ممکن نہ تھا۔ اس حالت میں کسی نہ کسی بلا کو ہم پر مسلّط ہونا ہی تھا اور ٹھیک قانون قدرت کے مطابق وہ بلا ہم پر مسلط ہوئی۔

دینی حالت

اس کی تحقیق کے لیے سب سے پہلے اپنی اس وقت کی دینی حالت کا جائزہ لینا چاہیے۔ کیونکہ ہمارے لیے سب سے زیادہ اہمیت دین ہی کی ہے۔ وہی ہماری زندگی کا قوام ہے۔ اسی نے ہم کو ایک قوم اور ایک مِلّت بنایا ہے۔ اسی کے بل پر ہم دنیا میں کھڑے ہو سکتے ہیں اور کھڑے رہ سکتے ہیں۔

ہماری پچھلی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ اس ملک میں اسلام کسی منظّم کوشش کے نتیجے میں نہیں پھیلا ہے۔ سندھ کی ابتدائی اسلامی فتح اور اس کے بعد کی ایک صدی کو مستثنا کیا جا سکتا ہے اس کو چھوڑ کر بعد کے کسی دور میں کوئی ایسی منظّم طاقت نہیں رہی جو یہاں ایک طرف اسلام کو پھیلاتی اور جہاں جہاں وہ پھیلتا جاتا وہاں اس

کو جمانے اور مضبوط و مستحکم کرنے کی کوشش بھی ساتھ ساتھ کرتی جاتی۔ بالکل ایک غیر منظم طریقے سے کہیں کوئی صاحب علم آگیا جس کے اثر سے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے، کہیں کوئی تاجر پہنچ گیا جس کے ساتھ ربط ضبط رکھنے کی وجہ سے کچھ لوگوں نے کلمہ پڑھ لیا اور کہیں کوئی نیک نفس اور خدا رسیدہ بزرگ تشریف لے آئے جن کے بلند اخلاق اور پاکیزہ زندگی کو دیکھ کر بہت سے لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ مگر نہ تو ان منفرد افراد کے پاس ایسے ذرائع تھے کہ جن جن لوگوں کو وہ مسلمان کرتے جاتے ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام بھی ساتھ ساتھ کرتے چلے جاتے اور نہ وقت کی حکومتوں کو اس کی کچھ فکر تھی کہ دوسرے اللہ کے بندوں کی کوششوں سے جہاں جہاں اسلام پھیل رہا تھا وہاں لوگوں کی اسلامی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام کر دیتیں۔

اس غفلت کی وجہ سے ہمارے عوام ابتدا سے جہالت اور جاہلیّت میں مبتلا رہے ہیں۔ تعلیمی اداروں سے اگر فائدہ اٹھا ہے تو زیادہ تر متوسّط طبقوں نے اٹھایا ہے یا پھر اونچے طبقوں نے۔ عوام الناس اسلام کی تعلیمات سے بے خبر اور اس کے اصلاحی اثرات سے بڑی حد تک محروم ہی رہے۔ اسی کا نتیجہ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ قبیلے کے قبیلے غیر مسلم قوموں سے نکل کر اسلام میں آئے مگر آج تک ان میں جاہلیت کی وہ بہت سی رسمیں موجود ہیں جو اسلام قبول کرنے سے پہلے ان میں پائی جاتی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ ان کے خیالات تک پوری طرح نہ بدل سکے۔ ان کے اندر آج بھی وہ بہت سے مشرکانہ عقائد اور مشرکانہ اوہام موجود ہیں جو اپنے غیر مسلم آباو اجداد کے مذہب سے انھیں وراثت میں ملے تھے۔ بڑے سے بڑا فرق جو مسلمان ہونے کے بعد ان کے اندر واقع ہوا وہ بس یہ تھا کہ انھوں نے اپنے پچھلے معبودوں کی جگہ کچھ نئے معبود خود اسلام کی تاریخ میں سے ڈھونڈ نکالے اور پرانے مشرکانہ اعمال کے نام بدل کر اسلامی اصطلاحات میں سے کچھ نئے نام اختیار کر لیے۔ عمل جوں کا توں رہا۔ صرف اس کا ظاہری روپ بدل گیا۔

اس کا ثبوت اگر آپ چاہیں تو کسی علاقے میں جا کر عوام کی مذہبی حالت کا جائزہ لیجیے اور پھر تاریخ میں تلاش کیجیے کہ اسلام کے آنے سے پہلے اس علاقہ میں کون سا مذہب رائج تھا۔ آپ دیکھیں گے آج بھی وہاں اس سابق مذہب سے ملتے جلتے

عقائد و اعمال ایک دوسری شکل میں رائج ہیں مثلاً جہاں پہلے بودھ مذہب پایا جاتا تھا وہاں کسی زمانے میں بودھ کے آثار پوجے جاتے تھے۔ کہیں اس کا کوئی دانت رکھا ہوا تھا۔ کہیں اس کی کوئی ہڈی محفوظ تھی، کہیں اس کے دوسرے تبرّکات کو مرکزِ توجّہات بنا کر دکھایا گیا تھا۔ آج آپ دیکھیں گے کہ اس علاقے میں وہی معاملہ آج نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک، یا آپ کے نقشِ قدم، یا دوسرے بزرگانِ دین کے آثارِ متبرّکہ کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اسی طرح آپ پرانے مسلم قبیلوں کے موجودہ رسم و رواج کا جائزہ لیں اور پھر تحقیق کریں کہ ان ہی قبیلوں کی غیر مسلم شاخوں میں کیا رسمیں رائج ہیں۔ دونوں میں آپ بہت کم فرق پائیں گے۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ پچھلی صدیوں میں جو لوگ مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے سربراہ کار رہے ہیں انھوں نے بالعموم اپنا فرض انجام دینے میں سخت کوتاہی کی ہے۔ انھوں نے اسلام پھیلانے والے بزرگوں کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کیا۔ کروڑوں آدمی اسلام کی کشش سے کھچ کھچ کر اس کے دائرے میں آئے۔ مگر جو اسلام کے گھر کے منتظم اور متولّی تھے انھوں نے ان بندگانِ خدا کی تعلیم، تربیت، ذہنی اصلاح اور زندگی کے تزکیے کا کوئی انتظام نہ کیا۔ اس وجہ سے یہ قوم مسلمان ہو جانے کے باوجود اسلام کی برکات اور توحید کی نعمتوں سے پوری طرح بہرہ مند نہ ہو سکی اور ان نقصانات سے نہ بچ سکی جو شرک و جاہلیت کے لازمی نتیجے ہیں۔

پھر دیکھیے کہ ان پچھلی صدیوں میں ہمارے علما کا کیا حال رہا ہے۔ چند مقدس بزرگوں نے تو فی الواقع اس دین کی غیر معمولی خدمات انجام دیں جن کے اثرات پہلے بھی نافع ہوئے اور آج تک نفع بخش ثابت ہو رہے ہیں مگر عام طور پر علمائے دین جن مشاغل میں مشغول رہے وہ یہ تھے کہ چھوٹے چھوٹے مسائل پر مناظرہ بازیاں کیں۔ چھوٹے مسائل کو بڑے مسائل بنایا اور بڑے مسائل کو مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔ اختلافات کو مستقل فرقوں کی بنیاد بنایا اور فرقہ بندی کو جھگڑوں اور لڑائیوں کا اکھاڑہ بنا کر رکھ دیا معقولات کو پڑھنے پڑھانے میں عمریں گزار دیں اور قرآن و حدیث سے نہ خود ذوق رکھا نہ لوگوں میں پیدا کیا۔ فقہ میں اگر کوئی دلچسپی لی تو موشگافیوں اور جزئیات کی بحثوں کی حد تک لی۔ تفقّہ فی الدین پیدا کرنے کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ ان کے اثرات جہاں جہاں بھی پہنچے

لوگوں کی نگاہیں خوردبین بن کر رہ گئیں، دوربین و جہاں بین نہ بن سکیں۔ آج یہ پوری میراث جھگڑوں اور مناظروں اور فرقہ بندیوں اور روز افزوں فتنوں کی لہلہاتی ہوتی فصل کے ساتھ ہمارے حصے میں آئی ہے۔

صوفیا کا حال دیکھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ چند پاکیزہ ہستیوں کے سوا جنھوں نے اسلام کے حقیقی تصوّف پر خود عمل کیا اور دوسروں کو اس کی تعلیم دی باقی سب ایک ایسے تصوف کے معلّم و مبلّغ تھے جس میں اشراقی اور ویدانتی اور مانوی اور زردشتی فلسفوں کی آمیزش ہو چکی تھی اور جس کے طریقوں میں جوگیوں اور راہبوں اور اشراقیوں اور رواقیوں کے طریقے اس طرح مل جل گئے تھے کہ اسلام کے خالص عقائد و اعمال سے ان کو مشکل ہی سے کوئی مناسبت رہ گئی تھی۔ خلق خدا ان کی طرف خدا کا راستہ پانے کے لیے رجوع کرتی تھی اور وہ ان کو دوسرے راستے بتاتے تھے۔

پھر جب اگلوں کے بعد پچھلے ان کے سجادوں پر بیٹھے تو انھوں نے میراث میں دوسری املاک کے ساتھ اپنے بزرگوں کے مرید بھی پائے اور ان سے تربیت و ارشاد کے بجائے صرف نذرانوں کا تعلق باقی رکھا۔ ان حلقوں کی تمام تر کوشش پہلے بھی یہ رہی ہے اور آج بھی ہے کہ جہاں جہاں بھی ان کی پیروی و پیرزادگی کا اثر پھیلا ہوا ہے وہاں دین کا صحیح علم کسی طرح نہ پہنچنے پائے کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ عوام الناس پر ان کی خداوندی کا طلسم اسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے جب تک وہ اپنے دین سے جاہل رہیں۔

اخلاقی حالت

یہ تھی ہماری مذہبی حالت جس نے انیسویں صدی میں ہم کو غلامی کی منزل تک پہنچانے میں بہت بڑا حصہ لیا تھا اور آج اس آزادی کی صبح آغاز میں بھی یہی حالت اپنی پوری قباحتوں کے ساتھ ہماری دامنگیر ہے۔

اب اخلاقی حیثیت سے دیکھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ عام طور پر اس زمانے میں ہمارا طبقۂ متوسط جو ہر قوم کی ریڑھ کی ہڈی ہوتا ہے، مسلسل اخلاقی انحطاط کی بدولت بالکل بھاڑے کا ٹٹو (MERCENARY) بن کر رہ گیا تھا اس کا اصول یہ تھا کہ جو بھی آجائے اجرت پر اس کی خدمات حاصل کرلے اور پھر جس مقصد کے لیے چاہے اس

سے کام لے لے۔ ہزاروں لاکھوں آدمی ہمارے ہاں کرائے کے سپاہی بننے کے لیے تیار تھے جنھیں ہر ایک نوکر رکھ کر جس کے خلاف چاہتا لڑوا سکتا تھا اور ہزاروں لاکھوں ایسے لوگ بھی موجود تھے جن کے ہاتھ اور دماغ کی طاقتوں کو کم یا زیادہ اجرت پر لے کر ہر فاتح اپنا نظم و نسق چلوا سکتا تھا بلکہ اپنی سیاسی چالبازیوں تک میں استعمال کرسکتا تھا۔ ہماری اس اخلاقی کمزوری سے ہمارے ہر دشمن نے فائدہ اٹھایا ہے، خواہ وہ مرہٹے ہوں، سکھ ہوں، فرانسیسی ہوں یا ولندیزی۔ اور آخر کار انگریز نے آکر خود ہمارے ہی سپاہیوں کی تلوار سے ہم کو فتح کیا اور ہمارے ہی ہاتھوں اور دماغوں کی مدد سے ہم پر حکومت کی ہماری اخلاقی حس اس درجہ کند ہو چکی تھی کہ اس روش کو قباحت سمجھنا تو درکنار ہمیں الٹا اس پر فخر تھا چنانچہ ہمارا شاعر اسے اپنے خاندانی مفاخر میں شمار کرتا ہے کہ ؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری

حالانکہ کسی شخص کا پیشہ ور سپاہی ہونا حقیقت میں اُس کے اور اس سے تعلق رکھنے والوں کے لیے باعث ننگ ہے نہ کہ باعث عزت۔ وہ آدمی ہی کیا ہوا جو نہ حق و باطل کی تمیز رکھتا ہو نہ اپنے اور پرائے کا امتیاز۔ جو بھی اُسے پیٹ کو روٹی اور تن کو کپڑا دے دے وہ اُس کے لیے شکار مارنے پر آمادہ ہو جائے اور کچھ نہ دیکھے کہ میں کس کے لیے کس پر جھپٹ رہا ہوں یہ اخلاقی حالت جن لوگوں کی تھی، ان میں کسی دیانت و امانت اور کسی مستقل وفاداری اور مخلصانہ وفاداری کا پایا جانا مستبعد تھا اور ہونا چاہیے تھا۔ جب وہ اپنی قوم کے دشمنوں کے ہاتھ خود اپنے آپ کو بیچ سکتے تھے تو اُن کے اندر کسی پاکیزہ اور طاقت ور ضمیر موجود ہونے کی آخر وجہ ہی کیا ہوسکتی تھی؟ کیوں وہ رشوت اور غبن کا نام "دست غیب" اور "خدا کا فضل" نہ رکھتے؟ کیوں وہ ابن الوقت اور چڑھتے سورج کے پرستار نہ ہوتے؟ اور کیوں ان میں یہ وصف پیدا نہ ہوتا کہ جس کے ہاتھ سے انھیں تنخواہ ملتی ہو اس کے لیے اپنے ایمان و ضمیر کے خلاف سب کچھ کرنے پر آمادہ ہو جائیں؟ ——— اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ ہمارے ملازمت پیشہ طبقہ کی اکثریت آج جن اوصاف کا اظہار کر رہی ہے وہ کوئی اتفاقی کمزوری نہیں ہے جو اچانک ان میں پیدا ہوگئی ہے۔ بلکہ اس کی جڑیں ہماری روایات میں گہری جمی ہوئی ہیں۔ البتہ افسوس اگر ہے تو اس بات کا ہے کہ کل ان سے ہمارے

دشمن ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے۔ اور آج اِن کو ہماری قوم کے وہ رہنما استعمال کر رہے ہیں جنھیں درحقیقت قوم کے امراض کا معالج ہونا چاہیے تھا نہ کہ اِن امراض سے فائدہ اٹھانے والا!

ہمارے طبقۂ متوسط کی ان کمزوریوں میں ہمارے علما بھی شریک تھے۔ اگرچہ ایک قلیل تعداد جس طرح طبقۂ متوسط میں بلند اخلاق اور مضبوط سیرت لوگوں کی موجودگی تھی۔ اسی طرح علما میں بھی کچھ ایسی مقدس شخصیتیں موجود رہیں جنھوں نے اپنے فرض کو ٹھیک ٹھیک پہچانا اور اپنی جانیں لڑا کر اسے ادا کیا۔ اور دنیا کی کوئی دولت ان کو نہ خرید سکی۔ مگر عام طور پر جو اخلاقی حالت طبقۂ متوسط کی تھی وہی علما کی تھی، ان میں بیشتر وظیفہ خوار تھے کسی نہ کسی بادشاہ یا امیر یا درباری سے وابستہ ہو جانا۔ اس کے وظیفہ کھا کر اُس کے منشا کے مطابق دین اور دینی قوانین کی تعبیریں کرنا اپنی ذاتی مفاد کو دین کے تقاضوں پر مقدم رکھنا۔ اپنے مخدوموں کی خاطر علمائے حق کو دبانے کے لیے مذہب کے ہتھیار استعمال کرنا بس یہی کچھ ان کا شعار رہا۔ یہ مچھر کو چھانتے اور اونٹ نگلتے رہے ہیں۔ بے اثر اور بے دولت لوگوں کے معاملہ میں تو ان کی دینی حس اتنی تیز رہی ہے کہ مستحبات اور مکروہات اور چھوٹے سے چھوٹے جزئیات تک میں یہ ان کو معاف کرنے پر کبھی تیار نہ ہوئے اور ان امور کی خاطر انھوں نے بڑے بڑے جھگڑے برپا کر دیے۔ مگر اہل دولت اور ارباب اقتدار کے معاملہ میں خواہ وہ مسلم ہوں یا کافر، یہ ہمہ تن مصالحت بنے رہے اور جزئیات چھوڑ کر کلیات میں انھوں نے ان کے لیے رخصتیں نکالیں۔

رہے ہمارے اُمرا تو ان کے لیے دنیا میں صرف دو ہی چیزیں دلچسپی کا مرکز بن کر رہ گئیں تھیں ایک پیٹ دوسرے شرمگاہ، ان کے سوا کسی دوسرے چیز کی اِن کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہ رہی تھی۔ ساری کوششیں اور ساری محنتیں انھیں کی خدمت کے لیے وقف تھیں اور قوم کی دولت سے انھیں پیشوں اور صنعتوں اور حرفتوں کو پروان چڑھایا جا رہا تھا۔ جو اِن دو چیزوں کی خدمت کریں اِس سے ہٹ کر کسی امیر نے اپنی دولت و طاقت کو کسی بڑے مقصد کے لیے استعمال کیا تو سارے امیروں نے مل کر اُسے گرانے کی کوشش کی اور اپنی قوم کے دشمنوں سے اس کے خلاف

ساز باز کرنے میں بھی تامّل نہ کیا۔

ذہنی حالت

اس کے بعد جب ذہنی حیثیت سے ہم اپنی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ کئی صدیوں سے ہمارے یہاں علمی تحقیقات کا کام قریب قریب بند تھا۔ ہمارا سارا پڑھنا پڑھانا بس علوم عوائل تک محدود تھا۔ ہمارے نظام تعلیم میں یہ تصور گہری جڑوں کے ساتھ جم گیا تھا کہ اسلاف جو کام کر گئے ہیں وہ علم اور تحقیق کا حرفِ آخر ہے اس پر کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ بڑی سے بڑی علمی خدمت بس یہی ہو سکتی تھی کہ اگلوں کی لکھی ہوئی کتابوں پر شرحوں اور حاشیوں کے ردّے چڑھائیں جاتیں۔ ان ہی چیزوں کے لکھنے میں ہمارے مصنّفین اور اُن کے پڑھنے پڑھانے میں ہمارے مدرّسین مشغول رہے کسی نئی فکر، کسی نئی تحقیق، کسی نئی دریافت کا مشکل ہی سے قریب کی ان صدیوں میں ہمارے یہاں کہیں پتہ چلتا ہے۔ اِس کی وجہ سے ایک مکمل جمود کی سی کیفیت ہماری ذہنی فضا پر طاری ہو چکی تھی۔

ظاہر ہے کہ جو قوم اس حالت میں مبتلا ہو چکی ہو۔ وہ زیادہ دیر تک آزاد نہیں رہ سکتی تھی اُس کو لامحالہ کسی نہ کسی ایسی قوم سے مغلوب ہو ہی جانا تھا۔ جو حرکت کرنے والی اور آگے بڑھنے والی ہو جس نے اپنے عام لوگوں میں بیداری پیدا کر لی ہو۔ جس کے افراد میں اپنے فرائض کا — جو کچھ بھی وہ اپنے فرائض سمجھتے ہوں — احساس پایا جاتا ہو جس کے کارکنوں اور کارفرماؤں میں کوئی مستقل اور مخلصانہ وفاداری موجود ہو، جس کے اہل علم تحقیقات کرنے والے اور نئی نئی دریافت کرنے والے ہوں جس کے اہل تدبیر ان نئی دریافت شدہ طاقتوں کو زندگی کے کاموں میں استعمال کرنے والے ہوں اور جس کا قدم تمدن و تہذیب کے مختلف شعبوں میں ترقی کی طرف مسلسل بڑھا چلا جا رہا ہو۔ ایسی کسی قوم کی موجودگی میں ایک جامد اور ضعیف الاخلاق اور ایک جاہلیت زدہ قوم آخر کتنی دیر زمین پر قابض رہ سکتی تھی؟ پس یہ اتفاقی حادثہ نہ تھا بلکہ قانون فطرت کا تقاضا تھا۔ کہ ہم مغرب کی ترقی یافتہ قوموں میں سے ایک کے غلام ہو کر رہے۔

اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصوّرات ۴۲۴ تا ۴۳۴

فقیہہ شہر کی تحقیر کیا مجال مری
مگر یہ بات کہ میں ڈھونڈتا ہوں دل کی کشاد

علمائے اسلام اس وقت کے رجحانات کو سمجھیں اور غور فرمائیں کہ جس دور میں وہ رہتے ہیں وہ کس طرز پر مذہبی رہنمائی کا طالب ہے اور اس دور میں دو سو برس پرانے طریق رہنمائی کو اختیار کرنے کے کیا نتائج ہیں۔ اب سے دو تین سال قبل حیدر آباد میں بھی ایسی ہی ضرورت پیش آئی تھی۔ عیدگاہ میں لاؤڈ اسپیکر لگایا گیا۔ لوگوں نے بہت اچھی طرح نماز ادا کی اور ہر شخص اس سے مطمئن تھا۔ مگر بعد میں علما نے مخالفت کی۔ کمیٹیاں ہوئیں۔ مشورے ہوئے اور آخر کار فیصلہ کر دیا گیا کہ نماز میں آلہ کا استعمال ناجائز ہے۔ میں اس وقت حیدر آباد ہی میں تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کا کتنا برا اثر تعلیم یافتہ طبقہ پر ہوا اور کیا خیالات علما کے متعلق ظاہر کیے گئے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو احکام دین کو اس تعلیم یافتہ طبقہ کی اہوا کا تابع بنانا چاہتے ہیں اور اسی کو روشن خیال سمجھتے ہیں۔ اگر میں یہ دعویٰ کروں تو شاید غلط نہ ہوگا کہ اس گروہ کے غیر اسلامی رجحانات کے خلاف جہاد کرنے میں میرا قدم کسی متشدد سے متشدد عالم دین سے بھی پیچھے نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں اس بات کا بھی مخالف ہوں کہ علمائے کرام وقت کے رجحانات سے منہ موڑ کر بیٹھ جائیں اور اس کو بالکل بھول جائیں کہ وہ ہدایہ اور بدائع کے زمانہ تصنیف میں نہیں بلکہ نت نئے سائنٹفک ایجادات اور تیز رفتار تمدنی انقلابات کے دور میں رہتے ہیں۔ اس دور میں روز بروز نئے مسائل کا پیدا ہونا لابدی ہے۔ اور ان مسائل کو ہدایہ و بدائع کی روشنی میں حل کرنے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں، جس کا خطرہ نوجوان سائل نے اپنے استفسار میں ظاہر کیا ہے ہماری نئی نسلیں شدت کے ساتھ اپنے زمانے کے حالات سے متاثر ہو رہی ہیں اور یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ زمانہ اپنے طبعی رفتار سے جو حالات اور جو مسائل پیدا کر دے ان سے وہ قوم یکسر بے تعلق ہو کر رہے جو کروڑوں کی تعداد میں دنیا کے ہر حصے میں پھیلی ہوئی ہے ان نئی نسلوں میں اگر کوئی غیر اسلامی رجحان پیدا ہو تو اس کو روکنے کے لیے علمائے کرام کے پاس وہ طاقت و دلائل چاہئیں جو اس زمانے کے دماغوں سے اپنا لوہا منوا سکتے ہوں چھٹی صدی ہجری کی منطق اب کام نہیں دے سکتی۔

اور اگر یہ لوگ جدید تمدنی زندگی میں اسلام کی شاہراہ پر آگے بڑھنا چاہیں تو ان کی رہنمائی کے لیے علمائے اسلام میں وسعت نظر اور روح اجتہاد کی ضرورت ہے۔ قدم قدم پر عالمگیری اور تاتارخانی کو لاکر سدراہ بنانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ نئے زمانے کے مسلمان قرآن اور حدیث کو بھی پیچھے چھوڑ کر جدھر منہ اٹھے گا چل نکلیں گے جس طرح ترک اور ایرانی چل نکلے۔

تفہیمات دوم ۳۷۰، ۳۷۱

قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد

(آزادی)

انبیا علیہم السلام کی تعلیم کے اثر سے جہاں لوگ اللہ واحد قہار کی خدائی کے قائل ہوگئے وہاں خداؤں کی دوسری اقسام تو رخصت ہوگئیں مگر انبیا، اولیا، شہدا، صالحین مجاذیب، اقطاب، ابدال، علما، مشائخ اور ظل اللٰہون کی خدائی پھر بھی کسی نہ کسی طرح عقائد میں جگہ نکالتی ہی رہی، جاہل دماغوں نے مشرکین کے خداؤں کو چھوڑ کر ان نیک بندوں کو خدا بنا لیا جن کی ساری زندگیاں بندوں کی خدائی ختم کرنے اور صرف اللہ کی خدائی ثابت کرنے میں صرف ہوئی تھیں۔ ایک طرف مشرکانہ پوجا پاٹھ کی جگہ فاتحہ، زیارات، نیاز، نذر، عرس، صندل، چڑھاوے، نشان، علم، تعزیے اور اسی قسم کے دوسرے مذہبی اعمال کی ایک نئی شریعت تصنیف کر لی گئی دوسری طرف بغیر کسی ثبوت علمی کے ان بزرگوں کی ولادت و وفات، ظہور و غیاب، کرامات و خوارق، اختیارات و تصرفات اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے تقرب کی کیفیات کے متعلق ایک پوری میتھالوجی تیار ہوگئی، جو بت پرست مشرکین کی میتھالوجی سے ہر طرح لگا کھا سکتی ہے۔ تیسری طرف توسل اور استمداد روحانی اور اکتساب فیض وغیرہ ناموں کے خوشنما پردوں میں وہ سب معاملات جو اللہ اور بندوں کے درمیان ہوتے ہیں ان بزرگوں سے متعلق ہوگئے اور عملاً وہی حالت قائم ہوگئی جو اللہ کے ماننے والے مشرکین کے ہاں ہے۔ جن کے نزدیک پادشاہ عالم انسان کی رسائی سے بہت دور ہے اور انسان کی زندگی سے تعلق

رکھنے والے تمام امور نیچے کے اہل کاروں ہی سے وابستہ ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان کے ہاں اہل کار علانیہ الٰہ، دیوتا، اوتار یا ابن اللہ کہلاتے ہیں اور یہ انھیں غوث، قطب، ابدال، اولیا اور اہل اللہ وغیرہ الفاظ کے پردوں میں چھپاتے ہیں۔

تجدید واحیائے دین ۱۶، ۱۷

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں بیچارے یہ دو رکعت کے امام

(توحید)

آپ کے یہاں امامت کا معیار حد سے زیادہ پست ہو چکا ہے۔ جو منصب مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں سب سے زیادہ اہم تھا وہ اب سب سے زیادہ غیر اہم ہے، جس منصب کے لیے بہتر سے بہتر آدمی منتخب کرنے کا حکم تھا۔ اب اس کے لیے بدتر سے بدتر آدمی چھانٹا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے ذہن میں اب امام کا تصور یہ ہے کہ جو شخص دنیا کے کسی اور کام کا نہ ہو اس کو مسجد کا امام ہونا چاہیے۔ دس پانچ روپیہ تنخواہ اور دونوں وقت کی روٹی مقرر کر دی اور کسی نیم خواندہ ملا کو رکھ لیا۔ یہ گویا مسجد کی امامت کا انتظام ہو گیا۔ امامت کو اس درجہ پست کر دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری مسجدیں، وہی مسجدیں جنھوں نے کبھی ہماری قوم کے قصر فلک بوس کی تعمیر کی تھی آج ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہیں جو بے علم، تنگ نظر، پست حوصلہ اور دنی الاخلاق ہیں۔ کیا آپ ایسے لوگوں سے امید رکھتے ہیں کہ یہ اردو میں خطبے دے کر آپ کی دینی و دنیوی رہنمائی کر سکیں گے؟

تفہیمات دوم ۳۴۴

قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحان ہے زندگی

(زندگی)

یہ سارا عالم ہست و بود جو ہمارے گرد و پیش پھیلا ہوا ہے، اور جس کا ایک جز ہم خود ہیں، دراصل ایک بادشاہ کی سلطنت ہے۔ اسی نے اس کو بنایا ہے، وہی اس

کا مالک ہے اور وہی اس کا واحد حاکم ہے۔ اس سلطنت میں کسی کا حکم نہیں چلتا۔ سب کے سب تابع فرمان ہیں اور اختیارات بالکلیہ اسی ایک مالک و فرماں روا کے ہاتھ میں ہے۔

انسان اس مملکت میں پیدائشی رعیت ہے یعنی رعیت ہونا نہ ہونا اس کی مرضی پر موقوف نہیں ہے بلکہ یہ رعیت ہی پیدا ہوا ہے اور رعیت کے سوا کچھ اور ہونا اس کے امکان میں نہیں ہے۔

اس نظام حکومت کے اندر انسان کی خود مختاری و غیر ذمہ داری کے لیے کوئی جگہ نہیں، نہ فطرتاً ہو سکتی ہے۔ پیدائشی رعیت اور ایک جز و مملکت ہونے کی وجہ سے اس کے لیے کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے کہ جس طرح مملکت کے تمام اجزا بادشاہ کے امر کی اطاعت کر رہے ہیں اسی طرح یہ بھی کرے۔ یہ خود اپنے لیے طریق زندگی وضع کرنے اور اپنی ڈیوٹی آپ تجویز کر لینے کا حق نہیں رکھتا۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ مالک الملک کی طرف سے جو ہدایت آئے اس کی پیروی کرے۔ اس ہدایت کے آنے کا ذریعہ وحی ہے اور جن انسانوں کے پاس وہ آتی ہے وہ نبی ہیں۔

مگر انسان کی آزمائش کے لیے مالک نے یہ لطیف طریقہ اختیار کیا ہے کہ آپ بھی چھپ گیا اور اپنی سلطنت کا وہ پورا اندرونی انتظام بھی چھپا دیا جس سے وہ تدبیر امر کرتا ہے۔ ظاہر میں سلطنت اس طرح چل رہی ہے کہ نہ اس کا کوئی حاکم نظر آتا ہے اور کارپرداز دکھائی دیتے ہیں۔ انسان صرف ایک کارخانہ چلتا ہو دیکھتا ہے۔ اس کے درمیان اپنے آپ کو موجود پاتا ہے اور ظاہر حواس سے کہیں یہ محسوس نہیں کرتا کہ میں کسی کا محکوم ہوں اور کسی کو مجھے حساب دینا ہے۔ اعیان و شہود میں کوئی ایسی نشانی نمایاں نہیں ہوتی کہ اس پر فرماں روائے عالم کی حاکمیت اور اپنی محکومیت و مسئولیت (Responsibility) کا حال غیر مشتبہ طور پر کھل جائے، یہاں تک کہ ماننے بغیر چارہ نہ رہے۔ نبی بھی آتے ہیں تو اس طرح نہیں کہ ان کے اوپر عیاناً وحی اترتی دکھائی دے یا کوئی ایسی صریح علامت ان کے ساتھ اترے جس کو دیکھ کر ان کی نبوت ماننے کے سوا چارہ نہ رہے۔ پھر آدمی ایک حد کے اندر اپنے آپ کو بالکل مختار پاتا ہے۔ بغاوت کرنا چاہے تو اس کی قدرت دی جاتی ہے۔ ذرائع بہم پہنچا دیے جاتے ہیں اور بڑی لمبی ڈھیل دی جاتی ہے حتیٰ کہ شرارت و عصیان

کی آخری حدود کو پہنچنے تک کوئی رکاوٹ اُسے پیش نہیں آتی ۔ مالک کے سوا دوسروں
کی بندگی کرنا چاہے تو اس سے بھی زبردستی اس کو نہیں روکا جاتا ۔ پوری آزادی دے دی
جاتی ہے کہ جس جس کی بندگی ، عبادت ، اطاعت کرنا چاہے کرے ۔ دونوں صورتوں یعنی
بغاوت اور بندگی غیر کی صورتوں میں رزق برابر ملتا ہے ۔ سامان زندگی ، وسائل کار ،
اسباب عیش حسب حیثیت خوب دیے جاتے ہیں اور مرتے دم تک دیے جاتے
رہتے ہیں ۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کسی باغی یا کسی بندۂ غیر سے محض اس جرم کی پاداش میں
اسباب دنیا روک لیے جائیں ۔ یہ سارا طرز کارروائی صرف اس لیے ہے کہ خالق نے انسان
کو عقل ، تمیز ، استدلال ، ارادہ و اختیار کی جو قوتیں دی ہیں اور اپنی بے شمار مخلوقات پر
اس کو ایک طرح کے حاکمانہ تصرف کی جو قدرت بخشی ہے اس میں وہ اس کی آزمائش
کرنا چاہتا ہے ۔ اسی آزمائش کی تکمیل کے لیے حقیقت پر غیب کا پردہ ڈالا گیا ہے تاکہ
انسان کی عقل کا امتحان ہو ۔ انتخاب کی آزادی بخشی گئی ہے تاکہ اس امر کا امتحان ہو کہ آدمی
حق کو جاننے کے بعد کسی مجبوری کے بغیر خود اپنی رضا و رغبت سے اس کی پیروی کرتا ہے ،
یا خواہشات کی غلامی اختیار کر کے اس سے منہ موڑ جاتا ہے ۔ اسباب زندگی کا سرمایہ ،
وسائل اور کام کا موقع نہ دیا جائے تو اس کی لیاقت و عدم لیاقت کا امتحان نہیں ہو سکتا ۔

یہ دنیوی زندگی چونکہ آزمائش کی مہلت ہے اس لیے یہاں نہ حساب ہے نہ جزا نہ سزا ۔
یہاں جو کچھ دیا جاتا ہے وہ کسی نیک عمل کا انعام نہیں بلکہ امتحان کا سامان ہے اور جو تکالیف
مصائب شدائد وغیرہ پیش آتے ہیں وہ کسی عمل بد کی سزا نہیں بلکہ زیادہ تر اس قانون
طبعی کے تحت جس پر اس دنیا کا نظام قائم کیا گیا ہے آپ سے آپ ظاہر ہونے والے
'نتائج' ہیں ۔ اعمال کے اصلی حساب ، جانچ ، پڑتال اور فیصلہ کا وقت مہلت کی یہ زندگی ختم
ہونے کے بعد ہے اور اسی کا نام آخرت ہے ۔ لہذا دنیا میں جو کچھ نتائج ظاہر ہوتے ہیں
وہ کسی طریقے یا کسی عمل کے صحیح یا غلط ، نیک یا بد اور قابل اخذ یا قابل ترک ہونے کا معیار
نہیں بن سکتے ۔ اصلی معیار آخرت کے نتائج ہیں اور یہ علم کہ آخرت میں کس طریقے اور
کس عمل کا نتیجہ اچھا اور کس کا برا ہوگا ۔ صرف اس وحی کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے جو
اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء پر نازل ہوئی ہے ۔ جزئیات و تفصیلات سے قطع نظر ،
فیصلہ کن بات جس پر آخرت کی فلاح یا خسران کا مدار ہے یہ ہے کہ اولاً انسان اپنی قوت نظر

و استدلال کے صحیح استعمال سے اللہ تعالیٰ کے حاکم حقیقی ہونے اور اس کی طرف
سے آئی ہوئی ہدایت کے منجانب اللہ ہونے کو پہچانتا ہے یا نہیں ۔ ثانیاً اس حقیقت
سے واقف ہونے کے بعد وہ (آزادی انتخاب رکھنے کے باوجود) اپنی رضا و رغبت
سے اللہ کی حاکمیت اور اس کے امر شرعی کے آگے سر تسلیم خم کرتا ہے یا نہیں ۔

تجدید و احیائے دین ۲۵ ، ۲۸

کیوں ہراساں ہے صہیل فرسِ اعدا سے
نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفسِ اعدا سے

(جواب شکوہ)

جب کہ اسلام صرف شہر مدینہ تک محدود تھا ۔ مسلمانوں کی تعداد چند ہزار
سے زیادہ نہ تھی اور سارا عرب اس دین کو مٹا دینے پر تلا ہوا تھا ۔ اُحد کے معرکہ میں جو زک
مسلمانوں کو پہنچی تھی اس کی وجہ سے ان کی ہوا اکھڑ گئی تھی اور گرد و پیش کے قبائل ان
پر شیر ہو گئے تھے ۔ ان حالات میں فرمایا گیا کہ اللہ کا نور کسی کے بجھائے نہ بجھ سکے گا بلکہ
پوری طرح روشن ہو کر اور دنیا بھر میں پھیل کر رہے گا ۔ یہ ایک صریح پیشین گوئی ہے
جو حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی ۔ اللہ کے سوا اس وقت اور کون جان سکتا تھا کہ اسلام کا
مستقبل کیا ہے ؟ انسانی نگاہیں تو اس وقت یہ دیکھ رہی تھیں کہ یہ ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ
ہے جسے بجھا دینے کے لیے بڑی زور کی آندھیاں چل رہی ہیں ۔

تفہیم القرآن ۵ ۴۷۷

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

پہلے کہا گیا تھا کہ دنیا تمھارے لیے ہے ، اور اسی لیے بنائی گئی ہے کہ تم اس کو
خوب اچھی طرح برتو ۔ اب معاملہ کا دوسرا رخ پیش کیا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے
کہ مگر تم دنیا کے لیے نہیں ہو نہ اس لیے بنائے گئے ہو کہ یہ دنیا تمھیں برتے اور تم اسی

میں اپنے آپ کو گم کردو۔ دنیا کی زندگی سے دھوکا کھا کر کبھی یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ ہمیں دائمًا یہیں رہنا ہے۔ خوب یاد رکھو کہ یہ مال، یہ دولت، یہ شان وشوکت کے سامان سب ناپائیدار ہیں۔ سب کچھ دیر کا بہلاوا ہیں۔ سب کا انجام موت ہے اور تمھاری طرح یہ سب خاک میں مل جانے والے ہیں۔ اس ناپائیدار عالم میں سے اگر کوئی چیز باقی رہنے والی ہے تو وہ صرف نیکی ہے۔ دل اور روح کی نیکی، عمل اور فعل کی نیکی۔

اسلامی تہذیب اصول ومبادی ۴۵

کہتا ہے زمانے سے یہ درویش جوانمرد
جاتا ہے جدھر بندہ حق تو بھی ادھر جا

(قلندر کی پہچان)

یہ خیال کہ زندگی کا دریا جس رخ پہ بہہ گیا ہے اس سے وہ پھیرا نہیں جا سکتا عقلاً بھی غلط ہے اور تجربہ و مشاہدہ بھی اس کے خلاف گواہی دیتا ہے۔ دنیا میں ایک نہیں سینکڑوں انقلاب ہوئے ہیں اور ہر انقلاب نے اس دریا کے رُخ کو بدلا ہے۔ اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال خود اسلام ہی میں موجود ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا میں تشریف لائے تو زندگی کا یہ دریا کس رُخ پہ بہہ رہا تھا؟ کیا تمام دنیا پر کفر و شرک کا غلبہ نہ تھا؟ کیا استبداد اور ظلم کی حکومت نہ تھی؟ کیا انسانیت کو طبقات کی ظالمانہ تقسیم نے داغدار نہ بنا رکھا تھا؟ کیا اخلاق پر فواحش، معاشرت پر نفس پرستی، معیشت پر ظالمانہ جاگیرداری و سرمایہ داری، اور قانون پر بے اعتدالی کا تسلّط نہ تھا؟ مگر ایک تن واحد نے اٹھ کر تمام دنیا کو چیلنج دے دیا، تمام ان غلط خیالات اور غلط طریقوں کو رد کر دیا جو اس وقت دنیا میں رائج تھے۔ ان سب کے مقابلے میں اپنا ایک عقیدہ اور اپنا ایک طریقہ پیش کیا اور چند سال کی مختصر مدّت میں اپنی تبلیغ اور جہاد سے دنیا کے رخ کو پھیر کر اور زمانہ کے رنگ کو بدل کر چھوڑا۔

تنقیحات ۲۷۱، ۲۷۲

کشتئ مسکیں و جانِ پاک و دیوارِ یتیم
علم موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

(خضرِ راہ)

(ذرا ان کو وہ قصہ سناؤ جو موسیٰ کو پیش آیا تھا) جبکہ موسیٰ نے اپنے خادم سے کہا تھا کہ "میں اپنا سفر ختم نہ کروں گا جب تک کہ دونوں دریاؤں کے سنگم پر نہ پہنچ جاؤں، ورنہ میں ایک زمانہ دراز تک چلتا ہی رہوں گا"۔ پس جب وہ ان کے سنگم پر پہنچے تو اپنی مچھلی سے غافل ہو گئے اور وہ نکل کر اس طرح دریا میں چلی گئی جیسے کہ کوئی سرنگ لگی ہو۔ آگے جا کر موسیٰ نے اپنے خادم سے کہا "لاؤ ہمارا ناشتہ، آج کے سفر میں تو ہم بری طرح تھک گئے ہیں"۔ خادم نے کہا "آپ نے دیکھا نہیں کہ جب ہم اس چٹان کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے اس وقت کیا ماجرا پیش آیا؟ مجھے مچھلی کا خیال نہ رہا اور شیطان نے مجھ کو ایسا غافل کر دیا کہ میں اس کا ذکر (آپ سے کرنا) بھول گیا۔ مچھلی تو عجیب طریقے سے نکل کر دریا میں چلی گئی"۔ موسیٰ نے کہا "یہی تو ہم چاہتے تھے" چنانچہ وہ دونوں اپنے نقش قدم پر پھر واپس ہوئے اور وہاں انھوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جسے ہم نے اپنی رحمت سے نوازا تھا اور اپنی طرف سے ایک خاص علم عطا کیا تھا۔

موسیٰ نے اس سے کہا "کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں تاکہ آپ مجھے بھی اس دانش کی تعلیم دیں جو آپ کو سکھائی گئی ہے؟" اس نے جواب دیا "آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے۔ اور جس چیز کی آپ کو خبر نہ ہو آخر آپ اس پر صبر کر بھی کیسے سکتے ہیں"۔ موسیٰ نے کہا "ان شاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں کسی معاملہ میں آپ کی نافرمانی نہ کروں گا"۔ اس نے کہا "اچھا، اگر آپ میرے ساتھ چلتے ہیں تو مجھ سے کوئی بات نہ پوچھیں جب تک کہ میں خود اس کا آپ سے ذکر نہ کروں"۔

اب وہ دونوں روانہ ہوئے، یہاں تک کہ وہ ایک کشتی میں سوار ہو گئے تو اس شخص نے کشتی میں شگاف ڈال دیا۔ موسیٰ نے کہا "آپ نے اس میں شگاف ڈال دیا تاکہ سب کشتی والوں کو ڈبو دیں؟ یہ تو آپ نے ایک سخت حرکت کر ڈالی"۔ اس نے کہا "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے؟"۔ موسیٰ نے کہا

بھول چوک پر مجھے نہ پکڑیے۔ میرے معاملے میں آپ ذرا سختی سے کام نہ لیں۔"
پھر وہ دونوں چلے، یہاں تک کہ ان کو ایک لڑکا ملا اور اس شخص نے اُسے قتل کر دیا۔ موسیٰ نے کہا "آپ نے ایک بے گناہ کی جان لے لی حالانکہ اس نے کسی کا خون نہ کیا تھا؟ یہ کام تو آپ نے بہت ہی بُرا کیا" اس نے کہا "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے؟" موسیٰ نے کہا "اس کے بعد اگر میں آپ سے کچھ پوچھوں تو آپ مجھے ساتھ نہ رکھیں۔ لیجیے، اب تو میری طرف سے آپ کو عذر گیا۔"
پھر وہ آگے چلے یہاں تک کہ ایک بستی میں پہنچے اور وہاں کے لوگوں سے کھانا مانگا، مگر انھوں نے ان دونوں کی ضیافت سے انکار کر دیا۔ وہاں انھوں نے ایک دیوار دیکھی جو گرنا چاہتی تھی۔ اس شخص نے اس دیوار کو پھر قائم کر دیا۔ موسیٰ نے کہا "اگر آپ چاہتے تو اس کام کی اجرت لے سکتے تھے۔" اس نے کہا "بس، میرا تمھارا ساتھ ختم ہوا۔ اب میں تمھیں ان باتوں کی حقیقت بتاتا ہوں جن پر تم صبر نہ کر سکے۔ اس کشتی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ چند غریب آدمیوں کی تھی جو دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے۔ میں نے چاہا کہ اُسے عیب دار کر دوں کیونکہ آگے ایک ایسے بادشاہ کا علاقہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا۔ رہا وہ لڑکا، تو اس کے والدین مومن تھے، ہمیں اندیشہ ہوا کہ یہ لڑکا اپنی سرکشی اور کفر سے ان کو تنگ کرے گا، اس لیے ہم نے چاہا کہ ان کا رب اس کے بدلے ان کو ایسی اولاد دے جو اخلاق میں بھی اس سے بہتر ہو اور جس سے صلہ رحمی بھی زیادہ متوقع ہو۔ اور اس دیوار کا معاملہ یہ ہے کہ یہ دو یتیم لڑکوں کی ہے جو اس شہر میں رہتے ہیں۔ اس دیوار کے نیچے ان بچوں کے لیے ایک خزانہ مدفون ہے اور ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا۔ اس لیے تمھارے رب نے چاہا کہ یہ دونوں بچے بالغ ہوں اور اپنا خزانہ نکال لیں۔ یہ تمھارے رب کی رحمت کی بنا پر کیا گیا ہے، میں نے کچھ اپنے اختیار سے نہیں کر دیا ہے۔ یہ ہے حقیقت ان باتوں کی جن پر تم صبر نہ کر سکے۔"
۷۵۔ اس مرحلہ پر یہ قصہ سنانے سے مقصود کفار اور مومنین دونوں کو ایک اہم حقیقت پر متنبہ کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ ظاہر بیں نگاہ دنیا میں بظاہر جو کچھ ہوتے ہوئے دیکھتی ہے اس سے بالکل غلط نتائج اخذ کر لیتی ہے کیونکہ اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی وہ مصلحتیں نہیں ہوتیں جنھیں ملحوظ رکھ کر وہ کام کرتا ہے۔ ظالموں کا پھلنا پھولنا اور بے گناہوں

کا تکلیفوں میں مبتلا ہونا۔ نافرمانوں پر انعامات کی بارش اور فرماں برداروں پر مصائب کا ہجوم، بدکاروں کا عیش اور نیکوکاروں کی خستہ حالی، یہ وہ مناظر ہیں جو آئے دن انسانوں کے سامنے پیش آتے رہتے ہیں اور محض اس لیے کہ لوگ ان کی کنہ کو نہیں سمجھتے، ان سے عام طور پر ذہنوں میں الجھنیں، بلکہ غلط فہمیاں تک پیدا ہو جاتی ہیں۔ کافر اور ظالم ان سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ دنیا اندھیر نگری ہے، کوئی اس کا راجہ نہیں اور ہے تو چوپٹ ہے، یہاں جس کا جو کچھ جی چاہے کرتا رہے، کوئی پوچھنے والا نہیں، مومن اس طرح کے واقعات کو دیکھ کر دل شکستہ ہوتے ہیں اور بسا اوقات سخت آزمائشوں کے مواقع پر ان کے ایمان تک متزلزل ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی حالات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے کارخانۂ مشیت کا پردہ اٹھا کر ذرا اس کی ایک جھلک دکھائی تھی تاکہ انھیں معلوم ہو جائے کہ یہاں شب و روز جو کچھ ہو رہا کیسے اور کن مصلحتوں سے ہو رہا ہے اور کس طرح واقعات کا ظاہر ان کے باطن سے مختلف ہوتا ہے۔

تفہیم القرآن ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰

کس درجہ یہاں عام ہوئی مرگ تخیّل
ہندی بھی فرنگی کا مقلّد عجمی بھی

(مصوّر)

تاریخی مطالعہ سے ناظرین کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے یہاں کے بوجھ بجھکڑ اپنی سوسائٹی کے مسائل اور پیچیدگیوں کو حل کرنے کے لیے آئے دن جو طرفہ تجویزیں پیش کرتے رہتے ہیں، ان کا شجرۂ نسب کیا ہے۔ یہ جو ہم سنا کرتے ہیں کہ کوئی صاحب "اجتماعی منصوبہ بندی" کی ضرورت پر زور دے رہے ہیں اور کوئی دوسرے صاحب فلک کے معاشی نظام میں "انقلابی تبدیلیاں" چاہتے ہیں، اور تیسرے بزرگ فرماتے ہیں کہ زمین کو انفرادی ملکیت سے نکال کر "قوما" دیا جائے اور کسی طرف سے آواز آتی ہے کہ ساری کلیدی صنعتیں بھی "قومائی جائیں" اور کوئی عطائیوں کی مجلس بڑے غور و خوض کے بعد نسخۂ کیمیا لے کر آئی ہے کہ زمینداریوں کو ختم کر دیا جائے۔

یہ سب وہ نوادرِ حکمت ہیں جو مغرب کے اناڑیوں کی بیاض سے اڑائے گئے ہیں اور اب یہاں وہ سب تجربات ہونا چاہتے ہیں جو روس میں، جرمنی و اٹلی میں اور امریکہ و انگلستان میں ہو چکے ہیں۔ مگر اس معاملہ میں ہماری اور ان کی مماثلت ایک فرق کے ساتھ ہے، وہاں کے اناڑی کم از کم مجتہد تو ہیں لیکن یہاں جو حضرات مطلب کھول بیٹھے ہیں وہ اناڑی پن کے ساتھ مقلّد بھی ہیں۔ مغرب کے اناڑی نقصان ہوتا دیکھیں گے تو نسخے میں کچھ ردّ و بدل کر لیں گے۔ مگر یہاں مغرب سے ہی کسی رد و بدل کی اطلاع آجائے تو بات دوسری ہے ورنہ ڈاکٹر مریض کی آخری ہچکی تک انشاء اللہ ایک ہی نسخہ پلاتا رہے گا۔

سود دوم ۱۰۰

کس طرح ہوا کند ترا نشترِ تحقیق؟
ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک؟

ہم جو ریسرچ چاہتے ہیں اور جس غرض کے لیے چاہتے ہیں وہ ہے ٹھیک ٹھیک اسلام کے مطابق علوم و فنون کی تحقیقات کی جائے اور تحقیقات کر کے اسلام کے نظام فکر و عمل کو باقاعدگی کے ساتھ مرتب کیا جائے اس سلسلہ میں چند مقاصد پیشِ نظر ہیں اور انہی مقاصد کی تحصیل کے لیے ہم کام کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) سب سے پہلا کام ہم یہ کرنا چاہتے ہیں کہ مغربی فکر اور مغربی فلسفۂ حیات کا جو طلسم بندھا ہوا ہے اس کو توڑ ڈالا جائے۔ ایک معقول اور مدلّل علمی تنقید کے ذریعہ یہ بات ثابت کی جائے کہ مغربی علوم و فنون میں جتنے حقائق اور واقعات ہیں وہ دراصل تمام دنیا کا مشترک علمی سرمایہ ہیں اور ان کے ساتھ کسی تعصّب کا سوال نہیں ہے لیکن ان معلومات و حقائق کو جمع کر کے جو فلسفۂ حیات اہلِ مغرب نے بنایا ہے وہ قطعی باطل ہے۔ ان کو مرتّب کر کے جو طرزِ فکر اور کائنات کے متعلق جو تصوّر اور انسان کے بارے میں جو خیال انھوں نے قائم کیا ہے اور جس کے اوپر اپنی پوری تہذیب کی عمارت انھوں نے اٹھائی ہے وہ ساری کی ساری از اوّل تا آخر باطل ہے

جو معاشرتی علوم Social Sciences انھوں نے مرتّب کیے ہیں جو معاشرتی فلسفہ Social Philosophy انھوں نے گڑھا ہے وہ موجب فتنہ و فساد ہے، وہ انسان کی فلاح کے لیے نہیں بلکہ انسان کی تباہی کے لیے ہے خود ان کی اپنی تباہی کے لیے ہے۔ یہ پہلا ضروری کام ہے جس کے ذریعہ ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ مسلمانوں پر مغربی فکر و فلسفے کا جو سحر ہے وہ ختم ہو جائے گا جس کے بغیر مسلمانوں کو ان کی ذہنی مرعوبیت اور ذہنی شکست خوردگی کی حالت سے نہیں نکالا جا سکتا۔ اور جب تک وہ اس ذہنی شکست خوردگی میں مبتلا ہیں اس وقت تک آپ توقع نہیں کر سکتے۔ کہ وہ مقلّد کی زندگی چھوڑ کر مجتہد کی زندگی اختیار کریں گے۔ اس وقت تک تو ان کا کام آنکھیں بند کر کے اہل مغرب کے پیچھے چلنا ہے۔ اس حالت کو آپ نہیں بدل سکتے، جب تک کہ اس سحر کو نہ توڑ دیں اور اس حقیقت کو واضح کریں کہ علمی حقایق اور چیز ہیں اور علمی حقائق کو ترتیب دے کر ایک فلسفۂ زندگی اور نظامِ حیات مرتب کرنا بالکل دوسری چیز ہے۔ حقائق اپنی جگہ بالکل صحیح لیکن ان کو مرتب کر کے جو فلسفۂ حیات بنایا گیا ہے وہ فی الحقیقت بالکل غلط ہے۔

(۲) اس کے آگے جو دوسرا کام کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے تمام علوم و فنون کو نئے اسلوب اور نئے طریقے پر مرتب کیا جائے تاکہ وہ ایک اسلامی تہذیب کی بنیاد بن سکیں۔ اسی طرح اسلام کے مطابق ہمیں ایک فلسفہ درکار ہے، جو انسان کے ذہن کی اس تلاش کو تسکین دے کہ حقیقت کیا ہے مگر یہ تسکین اس عقیدے کے مطابق دے جو اسلام نے ہمیں دیا ہے۔ حقیقت کی تلاش اور اس کی تڑپ انسان کی فطرت میں ہے، وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا مگر کائنات کی حقیقت اور انسان کی حقیقت نیز اس کے مآل کو ایک فلسفے کی شکل میں مرتب کرنا تاکہ آدمی کو اس کے مطابق ڈھالا جائے اور ظاہر ہے اس کے بغیر یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ آپ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں جو فلسفہ پڑھایا جاتا ہے یا نفسیات کے جو علوم پڑھائے جاتے ہیں یا دوسرے فلسفیانہ علوم کی تعلیم دی جاتی ہے ان کو تبدیل کیا جا سکے اور ان کی جگہ کوئی دوسرا فلسفہ پڑھایا جا سکے۔

کشادہ دست کرم جب وہ بے نیاز کرے
نیاز مند نہ کیوں عاجزی پہ ناز کرے

اور اے نبی، میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں، تو انھیں بتادو
کہ میں اُن سے قریب ہی ہوں، پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے میں اس کی پکار
سُنتا اور جواب دیتا ہوں۔ لہذا انھیں چاہیے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر
ایمان لائیں[۱۸۸] یہ بات تم انھیں سنادو، شاید کہ وہ راہ راست پالیں[۱۸۹]۔

۱۸۸ یعنی اگرچہ تم مجھے دیکھ نہیں سکتے اور نہ اپنے حواس سے مجھ کو محسوس کر سکتے
ہو لیکن یہ خیال نہ کرو کہ میں تم سے دور ہوں۔ نہیں، میں اپنے ہر بندے سے اتنا قریب
ہوں کہ جب وہ چاہے، مجھ سے عرض معروض کر سکتا ہے، حتیٰ کہ دل ہی دل میں وہ جو
کچھ گزارش مجھ سے کرتا ہے میں اسے بھی سن لیتا ہوں اور صرف سنتا ہی نہیں، فیصلہ
بھی صادر کرتا ہوں۔ جن بے حقیقت اور بے اختیار ہستیوں کو تم نے نادانی سے اِلٰہ
اور رب قرار دے رکھا ہے، ان کے پاس تو تمھیں دوڑ دوڑ کر جانا پڑتا ہے اور پھر بھی
نہ وہ تمھاری سُنوائی کر سکتے ہیں اور ان میں یہ طاقت ہے کہ تمھاری درخواستوں پر
کوئی فیصلہ صادر کر سکیں۔ مگر میں کائنات بے پایاں کا فرمانروائے مطلق، تمام
اختیارات اور تمام طاقتوں کا مالک، تم سے اتنا قریب ہوں کہ تم خود بغیر کسی واسطے
اور وسیلے اور سفارش کے براہِ راست ہر وقت اور ہر جگہ مجھ تک اپنی عرضیاں
پہنچا سکتے ہو۔ لہذا تم اپنی اس نادانی کو چھوڑ دو کہ ایک ایک بے اختیار بناوٹی خدا کے در
پر مارے مارے پھرتے ہو۔ میں جو دعوت تمھیں دے رہا ہوں، اس پر لبیک کہہ کر میرا
دامن پکڑ لو۔ میری طرف رجوع کرو، مجھ پر بھروسہ کرو اور میری بندگی و اطاعت میں آجاؤ۔

۱۸۹ یعنی تمھارے ذریعے سے یہ حقیقتِ حال معلوم کر کے ان کی آنکھیں کُھل جائیں
اور وہ اس صحیح رویے کی طرف آجائیں جس میں ان کی اپنی ہی بھلائی ہے۔

تفہیم القرآن ۱ ۱۴۴

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

(اساتذہ)

واقعات کی رفتار دنیا کو، اور دنیا کا ایک جز ہونے کی حیثیت سے ہندوستان
کو بھی ایک ایسے مقام پر لے آئی ہے جہاں سے وہ اسلام کی طرف بھی مڑ سکتی ہے اور
مادہ پرستی اور فساد اخلاق کے اسفل السافلین کی طرف بھی۔ طبعاً اس کا رخ ابھی تک
دوسرے راستے کی طرف ہے کیونکہ اس راستہ پر وہ ایک مدّت دراز سے بڑھتی چلی
آرہی ہے۔ اگرچہ اس راستہ کے مہالک دیکھ دیکھ کر وہ سہم رہی ہے اور چاروں طرف
گھبرا گھبرا کر دیکھتی ہے کہ کوئی بچاؤ کی راہ بھی ہے یا نہیں مگر بچاؤ کی راہ خود اس کی اپنی
آنکھوں سے اوجھل ہے۔ وہ در حقیقت اس وقت ایسے لیڈروں کی محتاج ہے جو
قوّت کے ساتھ اُٹھ کر اس کی نگاہوں پر سے پردہ اٹھا دیں اور اسلام کی صراط مستقیم کا
واحد راہ نجات ہونا ثابت و مبرہن کر دیں۔ ایک ایسی مجاہد و مجتہد جماعت اگر
مسلمانوں میں پیدا ہو جائے تو مسلمان تمام دنیا کے پیشوا بن سکتے ہیں۔ ان کو وہی مقام
عزّت پھر حاصل ہو سکتا ہے جس پر وہ کبھی سرفراز تھے اور جس پر مغربی قوموں کو
متمکن دیکھ کر آج ان کے منہ میں پانی بھرا چلا آرہا ہے لیکن اگر اس قوم کے جمہور اس طرح
دون ہمتی و پست حوصلگی کے ساتھ بیٹھے رہے۔ اگر اس کے نوجوان یونہی غیروں کا پس خوردہ
کھانے کو اپنا منتہائے کمال سمجھتے رہے اگر ان کے علما اپنی انہی پرانی فقہ و کلام کی فرسودہ
بحثوں میں اُلجھے رہے۔ اگر ان کے لیڈروں اور سیاسی پیشواؤں کی ذلیل ذہنیت
کا یہی حال رہا کہ لشکر اغیار کے پیچھے لگ جانے کو مجاہدانہ عزیمت کا بلند ترین مرتبہ
کہیں اور بیسویں صدی کے سب سے بڑے فریب میں اپنی قوم کو مبتلا کرنا کمال دانشمندی
خیال کریں۔ غرض اگر اس قوم کے دست و پا سے لے کر دل و دماغ تک سب کے
سب تعطل یا خام کاری میں گرفتار رہیں اور اس کروڑوں کے انبوہ سے چند مردان خدا
بھی جہاد اور اجتہاد فی سبیل اللہ کے لیے کمر باندھ کر نہ اٹھ سکیں تو پھر دنیا جس
اسفل السافلین کی طرف جا رہی ہے اُس طبقۂ جہنّم میں یہ قوم بھی دنیا کی دم کے ساتھ بندھی
بندھی جا گرے گی۔

تنقیہات ۹۲، ۹۳

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمی احرار
وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

(پنجاب کے پیرزادوں سے)

ہندوستان کے گوشوں میں بہت سے حق پرست علما اور سچے صوفیہ بھی اس وقت موجود تھے مگر ان سب کے درمیان وہ ایک اکیلا شخص تھا جو وقت کے ان فتنوں کی اصلاح اور شریعت محمدی کی حمایت کے لیے اُٹھا اور جس نے شاہی قوت کے مقابلہ میں یکہ و تنہا احیائے دین کی جدوجہد کی۔ اس بے سروسامان فقیر نے علی الاعلان اٹھ کر ان گمراہیوں کی مخالفت کی جنھیں حکومت کی حمایت حاصل تھی اور اس شریعت کی تائید کی جو حکومت کی نگاہ میں مبغوض تھی۔ حکومت نے اس کو ہر طرح دبانے کی کوشش کی حتیٰ کہ جیل بھی بھیجا مگر بالآخر وہ فتنے کا منہ پھیرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جہانگیر جس نے سجدۂ تحیہ نہ کرنے پر شیخ کو گوالیار کے قید خانہ میں بھیج دیا تھا آخر کار شیخ کا معتقد ہو گیا اور اپنے بیٹے خرم کو جو بعد میں شاہ جہاں کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ ان کے حلقۂ بیعت میں داخل کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے متعلق حکومت کی معاندانہ روش احترام سے بدل گئی۔ "دین الٰہی اکبرشاہی" ان تمام بدعتوں کے ساتھ ختم ہوا جو درباری شریعت سازوں نے گھڑی تھیں اسلامی احکام کی جو ترمیم و تنسیخ کی گئی تھی وہ خود منسوخ ہو گئی۔ حکومت اگرچہ شاہی حکومت ہی رہی۔ مگر کم از کم اتنا ہوا کہ علوم دینی اور احکام شرعی کی طرف اس کا رویہ کافرانہ ہونے کے بجائے عقیدتمندانہ ہو گیا۔ شیخ کی وفات کے تین چار سال بعد عالم گیر پیدا ہوا۔ اور غالباً وہ شیخ ہی کے پھیلائے ہوئے اصلاحی اثرات تھے جن کی بدولت تیموری خاندان کے اس شاہزادے کو وہ علمی اور اخلاقی تربیت مل سکی کہ اکبر جیسے ہادم شریعت کا پڑپوتا خادم شریعت ہوا۔

شیخ کا کارنامہ اتنا ہی نہیں ہے کہ انھوں نے ہندوستان میں حکومت کو بالکل ہی کفر کی گود میں چلے جانے سے روکا اور اس فتنۂ عظیم کے سیلاب کا منہ پھیرا جو اب سے

تین چار سو برس پہلے ہی یہاں اسلام کا نام و نشان مٹا دیتا۔ اس کے علاوہ انھوں نے دو عظیم الشان کام اور بھی انجام دیے ایک یہ کہ تصوّف کے چشمہ صافی کو ان آلائشوں سے جو فلسفیانہ اور راہبانہ گمراہیوں سے اس میں سرایت کر گئی تھیں، پاک کر کے اسلام کا اصلی اور صحیح تصوف پیش کیا۔ دوسرے یہ کہ ان تمام رسوم جاہلیت کی شدید مخالفت کی جو اس وقت عوام میں پھیلی ہوئی تھیں اور سلسلۂ بیعت و ارشاد کے ذریعہ سے اتّباع شریعت کی ایک ایسی تحریک چلائی جس کے ہزارہا تربیت یافتہ کارکنوں نے نہ صرف ہندوستان کے مختلف گوشوں میں بلکہ وسط ایشیا تک پہنچ کر عوام کے اخلاق و عقائد کی اصلاح کی۔ یہی کام ہے جس کی وجہ سے شیخ احمد سرہندی کا شمار مجدّدینِ ملّت میں ہوتا ہے۔

تجدید و احیائے دین ۸۷، ۸۸

گلۂ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہل حرم سے ہے
کسی بُتکدہ میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی "ہری ہری"

مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان کے پاس خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنّت میں ایک دائمی و ابدی ہدایت موجود ہے جو انھیں شیطانی وساس پر متنبہ کرنے اور زندگی کے تمام معاملات میں ہدایت کی روشنی دکھانے کے لیے ابد تک کافی ہے مگر یہ مساکین اپنے دین سے جاہل اور استعمار کی تہذیبی و فکری تاخت سے بُری طرح مغلوب ہیں۔ اس لیے ہر وہ نعرہ جو دنیا کی غالب قوموں کے کیمپ سے بلند ہوتا ہے، اس کی صدائے بازگشت فوراً ہی یہاں سے بلند ہونی شروع ہو جاتی ہے جس زمانہ میں انقلاب فرانس کے اٹھائے ہوئے افکار کا زور تھا۔ مسلمان ملکوں میں ہر تعلیم یافتہ آدمی اپنا فرض سمجھتا تھا کہ انھی افکار کا موقع و بے موقع اظہار کرے اور انھی کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالے۔ اس کے بغیر وہ سمجھتا تھا کہ اس کی کوئی عزت قائم نہ ہو گی۔ اور وہ رجعت پسند سمجھ لیا جائے گا۔ یہ دور جب گزر گیا۔ تو ہمارے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی سمت قبلہ بھی تبدیل ہونے لگی اور نیا دور آتے ہی اجتماعی عدل و اشتراکیت کے نعرے بلند کرنے والے ہمارے درمیان پیدا ہونے لگے۔ یہاں تک بھی بات قابل صبر تھی لیکن غضب یہ ہے کہ

ایک گروہ ہمارے اندر ایسا بھی اٹھتا رہا ہے جو اپنے قبلہ کی ہر تبدیلی کے ساتھ چاہتا ہے کہ اسلام بھی اپنا قبلہ تبدیل کرے۔ گویا اسلام کے بغیر یہ بے چارے جی نہیں سکتے۔ اس کا ان کے ساتھ رہنا ضروری ہے لیکن ان کی خواہش یہ ہے کہ جس کی پیروی کر کے یہ ترقی کرنا چاہتے ہیں اس کی پیروی سے اسلام بھی مشرف ہو جائے اور "دین رجعی" ہونے کے الزام سے بچ جائے۔ اسی بنا پر پہلے کوشش کی جاتی تھی کہ حرّیت فرد اور فراخ دلی اور سرمایہ داری اور بے دین جمہوریت کے مغربی تصوّرات کو عین اسلامی ثابت کیا جائے اور اسی بنا پر اب یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ اسلام میں بھی اشتراکی تصوّر کی عدالت اجتماعیہ موجود ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں کی ذہنی غلامی اور ان کی جاہلیت کی طغیانی ذلّت کی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔"

تفہیمات سوم ۱۹۶، ۱۹۷

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی!
مجھ کو مل جائے وہی میرا مقام اے ساقی!

ہم اپنی انفرادی اور قومی زندگی کے لیے اس راہ کو منتخب کرلیں جو قرآن اور سنّت میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دکھائی ہے۔ یہی ہم چاہتے ہیں اور یہی ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی مسلم آبادی کے کم از کم ۹۹۹ فی ہزار باشندے چاہتے ہیں، اور یہی ہر اس شخص کو چاہنا چاہیے جو خدا اور رسول کو مانتا ہو اور موت کے بعد کی زندگی کا قائل ہو۔ مگر جو لوگ اس راہ کو پسند کرنے والے ہوں انھیں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ جن حالات سے ہم گزرتے ہوئے آرہے ہیں اور جن میں اس وقت ہم گھرے ہوئے ہیں ان میں تنہا اسلام اور خالص اسلام کو پاکستان کا رہنما فلسفۂ حیات اور غالب نظام زندگی بنانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اسلامی اور غیر اسلامی قدامت کی اس آمیزش کو، جسے صدیوں کی روایات نے پختہ کر رکھا ہے، تحلیل کر دیں اور قدامت کے اجزا کو الگ کر کے خالص اسلام کے اس جوہر کو لے لیں جو قرآن اور سنّت کے معیار پر جوہر اسلام

ثابت ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام ہمارے ان گروہوں کی مزاحمت اور سخت مزاحمت کے بغیر نہیں ہو سکتا جو قدامت کے کسی نہ کسی جز کے ساتھ گہری وابستگی رکھتے ہیں۔

اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم مغرب کی حقیقی تمدنی و علمی ترقیات کو اس کے فلسفۂ حیات اور انداز فکر اور اخلاق و معاشرت کی گمراہیوں سے الگ کریں اور پہلی چیز کو لے کر دوسری چیز کو بالکلیہ اپنے ہاں سے خارج کر دیں۔ ظاہر ہے کہ اسے ہمارے وہ گروہ برداشت نہیں کر سکتے جنھوں نے خالص مغربیت کو یا اسلام کے کسی نہ کسی مغربی ایڈیشن کو اپنا دین بنا رکھا ہے۔

اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ایسے لوگ فراہم ہوں اور منظم طریقے سے کام کریں جو اسلامی ذہنیت کے ساتھ تعمیری صلاحیتیں بھی رکھتے ہوں اور پھر مضبوط سیرت اور صالح اخلاق اور مستحکم ارادے کے مالک بھی ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ جنس ہمارے ہاں ویسے ہی کمیاب ہے، پھر اس دل گردے کے لوگ آخر کہاں سے ملا کرتے ہیں جو سیاسی اور معاشی چوٹ بھی سہیں، فتووں کی مار بھی برداشت کریں اور جھوٹے الزامات کی چو طرفہ بارش کا مقابلہ بھی پورے صبر و سکون کے ساتھ کرتے چلے جائیں۔

ان سب شرطوں کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ اسلام کو نظام غالب بنانے کی تحریک اُسی طرح ایک ہمہ گیر سیلاب کے مانند اُٹھے جس طرح مغربی تہذیب یہاں سیلاب کے مانند آئی اور زندگی کے ہر شعبے پر چھا گئی۔ اس ہمہ گیری اور سیلابیت کے بغیر نہ یہ ممکن ہے کہ مغربی تہذیب کو غلبہ و اقتدار سے بے دخل کیا جا سکے اور نہ یہی ممکن ہے کہ نظام تعلیم، نظام قانون، نظام معیشت اور نظام سیاست کو بدل کر ایک دوسرا تمدن خالص اسلامی بنیادوں پر تعمیر کیا جا سکے۔

یہی کچھ ہم چاہتے ہیں۔ ہمارے پیش نظر برّ اعظم ہند و پاکستان کے مسلمانوں کی پرانی قومی تہذیب کا احیا نہیں بلکہ اسلام کا احیا ہے۔ ہم علوم جدیدہ اور ان کی پیدا کی ہوئی ترقیات کے مخالف نہیں بلکہ اس نظام تہذیب و تمدّن کے باغی ہیں جو مغربی فلسفۂ زندگی اور فلسفۂ اخلاق کا پیدا کردہ ہے۔ ہم دو دو اور چار چار آنے والے ممبر بھرتی کر کے کوئی سیاسی کھیل کھیلنا نہیں چاہتے بلکہ اپنی قوم میں سے چھانٹ چھانٹ کر ایسے لوگوں

کو منظم کرنا چاہتے ہیں جو قرآن وسنّت کے حقیقی اسلام کو یہاں غالب نظام زندگی بنانے کے لیے قدامت اور جدّت دونوں سے لڑنے پر تیار ہوں۔ ہم زندگی کے کسی ایک جز یا بعض اجزا میں کچھ اسلامی رنگ پیدا کر دینے کے قائل نہیں ہیں بلکہ اس بات کے درپے ہیں کہ پورا اسلام پوری زندگی پر حکمراں ہو ——— انفرادی سیرتوں اور گھر کی معاشرت پر حکمراں ہو، تعلیم کے اداروں پر حکمراں ہو، قانون کی عدالتوں پر حکمراں ہو، سیاست کے ایوانوں پر حکمراں ہو۔ نظم ونسق کے محکموں پر حکمراں ہو اور معاشی دولت کی پیداوار اور تقسیم پر حکمراں ہو ——— اسلام کے اس ہمہ گیر تسلّط ہی سے یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ پاکستان یک سو ہوکر ان روحانی، اخلاقی اور مادّی فوائد سے پوری طرح متمتع ہو جو رب العالمین کی دی ہوئی ہدایت پر چلنے کا لازمی اور فطری نتیجہ ہیں اور پھر اسی سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ یہ ملک تمام مسلم ممالک کے لیے دعوت الی الخیر کا اور تمام دنیا کے لیے ہدایت کا مرکز بن جائے۔

اسلامی نظام زندگی ۴۷۸ تا ۴۸۱

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے مُلّا ہیں کیوں ننگ مسلمانی؟

سب سے بڑا نقصان اس پالیسی کا یہ ہوا کہ مسلمانوں کی قیادت و رہنمائی سے اہل دین بے دخل ہوگئے اور تعلیم، تمدّن، معیشت اور سیاست، ہر معاملے میں مسلمانوں کو راستہ دکھانا اور اپنے پیچھے لے کر چلنا ان لوگوں کا کام ہوگیا جو نہ دین کو جانتے ہی ہیں اور نہ کوئی قدم دین سے پوچھ کر اٹھانے کی ضرورت ہی محسوس کرتے ہیں۔ انھوں نے ساری تعلیم مغربی طرز پر پائی ہے۔ ان کی زندگیاں مغربی نظام معیشت سے بنی ہیں۔ ان کی معاشرت مغربی سانچوں میں ڈھلی ہے۔ ان کے اخلاق مغربی قدروں اور اصولوں پر تعمیر ہوئے ہیں۔ انھوں نے شریعت مغرب کے لاکالجوں سے لی اور اس کی پریکٹس کی ہے۔ انھوں نے سیاست کے سارے اصول اور رنگ ڈھنگ اور جوڑ توڑ مغرب سے سیکھے ہیں۔ اس سرچشمہ ضلالت سے جو رہنمائی انھوں نے

پائی اس پر وہ چلے اور ساری قوم کو اس پر چلایا اور قوم پورے اعتماد سے ان کے پیچھے چلی۔ اہل دین کا اس سارے کاروبار میں اگر کوئی کام رہا تو یہ کہ یا تو گوشہ نشین ہوکر درس و تدریس اور ذکر و تسبیح میں مشغول رہیں، یا قومی قیادت پر جو بھی فائز ہو اس کے دعاگو بن کر رہیں، یا پھر سیاست کے میدان میں آئیں تو کسی نہ کسی آگے چلنے والے پیچھے بے اثر خیمہ بردار کی حیثیت سے چلیں۔ کانگریس ہو یا مسلم لیگ، جس کی طرف بھی وہ گئے پیرو بن کر گئے۔ کسی پالیسی کے بنانے میں ان کا کوئی حصّہ نہ رہا۔ کسی بڑی سے بڑی گمراہی کو بھی وہ نہ روک سکے نہ اس پر ٹوک ہی سکے۔ ان کا کام اس کے سوا کچھ نہ رہا کہ جو پالیسی دین سے بے نیاز یا دین کے مخالف لیڈر بنا دیں اس کو یہ برکت دیں اور مسلمانوں کو اطمینان دلائیں کہ یہی قرآن و حدیث میں بھی لکھا ہے یا کم از کم یہ کہ اس میں ان کے دین کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یہ بیماری بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی کہ سیکولرزم تک کو ہماری بہت سی مقدس مذہبی بارگاہوں سے برکت مل گئی۔ بے اثر لوگوں کے معاملے میں تو ان کی دینی حِس اتنی تیز ہے کہ ان کی ساری دین داری پر ایک داڑھی کے طول کی کمی پانی پھیر دیتی ہے اور چند غیر منصوص فقہی جزئیات میں ان سے ذرا سا اختلاف بھی ہوجائے تو وہ ہادم دین قرار پاتے ہیں۔ مگر جن کے پیچھے ایک دفعہ ساری قوم مل کر زندہ باد کا نعرہ لگادے یا جن کو سیاسی طاقت نصیب ہوجائے ان کو یہ تمام رخصتوں کا مستحق سمجھتے ہیں چاہے ان کے ہاتھوں پورے دین کی عمارت ہی متزلزل ہو رہی ہو۔

اسلامی نظام زندگی ۴۷۲ تا ۴۷۴

میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہوگا
مسائل نظری میں الجھ گیا ہے خطیب

علما کے لیے اب یہ وقت نہیں ہے کہ وہ الٰہیات اور مابعد الطبیعیات اور فقہی جزئیات کے بحثوں میں لگے رہیں۔ رسول اللہ کو علم غیب تھا یا نہ تھا؟ خدا جھوٹ بول سکتا ہے یا نہیں؟ رسول کا نظیر ممکن ہے یا نہیں؟ ایصال ثواب اور زیارت قبور کی شرعی حقیقت کیا ہے؟ آمین بالجہر و رفع یدین کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ مسجد میں منبر و محراب

کے درمیان کتنا فاصلہ رکھا جائے؟ یہ اور ایسے ہی بیسیوں مسائل جن کو طے کرنے میں آج ہمارے پیشوایان دین اپنی ساری قوتیں ضائع کر رہے ہیں، دنیا کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے اور ان کے طے ہو جانے سے ہدایت و ضلالت کی اس عظیم الشان لڑائی کا تصفیہ نہیں ہو سکتا جو اس وقت تمام عالم میں چھڑی ہوئی ہے۔ آج اصل ضرورت ان مسائل کے سمجھنے کی ہے جو ناخدا شناسی اور لادینی کی بنیاد پر علم و تمدن کے صدیوں تک نشو و نما پاتے رہنے سے پیدا ہو گئے ہیں ان کی پوری پوری تشخیص کر کے اصول اسلام کے مطابق ان کا قابل عمل حل پیش کرنا وقت کا اصلی کام ہے۔ اگر علمائے اسلام نے اپنے آپ کو اس کام کا اہل نہ بنایا اور اسے انجام دینے کی کوشش نہ کی تو یورپ و امریکہ کا جو حشر ہوگا، سو ہوگا، خود دنیائے اسلام بھی تباہ ہو جائے گی۔

تنقیحات ۷۶، ۷۷

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی میں کھا گیا مزدور مات

(سرمایہ و محنت)

اجتماعی نظم و نسق اور اجتماعی منصوبہ بندی کو رائج کرنے کے لیے جان و مال اور مذہب و اخلاق اور انسانیت کی جو کٹھی بربادی روس کو برداشت کرنی پڑی، وہ تو گویا اس تجربے کے آغاز کی لاگت تھی۔ مگر اب رو بعمل آجانے کے بعد روزمرہ کی زندگی میں وہ اہل روس کو دے کیا رہا ہے اور ان سے لے کیا رہا ہے؟ اس کا بھی ذرا موازنہ کر دیکھیے۔ وہ جو کچھ انھیں دیتا ہے وہ یہ ہے کہ:

ہر شخص کے لیے کم از کم اتنے روزگار کا انتظام ہو گیا ہے جس سے وہ دو وقت کی روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا اور سر چھپانے کو جگہ پا سکے اور:

اجتماعی طور پر اس امر کا بھی انتظام ہو گیا ہے کہ برے وقت پر آدمی کو سہارا مل سکے۔

بس یہی دو اصل فائدے ہیں جو اس نئے نظام نے باشندگان ملک کو دیے۔ اب دیکھیے کہ اس نے لیا کیا۔

انفرادی ملکیت کے بجائے اجتماعی ملکیت کا نظام قائم کرنے کے لیے ناگزیر تھا کہ

یہ کام وہی پارٹی اپنے ہاتھ میں لے جو اس نظریہ کو لے کر اٹھی تھی یعنی کمیونسٹ پارٹی۔ اس پارٹی کا نظریہ خود بھی یہ تھا اور خود اس کام کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ایک زبردست ڈکٹیٹرشپ قائم ہو جو پورے زور کے ساتھ انفرادی ملکیت کے نظام کو توڑ دے اور سخت ہاتھوں سے نئے نظام کو رائج کر دے۔ چنانچہ یہ ڈکٹیٹرشپ قائم ہو گئی اور اس کو کارکنوں کی ڈکٹیٹرشپ کا نام دیا گیا، لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ روس کے مزدوروں اور کاشتکاروں اور مختلف شعبہائے زندگی کے کارکنوں کی ساری آبادی کمیونسٹ پارٹی میں شامل نہیں ہے۔ شاید اس آبادی کے ۵ فی صدی لوگ بھی پارٹی کے ممبر نہ ہوں گے۔ پس ظاہر میں نام تو یہ ہے کہ یہ مزدوروں کی ڈکٹیٹرشپ ہے مگر حقیقت میں یہ مزدوروں پر کمیونسٹ پارٹی کی ڈکٹیٹرشپ ہے۔

اور یہ ڈکٹیٹرشپ بھی کچھ ہلکی پھلکی سی نہیں ہے۔ اجتماعی ملکیت کے معنی یہ ہیں کہ ملک کے تمام زمیندار ختم کر دیے گئے، اور ایک وحدہٗ لاشریک زمیندار سارے ملک کی زمین کا مالک ہو گیا۔ سارے کارخانہ دار اور تجار اور مستاجر بھی ختم ہو گئے اور ان سب کی جگہ ایک ایسے سرمایہ دار نے لی جو ذرائع پیداوار کی ہر قسم اور ہر صورت پر قابض ہو گیا۔ اور پھر اسی کے ہاتھ میں سارے ملک کی سیاسی طاقت بھی مرکوز ہو گئی۔ یہ ہے کمیونسٹ پارٹی کی ڈکٹیٹرشپ.....

اس نے جاسوسی کا ایک وسیع نظام قائم کر رکھا ہے جس کے بے شمار کارکن ہر ادارے ہر گھر اور ہر مجمع میں "رجعت پسندوں" کو سونگھتے پھرتے ہیں۔ اس جاسوسی کے پراسرار جال نے شوہروں اور بیویوں تک کے درمیان شک و شبہہ کی دیوار حائل کر دی ہے۔ حتیٰ کہ ماں باپ کے خلاف خود ان کی اولاد تک سے جاسوسی کی خدمت لینے میں دریغ نہیں کیا گیا ہے۔ روس کی پولیس۔ سی۔ آئی۔ ڈی کا "محتاط" نظریہ یہ ہے کہ اگر بھول چوک سے چند سو یا چند ہزار آدمی پکڑے اور مار ڈالے جائیں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ چند گنہگار چھوٹ جائیں اور ان کے ہاتھوں سے جوابی انقلاب برپا ہو جائے۔ اسی لیے وہ ہر فیکٹری، ہر دکان، ہر دفتر اور ہر ادارے میں دیکھتے رہتے ہیں کہ کون سا مزدور یا کارکن ملک کے یا خود اپنے ادارے کے انتظام پر ناک بھوں چڑھاتا ہے یا کسی قسم کی بے اطمینانی کا اظہار کرتا ہے۔ اس طرح کا کوئی فعل کرنا تو درکنار، جس پر شبہہ ہو جائے

کہ وہ ایسے جراثیم رکھتا ہے، وہ بھی اچانک گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ آئے دن کا معمول ہے اس لیے جب کوئی کارکن اپنے گھر پر نہیں پہنچتا تو اس کی بیوی خود ہی سمجھ جاتی ہے کہ پکڑا گیا۔ دوسرے دن وہ اس کی ضرورت کی چیزیں آپ ہی آپ پولیس کے دفتر میں پہنچانی شروع کر دیتی ہے، اور ان کا قبول کر لیا جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کا قیاس صحیح تھا۔ وہ کوئی سوال کرے تو دفتر کی طرف سے اُسے کوئی جواب نہیں ملتا۔ ایک روز یکایک ایسا ہوتا ہے کہ اس کا بھیجا ہوا پارسل واپس آجاتا ہے، بس یہی اس امر کی اطلاع ہے کہ اس کا خاوند لینن کو پیارا ہوا۔ اب اگر وہ نیک بخت خود بھی اس انجام سے دوچار ہونا نہ چاہتی ہو تو اس کا فرض ہے کہ ایک اچھی کامریڈنی کی طرح اس معاملہ کی بھاپ تک منہ سے نہ نکالے، اور دوسرا کوئی ایسا خاوند ڈھونڈے جو "رجعت پسندی" کے شبہ سے بالاتر ہو۔

یہ ہے وہ قیمت جو دو وقت کی روٹی اور بُرے وقت کی دستگیری کے لیے اشتراکی روس کے باشندوں کو ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ کیا واقعی اس قیمت پر یہ سودا سستا ہے؟ بلاشبہ ایک فاقہ کش آدمی بسا اوقات بھوک کی شدت سے اتنا مغلوب ہو جاتا ہے کہ وہ جیل کی زندگی کو اپنی مصیبت بھری آزادی پر ترجیح دینے لگتا ہے۔ صرف اس لیے کہ وہاں کم از کم دو وقت کی روٹی، تن ڈھانکنے کو کپڑا اور سر چھپانے کو جگہ تو نصیب ہو گی۔ مگر کیا اب پوری نوع انسانی کے لیے فی الواقع یہ مسئلہ پیدا ہو گیا ہے کہ اُسے روٹی اور آزادی دونوں ایک ساتھ نہیں مل سکتیں؟ کیا روٹی ملنے کی اب یہی ایک صورت باقی رہ گئی ہے کہ ساری روئے زمین ایک جیل خانہ ہو، اور چند کامریڈ اس کے جیلر اور وارڈر ہوں؟

سود دوم ۷۱، ۷۲، ۷۶، ۷۷

مسکینی و محکومی و نومیدی جاوید
جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد

(ہندی اسلام)

جاہلیت راہبانہ نے علما، مشائخ، زہّاد اور پاکباز لوگوں پر حملہ کیا اور ان میں

وہ خرابیاں پھیلانا شروع کیں جن کی طرف میں اس سے پہلے اشارہ کر آیا ہوں۔ اس جاہلیت کے اثر سے اشراقی فلسفہ راہبانہ اخلاقیات اور زندگی کے ہر پہلو میں مایوسانہ نقطۂ نظر مسلم سوسائٹی میں پھیلا اور اس نے نہ صرف یہ کہ ادبیات اور علوم کو متاثر کیا بلکہ فی الواقع سوسائٹی کے اچھے عناصر کو مارفیا کا انجکشن دے کر سست کر دیا۔ پادشاہی کے جاہلی نظام کو مضبوط کیا۔ اسلامی علوم و فنون میں جمود اور تنگ خیالی پیدا کی اور ساری دینداری کو چند خاص مذہبی اعمال میں محدود کر کے رکھ دیا۔

تجدید و احیائے دین ۳۹

مُلّا کو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت
ناداں سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

(ہندی اسلام)

آپ خود غور فرمائیں کہ اس وقت آپ اپنی اسی ہندوستان کی دنیا میں اسلام کو کس حال میں دیکھ رہے ہیں۔ قوانین اسلامی قریب قریب معطّل ہیں۔ اخلاق میں، معاشرت میں، معیشت میں اور زندگی کے سارے معاملات میں اصول اسلامی کا نفاذ پانچ فی صد سے زیادہ نہیں ہے۔ غیر اسلامی ماحول، غیر اسلامی تربیت اور غیر اسلامی تعلیم نے دماغ کو کہیں بالکل اور کہیں کم و بیش غیر مسلم بنا دیا ہے۔ آنکھیں دیکھتی ہیں مگر زاویہ نظر بدل گیا ہے۔ کان سنتے ہیں مگر ان کے پردے متغیر ہو چکے ہیں، زبان بولتی ہے مگر اس کی گویائی میں فرق آگیا ہے۔ پھیپھڑوں کو صاف ہوا میسّر نہیں کہ ایک زہریلی فضا چاروں طرف محیط ہے۔ معدے کو پاک غذا نہیں ملتی کہ رزق کے خزانے مسموم ہو چکے ہیں۔ عبادات جو اس جسم کے جوارح اور قوائم ہیں قریب قریب ۶۰ فی صدی تو مفلوج ہیں اور ۴۰ فی صدی جو باقی ہیں وہ بھی کچھ اثر نہیں دکھا رہے ہیں کیونکہ دوسرے اعضائے رئیسہ سے ان کا تعلق باقی نہیں رہا۔ اس لیے فالج کا مادہ ان میں پھیلتا جا رہا ہے۔ ایسی حالت میں کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ پورا اسلام ہے جو آپ کے سامنے ہے؟

تنقیحات ۳۰۵، ۳۰۶

میراث میں آئی ہے انھیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

(باغی مرید)

کچھ اور لوگ تھے جنھوں نے دیکھا کہ اس قوم کے اندر مذہبی تعصبّات بھڑکا کر بھی کام نکالا جا سکتا ہے چنانچہ وہ اپنے اپنے فروعی مسائل لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور اشتراکیوں، قادیانیوں، ملحدوں سب کو چھوڑ چھاڑ کر میرے اور جماعت اسلامی کے خلاف الزام تراشیاں کرنے پر تُل گئے۔ ایک گروہ تو پہلے ہی سالہا سال سے مجھ کو اور جماعت اسلامی کو گالیاں دے رہا تھا۔ انتخابات کا زمانہ جوں جوں قریب آتا گیا "مقدسین" کے دوسرے گروہ بھی اس کارِ خیر میں شریک ہوتے چلے گئے۔ جھوٹ اور بدگوئی اور فحش کلامی کی کوئی قسم ایسی نہیں ہے جس سے ان "دین داروں" نے کام نہ لیا ہو۔ میرے متعلق یہاں تک کہا گیا کہ یہ شخص قرآن کے صرف پندرہ پارے مانتا ہے، رمضان کے صرف پندرہ روزوں کا قائل ہے۔ صرف تین وقت کی نماز کو فرض سمجھتا ہے۔ جماعت اسلامی کے لوگ سجدے میں سبحان ربی الاعلیٰ کہنے کے بجائے سبحان ابوالاعلیٰ کہتے ہیں (العیاذ باللہ) یہ اور ایسے ہی بے شمار جھوٹ ہزارہا آدمیوں کے مجمعوں میں بولے گئے، جگہ جگہ ان کو دہرایا گیا اور ان کے بولنے والے وہ لوگ تھے جن کی شرعی صورتوں اور قال اللہ وقال الرسول کی باتوں کو سن کر ایک سیدھا سادا عام مسلمان کبھی یہ تصور تک نہیں کر سکتا تھا کہ ایسے لوگ خدا سے اس قدر بے خوف بھی ہو سکتے ہیں۔ آخرت سے اتنے غافل اور بے فکر بھی ہو سکتے ہیں کہ دنیا میں کسی شخص اور جماعت کو نیچا دکھانے کی خاطر اتنے بے سروپا جھوٹے بہتان لگانے پر اتر آئیں۔ ان لوگوں میں خدا کا خوف تو درکنار خلق کی اتنی شرم بھی نہ تھی کہ اس شخص پر انھوں نے یہ بہتان لگائے جو کوئی غیر معروف آدمی نہیں ہے، لاکھوں آدمی اُسے جانتے ہیں۔ لاکھوں آدمیوں نے اس کی تحریریں پڑھی ہیں ہر جگہ اس کی کتابیں مل سکتی ہیں۔ انھوں نے خیال کیا کہ جو لوگ جانتے ہیں وہ بے شک ہمیں جھوٹا سمجھ لیں گے مگر جو نہیں جانتے وہ تو دھوکہ کھا جائیں گے اور ان کو دھوکہ دینے میں اگر ہم کامیاب ہو جائیں تو یہی فوز عظیم ہے۔ ان لوگوں نے ایڑی چوٹی کا زور جماعت اسلامی کو ایک الگ فرقہ قرار دینے پر صرف کر دیا، حالانکہ فرقہ بندی میں یہ خود مبتلا ہیں کہ انھوں نے اپنی نمازیں اور مسجدیں تک دوسرے

مسلمانوں سے الگ کر رکھی ہیں اور جماعت اسلامی کا حال یہ ہے کہ اس کے لوگ ہر مسجد میں ہر امام کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں، حتیٰ کہ ان مسجدوں تک میں نماز ادا کرتے ہیں جن کے امام اور خطیب شب و روز مجھ پر اور جماعت پر تبرّا کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔ انھوں نے بھرے مجمعوں میں لوگوں سے کہا کہ فاتحہ، نیاز، عرس جو کچھ کرتے ہو اب کر لو۔ جماعت اسلامی آ گئی تو یہ سب کچھ بند کر دے گی، اور مزارات تک ڈھا دے گی۔ یہ خطرہ ان کو اشتراکیوں سے نہ تھا جماعت اسلامی سے تھا، حالانکہ جماعت ہمیشہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان رواداری ہی کی تلقین کرتی رہی ہے اس کی صفوں میں بریلوی، دیوبندی، اہل حدیث سب شامل ہیں جن کے درمیان کبھی ایک دوسرے کے عقائد اور اعمال پر کوئی جھگڑا نہیں ہوا اور اس کا مسلک یہ رہا ہے کہ جس عمل کو آپ صحیح سمجھتے ہیں اُسے کیجیے اور جسے دوسرا صحیح سمجھتا ہے اُسے کرنے دیجیے اور سب مل کر اپنی کوشش اللہ کا کلمہ بلند کرنے پر صرف کر ڈالیے۔ اب اگر بڑی بڑی مقدس صورتوں کے لوگوں کی زبان سے یہ جھوٹی باتیں سن کر بیچارے ناواقف عوام دھوکا کھا گئے تو یہ ان کا قصور نہیں ہے۔ قصور تو ان لوگوں کا ہے جنھوں نے وارثانِ انبیا بن کر یہ افترا پردازیاں کیں۔ ان لوگوں کے اخلاقی زوال اور بغض و کینہ کی حد یہ ہے کہ میری ذات سے گزر کر انھوں نے میرے گھر کی خواتین تک پر بہتان لگائے اور ان کے لیے انتہائی فحش اور بیہودہ زبان استعمال کی۔

ماہنامہ تجلّی دیوبند اپریل ۷۱ء ۷۱، ۷۲

بحوالہ آئین - لاہور - ۱۶ جنوری ۷۱ء

موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لیے
نے کوئی فغفور و خاقان، نے فقیرِ رہ نشیں

(ابلیس کی مجلس شوریٰ)

"قرآن حکیم تمام آسمانی کتابوں سے زیادہ صراحت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ حاکم مطلق بجز اللہ کے اور کوئی نہیں۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ صرف اسی کو یہ حق ہے کہ جیسا چاہے حکم دے اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ وہی ایک ایسا حاکم ہے جس کے احکام میں

کسی چون وچرا کی گنجائش نہیں لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ اطاعت اُس کی فرض ہے اور اس لیے فرض ہے کہ انسان اپنی عین خلقت کے لحاظ سے اس کا بندہ ہے اور در اصل صرف اسی کی بندگی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ کسی انسان کو نہ تو دوسرے انسان پر حاکمیت مطلقہ Absolute Authority حاصل ہے اور نہ کسی انسان پر یہ واجب کیا گیا ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کے حکم کی اطاعت کرے محض اس بنا پر کہ وہ اس خاص شخص کا حکم ہے۔

قرآن کے نزول کا اصلی مقصد یہی ہے کہ انسان کی گردن سے غیر اللہ کی اطاعت کا قلادہ نکال دے اور اللہ یعنی مطاع حقیقی Real Soreign کا بندہ بنانے کے بعد اس کو رائے اور ضمیر کی پوری آزادی عطا کرے۔ چنانچہ انسانی غلامی کے خلاف سب سے بڑھ کر جس کتاب نے جہاد کیا ہے وہ قرآن ہی ہے۔ یہ کتاب کسی انسان کا حق تسلیم نہیں کرتی کہ بطور خود اس کے حلال کیے ہوئے کو حلال اور اس کے حرام کیے ہوئے کو حرام سمجھا جائے اور اس کے حکم اور اس کی ممانعت کی اس طرح اطاعت کی جائے کہ گویا وہ اپنے محکوموں کے لیے بمنزلہ خدا ہے، اس قسم کی اطاعت اور محکومی کو قرآن شرک کا ایک شعبہ قرار دیتا ہے اور جو لوگ اپنے علما و مشائخ کو پنڈتوں اور پروہتوں کو، اور دنیوی حاکموں کو اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ Gods other the God بنا لیتے ہیں انھیں مشرک ٹھہراتا ہے کیونکہ انسان جب کبھی کسی انسان کی ایسی اطاعت کرے گا تو لامحالہ اس کی تہ میں الوہیت کا تصوّر اور عبودیت کا جذبہ ہی کارفرما ہوگا ایک انسان دوسرے انسان کے مقابلہ میں اپنے دل و دماغ اور روح اور جسم کی آزادی سے کلّیتہً دستبردار ہوتا ہی اس وقت ہے جب وہ اس کو یا تو خطا سے بری اور عیوب و نقائص سے پاک اور جزو کل کا عالم سمجھ لیتا ہے، یا یہ سمجھتا ہے کہ وہ ذاتی حق کی بنا پر امر و نہی کا مالک ہے اور اُسے حکومت کا طبعی حق حاصل ہے، یا یہ گمان ہوتا ہے کہ وہی در اصل نفع اور نقصان پہنچانے والا اور رزق دینے اور رزق روکنے والا ہے۔ خدا کے سوا دوسری ہستی کو ان صفات کا حامل سمجھنا ہی شرک اور غلامی کی جڑ ہے اور توحید — جس کا لازمی نتیجہ آزادی ہے — یہ ہے کہ خدا کے سوا تمام چیزوں کو ان صفات سے خالی سمجھا جائے اور ان کے حق حکمرانی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جائے۔"

تفہیمات اوّل صفحہ ۷۸، ۷۹، ۸۰

میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی!

ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ بعض علما اور ارباب حکومت اور بعض دوسرے گروہ کچھ مدت سے یہ کوشش کر رہے ہیں کہ جماعت اسلامی کا لٹریچر کسی طرح ان کے حلقہ اثر میں نہ پہنچنے پائے۔ کہیں اس کے پڑھنے پڑھانے سے منع کیا جا رہا ہے۔ کہیں دار المطالعوں اور کتب خانوں میں اس کی آمد کو روکا جا رہا ہے۔ کہیں ان لوگوں کو مدرسوں اور ملازمتوں سے نکالا جا رہا ہے جن کے پاس یہ لٹریچر دیکھا گیا۔ کہیں دوسرے طریقوں سے یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ لوگ اس لٹریچر سے آشنا نہ ہونے پائیں۔ بلکہ کہیں تو یہ کہا جا رہا ہے کہ جماعت اسلامی کی کوئی چیز سنو بھی نہیں۔ ہم حیران ہیں کہ یہ کان اور آنکھیں بند کرنے کی تدبیریں آخر کس وجہ سے کی جا رہی ہیں؟ ہمارے دلوں میں تو کبھی اس کا خیال تک نہیں آیا کہ ہم سے تعلق رکھنے والے لوگ کسی چیز کے پڑھنے اور کسی کی بات سننے سے احتراز کریں۔ جماعت کے ارکان اور متفقین ہر قسم کی چیزیں پڑھتے ہیں۔ ہر ایک کی بات کھلے دل اور کھلے کانوں سے سنتے ہیں۔ جماعت خود یہ کوشش کرتی ہے کہ اس طبقے کے لوگ دنیا بھر کی چیزیں پڑھیں اور سنیں تاکہ ان کی نظر وسیع ہو اور وہ زیادہ اچھی طرح رائے قائم کرنے کے قابل ہوں۔ حد یہ ہے کہ جماعت کے خلاف جس جس گروہ کی طرف سے جتنا کچھ بھی لکھا جاتا ہے وہ سب جماعت کے حلقوں میں آزادی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے پھر یہ ہمارے دوسرے بھائیوں کو آخر کیا ہوا ہے کہ وہ ہمارے معاملے میں چشم بندی گوش بندی کی پالیسی کو ترجیح دیتے ہیں؟ کیا یہ اس بات کا کھلا اعتراف نہیں ہے کہ وہ اپنے موقف کی کمزوری اور ہمارے موقف کی مضبوطی کا خود احساس رکھتے ہیں؟ کیا اس کا صاف مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے دائرۂ اثر کے لوگوں کو تاریکی میں رکھنا چاہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ بس اُسی وقت تک ان کے اثر میں ہیں جب تک یہ ان کی بنائی ہوئی محفوظ پناہ گاہ میں محصور ہیں؟ اور کیا خود وہ لوگ جو اپنے استادوں اور پیروں اور سرداروں کے باندھے ہوئے اس حصار میں رہنے پر راضی ہو جاتے ہیں اپنی جگہ یہ نہیں سوچتے کہ ایک بہتر اور مضبوط موقف رکھنے والا کب اس بات سے ڈرا کرتا ہے کہ دوسرے شخص کے دلائل سن کر اس کے حلقۂ اثر کے لوگ متزلزل ہو جائیں گے۔

رسائل مسائل دوم ۵۹۱، ۵۹۲

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش — مگر دل ابھی تک ہے زنّار پوش

تمدّن، تصوف، شریعت، کلام — بتانِ عجم کے پجاری تمام

حقیقت خرافات میں کھو گئی — یہ امّت روایات میں کھو گئی

لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب — مگر لذتِ شوق سے بے نصیب

بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا — لغت کے بکھیڑوں میں اُلجھا ہوا

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد — محبّت میں یکتا حمیّت میں فرد

عجم کے خیالات میں کھو گیا — یہ سالک مقامات میں کھو گیا

(ساقی نامہ)

اس وقت مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی بلکہ اصلی مصیبت یہی ہے کہ تفقہ فی الدین اور تدبّر فی الکتٰب والسنّۃ نہیں ہے۔ اسی چیز کے فقدان نے ان کے اعتقادات کو کھوکھلا، ان کی عبادات کو بے روح، ان کی مساعی کو پراگندہ و پریشان، اور ان کی زندگیوں کو بے ضابطہ و بدنظم کر دیا ہے۔ اسلام کے شیدائی ان میں بہت ہیں مگر اسلام کو سمجھنے والے بہت ہی کم ہیں۔ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر مر مٹنے والوں کی کمی نہیں، مگر قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دین اور شریعت کو پیش کیا ہے اس کی روح اور اس کے اصول کو سمجھنے والے آٹے میں نمک کے برابر ہیں بلکہ اتنے بھی نہیں۔ یہ اسی نافہمی کے نتائج ہیں کہ جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے اور سمجھتے ہیں ان میں بدترین قسم کے توہمات اور مشرکانہ عقائد سے لے کر الحاد، دہریت اور کفر کی حد کو پہنچے ہوئے خیالات تک پائے جاتے ہیں اور ان کو اس بات کا احساس تک نہیں کہ جس اسلام کی پیروی کے وہ مدعی ہیں، اس میں اور ان خیالات میں کلّی تباین ہے۔ اس سے بدتر حالت اخلاق و عملی زندگی کی ہے۔ بُت پرستانہ رسوم اور رواجات سے لے کر جدید مغربی تہذیب کے بدترین ثمرات ہر قسم کے اطوار اس قوم میں رائج ہیں جو اپنے آپ کو اسلام کا پیرو کہتی ہے۔ اور اِلّا ماشاء اللہ کسی گروہ کو یہ احساس تک نہیں کہ وہ کہاں کہاں اس قانون کے اصول اور قواعد سے صریح انحراف کر گئی ہے جس پر ایمان رکھنے کا اس کو دعویٰ ہے۔

ہر غلط طریقہ جو کہیں سے آتا ہے ان میں رواج پا جاتا ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں اس کی گنجائش ہے۔ ہر گمراہ کن شخص جو کسی خوش آئند طریقے پر چل رہا ہے بآسانی اس کا رہنما بن جاتا ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہم اس کی پیروی بھی کر سکتے ہیں۔ ہر چیز جو غیر اسلام ہے وہ بے تکلّف اسلام کے ساتھ ایک ہی دماغ اور ایک ہی زندگی میں جمع کر لی جاتی ہے کیونکہ اسلام اور غیر اسلام کا امتیاز علم و فہم پر موقوف ہے، اور اسی کا یہاں فقدان ہے، جو شخص مشرق اور مغرب کا فرق جانتا ہو وہ کبھی اس حماقت میں مبتلا نہیں ہو سکتا کہ مشرق کی طرف چل رہا ہو اور یہ سمجھے کہ مغرب کی سمت جا رہا ہوں۔ یہ فعل صرف ایک جاہل ہی کا ہو سکتا ہے، اور یہی جہالت ہم ایک نہایت قلیل جماعت کے سوا مشرق سے لے کر مغرب تک مسلمانوں میں عام دیکھ رہے ہیں، خواہ وہ ان پڑھ عوام ہوں، یا دستار بند علما، یا خرقہ پوش مشائخ، یا کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ حضرات۔ ان سب کے خیالات اور طور طریقے ایک دوسرے سے بدرجہا مختلف ہیں، مگر اسلام کی حقیقت اور اس کی روح سے ناواقف ہونے میں یہ سب یکساں ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نہایت ہی حکیمانہ ارشاد ہے کہ:

دو گروہ ہیں کہ اگر وہ درست ہوں تو امّت درست رہے اور اگر وہ بگڑ جائیں تو امّت بگڑ جائے، حکمراں، اور علما۔

مسلمانوں کی تاریخ کا ہر باب اس ارشادِ نبوی کی صداقت پر گواہ ہے اور سب سے زیادہ آج ہم اس کی صداقت کو نمایاں دیکھ رہے ہیں، اگر ہمارے حکمرانوں اور علما میں تقویٰ اور دین کا صحیح علم ہوتا تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی، اور آج بھی اگر مسلمان قوموں کو ایسے رہنما میسّر آ جائیں تو حالات کے اس درجہ بگڑ جانے پر اصلاح سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

تفہیمات اول ۳۴، ۳۵

محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی
اس دور میں ہے شیشۂ عقائد کا چور چور

(مذہب)

انیسویں صدی میں مادیت اپنے کمال کو پہنچ گئی۔ فوکت UEGT بوچنر Buchner

سو لیے (Cyelbe) کومت (Comte) موبشات (Mobechotte)
اور دوسرے حکما و فلاسفہ نے مادہ اور اس کے خواص کے سوا ہر شے کے وجود کو
باطل قرار دیا۔ مل (Mill) نے فلسفہ میں تجربیّت اور اخلاق میں افادیت
(Utilitarianism) کو فروغ دیا۔ اسپنسر (Spencer) نے فلسفیانہ ارتقائیت
اور نظام کائنات کے خود بخود پیدا ہونے اور زندگی کے آپ سے آپ رونما ہو جانے
کا نظریہ پوری قوّت کے ساتھ پیش کیا۔ حیاتیات (Biology) عضویات
(Physiology) ارضیات (Geology) اور حیوانیات (Zoology)
کے اکتشاف، عملی سائنس کی ترقی اور مادّی وسائل کی کثرت نے یہ خیال پوری پختگی
کے ساتھ دلوں میں راسخ کر دیا کہ کائنات آپ سے آپ وجود میں آئی۔ کسی نے اس
کو پیدا نہیں کیا آپ سے آپ لگے بندھے قوانین کے تحت چل رہی ہے کوئی اس کو چلانے
والا نہیں ہے۔ آپ سے آپ ترقّی کے منازل طے کرتی رہی ہے۔ کسی فوق الطبیعت ہستی
کا ہاتھ اس خود بخود حرکت کرنے والی مشین میں کام نہیں کر رہا ہے۔ بے جان مادّے
میں جان کسی امر سے نہیں پڑتی بلکہ خود مادّہ جب اپنے نظم میں ترقی کرتا ہے تو اس میں
جان پڑ جاتی ہے، نمو، حرکت ارادی، احساس، شعور، فکر سب اسی ترقی یافتہ مادّہ
کے خواص ہیں۔ حیوان اور انسان سب کے سب مشینیں ہیں جو طبعی قوانین کے تحت
چل رہی ہیں۔ ان مشینوں کے پرزے جس طور سے ترتیب پاتے ہیں اُسی طور کے
افعال ان سے صادر ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی اختیار اور کوئی آزاد ارادہ (Ereewil)
نہیں ہے۔ ان کے نظام کا درہم برہم ہو جانا، اُن کی انرجی کا خرچ ہو جانا ہی ان کی موت ہے
جو فنائے محض کی ہم معنی ہے جب مشین ٹوٹ پھوٹ گئی تو اس کے خواص بھی باطل ہو گئے۔
اب ان کے لیے حشر اور بار دیگر پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

یہی وہ فلسفہ و سائنس ہے جس نے مغربی تہذیب کو پیدا کیا ہے۔ اس میں نہ کسی
علیم و قدیر خدا کے خوف کی گنجائش ہے۔ نہ نبوّت اور وحی و الہام کی ہدایت کا کوئی وزن۔
نہ موت کے بعد کسی دوسری زندگی کا تصوّر، نہ حیات دنیا کے حساب و کتاب کا کوئی
کھٹکا، نہ انسان کی ذاتی ذمہ داری کا کوئی سوال، نہ زندگی کے حیوانی مقاصد سے بالاتر
کسی مقصد اور کسی نصب العین کا کوئی امکان۔ یہ خالص مادّی تہذیب ہے۔ اس کا

پورا نظام خدا ترسی، راست روی، صداقت پسندی، حق جوئی، دیانت، امانت،
نیکی، حیا، پرہیزگاری اور پاکیزگی، کے تصوّرات سے خالی ہے جن پر اسلامی تہذیب
کی بنیاد رکھی گئی ہے، اس کا نظریہ اسلام کے نظریہ کی بالکل ضد ہے۔ اس کا راستہ
اس راستہ کی عین مخالف سمت میں ہے جو اسلام نے اختیار کیا ہے۔ اسلام جن
چیزوں پر انسانی اخلاق اور تمدن کی بنا رکھتا ہے ان کو یہ تہذیب بیخ و بن سے اکھاڑ دینا
چاہتی ہے۔ اور یہ تہذیب جن بنیادوں پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی عمارت قائم
کرتی ہے ان پر اسلام کی عمارت ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں ٹھہر سکتی ...

تنقیحات ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق ان کو
آنکھ جن کی ہوئی محکومی و تقلید سے کور

(اقوام مشرق)

اس کے بعد ایک دوسرا دور آیا جس میں مسلمانوں نے نئی تحقیقات کا کام
قریب قریب ترک کر دیا جو کچھ علوم محققیّن سلف سے ملے تھے انہی کو پڑھتے پڑھاتے
رہے۔ انہی کے اوپر حاشیے چڑھاتے رہے۔ حاشیے در حاشیے لکھتے چلے گئے، لیکن
نئی تحقیقات اور علوم و فنون میں آگے بڑھنے کا کام انھوں نے چھوڑ دیا اور دوسری طرف
اسی زمانہ میں اہل مغرب نے اس کا بیڑا اُٹھایا اور تحقیقات علمی شروع کیں۔ انھوں
نے نئی نئی معلومات جمع کرنی شروع کیں۔ انھوں نے ان کو مرتب کر کے نئے فلسفے
اور نئے نظامہائے فکر و عمل کی تشکیل شروع کر دی۔ اس کا جو نتیجہ ہوا وہ یہ کہ ایک
طرف مسلمان رفتہ رفتہ جمود میں مبتلا ہوتے چلے گئے اور دوسری طرف علمی تحقیق کی بدولت
مغرب کی طاقت روز بروز بڑھنی شروع ہو گئی۔ ظاہر ہے جب وہ نئی نئی معلومات
جمع کریں گے اور نئی نئی تحقیقات کریں گے تو نئے نئے ذرائع اور وسائل ان کے
ہاتھ میں ہوں گے۔ ان کے ذہنوں میں زندگی اور بیداری پیدا ہو گی اور آپ اس کو
چھوڑ دیں گے تو آپ کے اندر لا محالہ جمود اور تعطّل پیدا ہو گا۔ آپ اپنی تاریخ کو اٹھا کر
دیکھیے اٹھارھویں صدی تک پہنچتے پہنچتے مسلمانوں اور اہل مغرب کے درمیان اتنا نمایاں

فرق ہوگیا کہ مسلمان مغلوب ہونا شروع ہو گئے اور مغربی قومیں ان پر غالب ہونا
شروع ہوگئیں۔ دو تین سو برس جمود میں گئے اور اس جمود کا نتیجہ آخر کار یہ ہوا کہ مسلمان
مغلوب ہونا شروع ہوئے اور مغربی قومیں غالب آنے لگیں۔ اٹھارویں صدی سے
مسلمانوں پر مغربی قوموں کی یورش اور ان کی فتوحات خود اس بات پر شاہد ہیں کہ علمی
تحقیقات چھوڑ دینے اور جمود اختیار کرنے کے نتائج ہم نے کیا بھگتے اور انھوں نے اس
کام کا بیڑا اٹھانے کے لیے کیا فوائد حاصل کیے۔

جیساکہ میں نے آپ سے عرض کیا کہ جمود کا لازمی نتیجہ انحطاط ہے اور انحطاط کا لازمی
نتیجہ مغلوبیت ہوتا ہے لیکن اگر علمی تحقیقات کی جائے اور مسلسل کی جائے اور نئی نئی
معلومات فراہم کی جائیں اور ان کی بنیاد پر نئے نئے فلسفہ زندگی تیار کیے جائیں تو اس
کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو قوم غالب ہے اور جو تحقیقات کر رہی ہے علوم وفنون کو
جمع کر رہی ہے، معلومات فراہم کر رہی ہے اور ان کو مرتب کر کے ایک تہذیب بنا رہی
ہے وہ لازماً اپنی تہذیب کے ساتھ غالب آتی ہے۔ محض اپنی سیاست اپنے اسلحہ اور اپنی
فوج ہی سے غلبہ نہیں پاتی بلکہ اس کی پوری تہذیب مغلوب قوم پر غالب آنا شروع ہو جاتی
ہے۔ یہ نقشہ پہلے بھی ہم دیکھ چکے ہیں اور آج بھی دیکھ رہے ہیں۔

اسلام کے غلبہ کے دور میں تمام دنیا یہ محسوس کرتی تھی کہ تہذیب ہے تو مسلمانوں
کی ہے، تمدن ہے تو مسلمانوں کا ہے۔ فکر و علم ہے تو مسلمانوں کا ہے اب اس کے برعکس
یہ صورت حال پیدا ہوئی کہ خود مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات اتر گئی ہے کہ کوئی تہذیب ہے
تو اہل مغرب کی ہے۔ کوئی تمدن ہے تو اہل مغرب کا ہے۔ علم وفن جو کچھ بھی ہے اہل مغرب
کا ہے ہمارا کام ان کا پس خوردہ کھانا ہے، ہمارا کام ان کے پیچھے چلنا ہے، ہمارا کام ان کی تقلید کرنا ہے۔

ماہنامہ تجلّی دیوبند جون ۶۱ء ۴۵، ۴۶

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

سب سے پہلی چیز جس کو قرآن مجید نے انسان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش

کی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا انسان کے لیے ایک عارضی جائے قیام ہے۔ اس کے لیے صرف
یہی ایک زندگی نہیں ہے بلکہ اس کے بعد ایک دوسری زندگی اس سے بہتر اور پائندہ تر
بھی ہے جس کے فوائد یہاں کے فائدوں سے زیادہ فراواں اور جس کے نقصانات یہاں
کے نقصانات سے زیادہ سخت ہیں جو شخص اس دنیا کے مظاہر سے دھوکہ کھا کر اسی
کی لذتوں اور منفعتوں کے پیچھے پڑا رہتا ہے اور ان کو حاصل کرنے کے لیے ایسی کوشش
کرتا ہے جن کی بدولت اس دوسری زندگی کی لذتیں اور منفعتیں اُسے حاصل نہیں ہو سکتیں۔
وہ بہت برا سودا کرتا ہے اور حقیقت میں اس کی یہ تجارت سراسر نقصان کی تجارت
ہے۔ اسی طرح جو شخص اس دنیا کے نقصان ہی کو نقصان سمجھتا ہے اور اس سے بچنے کے
لیے ایسی سعی کرتا ہے جس سے وہ اپنے آپ کو دوسری زندگی کے نقصان کا مستحق
بنا لیتا ہے، وہ بہت بڑی حماقت کا مرتکب ہوتا ہے اور اس کا یہ فعل کسی طرح
مقتضائے دانشمندی نہیں ہے۔

اسلامی تہذیب ۳۲۰، ۳۲۱

نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسمِ مجاز
(مسجد قرطبہ)

ان سے کہو "ہمیں ہرگز کوئی (برائی یا بھلائی) نہیں پہنچتی مگر وہ جو اللہ نے ہمارے
لیے لکھ دی ہے۔ اللہ ہی ہمارا مولیٰ ہے اور اہل ایمان کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے[۱]

[۱] یہاں دنیا پرست اور خدا پرست کی ذہنیت کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔
دنیا پرست جو کچھ کرتا ہے اپنے نفس کی رضا کے لیے کرتا ہے اور اس کے نفس کی خوشی
بعض دنیوی مقاصد کے حصول پر منحصر ہوتی ہے۔ یہ مقاصد اُسے حاصل ہو جائیں تو وہ پھول
جاتا ہے اور حاصل نہ ہوں تو اس پر مردنی چھا جاتی ہے۔ پھر اس کا سہارا تمام تر مادی اسباب
پر ہوتا ہے۔ وہ سازگار ہوں تو اس کا دل بڑھنے لگتا ہے اور ناسازگار ہوتے نظر آئیں تو اس
کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ بخلاف اس کے خدا پرست انسان جو کچھ کرتا ہے اللہ کی رضا کے
لیے کرتا ہے اور اس کام میں اس کا بھروسہ اپنی قوت یا مادی اسباب پر نہیں بلکہ اللہ کی ذات

پر ہوتا ہے۔ راہ حق میں کام کرتے ہوئے اس پر مصائب نازل ہوں یا کامرانیوں کی بارش ہو، دونوں صورتوں میں وہ یہی سمجھتا ہے کہ جو کچھ اللہ کی مرضی ہے وہ پوری ہو رہی ہے۔ مصائب اس کا دل نہیں توڑ سکتے اور کامیابی اس کو اتراہٹ میں مبتلا نہیں کر سکتیں کیونکہ اوّل تو وہ ان کو اپنے حق میں خدا کی طرف سے سمجھتا ہے اور اُسے ہر حال میں یہ فکر ہوتی ہے کہ خدا کی ڈالی ہوئی اس آزمائش سے بخیریت گزر جائے۔ دوسرے اس کے پیش نظر دنیوی مقاصد نہیں ہوتے کہ ان کے لحاظ سے وہ اپنی کامیابی یا ناکامی کا اندازہ کرے۔ اس کے سامنے تو رضائے الٰہی کا مقصد وحید ہوتا ہے اور اس مقصد سے اس کے قریب یا دور ہونے کا پیمانہ کسی دنیوی کامیابی کا حصول یا عدم حصول نہیں ہے بلکہ صرف یہ امر ہے کہ راہ خدا میں جان و مال کی بازی لگانے کا جو فرض اس پر عائد ہوتا تھا اُسے اس نے کہاں تک انجام دیا۔ اگر یہ فرض اس نے ادا کر دیا ہو خواہ دنیا میں اس کی بازی بالکل ہی ہر گئی ہو لیکن اُسے پورا بھروسہ رہتا ہے کہ جس خدا کے لیے اس نے مال کھپایا اور جان دی ہے وہ اس کے اجر کو ضائع کرنے والا نہیں ہے۔ پھر دنیوی اسباب سے وہ آس ہی نہیں لگاتا کہ ان کی سازگاری یا ناسازگاری اس کو خوش یا رنجیدہ کرے۔ اس کا سارا اعتماد خدا پر ہوتا ہے جو عالم اسباب کا حاکم ہے اور اس کے اعتماد پر وہ ناسازگار حالات میں بھی اُسی عزم و ہمت کے ساتھ کام کیے جاتا ہے جس کا اظہار اہل دنیا سے صرف سازگار حالات میں ہی ہوا کرتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان دنیا پرست منافقین سے کہہ دو کہ ہمارا معاملہ تمہارے معاملے سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ تمہاری خوشی اور رنج کے قوانین کچھ اور ہیں اور ہمارے کچھ اور۔ تم اطمینان اور بے اطمینان کسی اور ماخذ سے لیتے ہو اور ہم کسی اور ماخذ سے۔

تفہیم القرآن ۲ ۲۰۰

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہ گزر

(دنیائے اسلام)

یہ فتنہ جس کے ظاہر ہونے کا سید الکونین کو اندیشہ تھا، حقیقت میں ویسا ہی مہلک ثابت ہوا جیسا آپ نے فرمایا تھا۔ قرنِ اوّل سے آج تک اسلام اور مسلمانوں پر جو تباہی

بھی نازل ہوئی ہے اسی کی بدولت ہوئی ہے۔ وصال نبوی کے چند ہی برس بعد ہاشمی اقتدار کے خلاف اموی عصبیت کا فتنہ اٹھا اور اس نے اسلام کے اصلی نظام سیاست کو ہمیشہ کے لیے درہم برہم کر دیا پھر اس نے عربی، عجمی اور ترکی عصبیت کی شکل میں ظہور کیا اور اسلام کی سیاسی وحدت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ پھر مختلف ممالک میں جو مسلمان سلطنتیں قائم ہوئیں ان سب کی تباہی میں سب سے زیادہ اس فتنہ کا ہاتھ تھا۔ قریب ترین زمانہ میں دو سب سے بڑی مسلمان سلطنتیں ہندوستان اور ٹرکی کی تھیں۔ ان دونوں کو اس فتنہ نے تباہ کیا۔ ہندوستان میں مغل اور ہندوستانی کی تفریق نے سلطنت مغلیہ کو ختم کیا اور ٹرکی میں ترک، عرب اور کرد کی تفریق تباہی کی موجب ہوئی۔

اسلام کی پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ جائیے۔ جہاں کوئی طاقتور سلطنت آپ کو نظر آئے گی اس کی بنیاد میں آپ کو بلاامتیاز جنسیت مختلف نسلوں اور مختلف قوموں کا خون ملے گا، ان کے مدبر، ان کے سپہ سالار، ان کے اہل قلم ان کے اہل سیف سب کے سب مختلف الاجناس پائے جائیں گے۔ آپ عراقی کو افریقہ میں، شامی کو ایران میں، افغانی کو ہندوستان میں، مسلمان حکومتوں کو اس جانبازی، دیانت، صداقت اور امانت کے ساتھ خدمت کرتے ہوئے دیکھیں گے جس سے وہ خود اپنے وطن کی خدمت کرتا۔ مسلمان سلطنتیں کبھی اپنے مردانِ کار کی فراہمی میں کسی ایک ملک یا ایک نسل کے وسائل پر منحصر نہیں رہیں، ہر جگہ سے قابل دماغ اور کارپرداز ہاتھ ان کے لیے جمع ہوئے اور انھوں نے ہر دارالاسلام کو اپنا وطن اور گھر سمجھا، مگر جب نفسانیت خود غرضی اور عصبیت کا فتنہ اُٹھا اور مسلمانوں میں مرز بوم اور رنگ و نسل کے امتیازات نے راہ پائی تو وہ ایک دوسرے سے بغض و حسد کرنے لگے، دھڑے بندیوں اور سازشوں کا دور دورہ ہوا، جو قوتیں دشمنوں کے خلاف صرف ہوتی تھیں وہ آپس میں ایک دوسرے کے خلاف صرف ہونے لگیں۔ مسلمانوں میں خانہ جنگی برپا ہوئی اور بڑی بڑی مسلمان طاقتیں صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔

مسئلہ قومیت ۴۵، ۴۶، ۴۷

نذرانہ نہیں سود ہے پیران حرم کا
ہر خرقہ سالوس کے اندر ہے مہاجن

(باغی مرید)

صوفیا کا حال دیکھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ چند پاکیزہ ہستیوں کے سوا جنھوں نے اسلام کے حقیقی تصوف پر خود عمل کیا اور دوسروں کو اس کی تعلیم دی۔ باقی سب ایک ایسے تصوّف کے معلّم و مبلّغ تھے جس میں اشراقی اور ویدانتی اور مانوی اور زردشتی فلسفوں کی آمیزش ہو چکی تھی اور جس کے طریقوں میں جوگیوں اور راہبوں اور اشراقیوں اور رواقیوں کے طریقے اس طرح مل جل گئے تھے کہ اسلام کے خالص عقائد و اعمال سے ان کو مشکل ہی سے کوئی مناسبت رہ گئی تھی۔ خلق خدا ان کی طرف خدا کا راستہ پانے کے لیے رجوع کرتی تھی اور وہ ان کو دوسرے راستے بتاتے تھے پھر جب اگلوں کے بعد پچھلے ان کے سجّادوں پر بیٹھے تو انھوں نے میراث میں دوسری املاک کے ساتھ اپنے بزرگوں کے مرید پائے اور ان سے تربیت و ارشاد کے بجائے صرف نذرانوں کا تعلق باقی رکھا۔ ان حلقوں کی تمام تر کوشش پہلے بھی یہ رہی ہے اور آج بھی ہے کہ جہاں جہاں بھی پیری و پیرزادگی کا اثر پھیلا ہوا ہے وہاں دین کا صحیح علم کسی طرح نہ پہنچنے پائے کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ عوام الناس پر ان کی خداوندی کا طلسم اسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے جب تک وہ اپنے دین سے جاہل رہیں۔

اسلامی نظام زندگی ۴۲۸، ۴۲۹

نااہل کو حاصل ہے کبھی قوت و جبروت
ہے خوار زمانے میں کبھی جوہر ذاتی

(تقدیر)

موجودہ نظام میں یہ نقص ہے کہ یہاں قدرت کے انعامات کی تقسیم انسان کے عمل اور اس کی خوبی پر منحصر نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایسے اسباب پر مبنی ہے جن میں ذاتی اعمال اور نفسی صلاحیتیں محض ایک سبب کی حیثیت رکھتی ہیں اور دوسرے قوی تر اسباب ان کی تاثیر کو ضعیف بلکہ بسا اوقات بالکل زائل کر دیتے ہیں۔ اس وجہ سے انعامات کی

تقسیم میں استحقاق ذاتی کو دخل نہیں ہوتا یا ہوتا بھی ہے تو بہت کم۔ یہاں ایک شخص تمام عمر ظلم اور فسق کرنے کے باوجود خوش حالی اور دنیوی برکات سے متمتع ہو سکتا ہے، اور ایک شخص زندگی بھر ایمان داری اور پرہیزگاری کے ساتھ بسر کرنے کے باوجود خستہ حالی اور دنیوی مصائب سے پراگندہ حال رہ سکتا ہے یہ نقص تکمیل کا محتاج ہے اور حکمت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ موجودہ نظام ترقی کر کے ایک ایسے نظام میں تبدیل ہو جائے جس میں عدل کے ساتھ جزا و سزا کی تقسیم ہو، اور ہر شخص کو وہی ملے جس کا وہ اپنے ذاتی حسن و قبح کی بنا پر مستحق ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ دار آخرت کا نظام ایسا ہی ہوگا۔

اسلامی تہذیب اصول و مبادی ۳۰۴، ۳۰۵

وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا

(ما از پے سنائی و عطار آمدیم)

اسلام اس زمانے میں دنیا میں غالب آسکتا ہے یا نہیں؟ دنیا کی قومیں اسلام کو قبول کر سکتی ہیں یا نہیں؟ کر سکتی ہیں تو کیسے؟ اور اسلام اس زمانے میں قابل عمل بھی ہے یا نہیں؟ یہ سوال آج کل بڑی کثرت سے چھیڑا جاتا ہے۔

میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ کسی زمانے میں بھی زمانے نے خود آگے بڑھ کر نہیں کہا تھا کہ میں اسلام کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ رسول کریمؐ نے جب عرب کی جاہلی سوسائٹی میں اسلام کی دعوت دی تھی تو کب زمانے نے اٹھ کر پکار کے یہ کہا تھا کہ اے محمدؐ! ہم تمھاری اس دعوت کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اصل انحصار تو اس طاقت ور اور مضبوط داعی پر ہوتا ہے جو یہ کہے کہ "اے زمانے! اگر تو مجھ سے موافقت نہیں کرتا تو میں تجھے موافق بنا کر چھوڑوں گا۔" ویسے تو کہاں اسلام اور کہاں کیمونزم لیکن بربنائے بحث کیمونسٹ انقلاب کی کامیابی ہی کو دیکھ لیجیے جو آپ کے سامنے کی بات ہے۔ حالانکہ اسلام اتنا Radical Change نہیں چاہتا، جیسا کہ کیمونزم چاہتا ہے۔ مکمل طور پر لوگوں کی شخصی ملکیتوں کو ساقط کر دینا اور تمام املاک کے اوپر حکومت کا قابض ہو جانا اور ایک مرکز کے اوپر ساری قومی ثروت

کا جمع ہو جانا یہ بہت بڑا تغیر ہے۔ اسلام تو اتنا بڑا تغیر نہیں چاہتا لیکن کچھ لوگ اُٹھے اور انھوں نے یہ عزم کر لیا کہ ہمیں اس نظام کو نافذ کرنا ہے تو وہ کامیاب ہو گئے۔

اسی طرح یہ سوال بھی بالکل لغو ہے کہ اسلام آج قابل عمل ہے یا نہیں؟ اسلام ہر زمانے میں قابل عمل تھا، آج بھی ہے اور قیامت تک قابل عمل رہے گا۔ اصل سوال جس پر اس کا انحصار ہے وہ یہ ہے کہ کیا کوئی قوم دنیا میں ایسی موجود ہے جو پورے کے پورے اسلام کو اپنانے کے لیے تیار ہو؟ جیسا کہ میں نے آغاز میں بتایا تھا کہ ہماری تاریخ کا آغاز ہی اس چیز سے ہوا تھا کہ عرب کی پوری کی پوری قوم اس بات کے لیے تیار ہو گئی تھی کہ اپنے پورے معاشرتی، معاشی، سیاسی اور تمدّنی نظام کو اسلام پر قائم کرے، اپنی انفرادی سیرتوں اور اجتماعی احوال کو اسلام کے مطابق ڈھالے۔ اس نے عہد کیا تھا کہ دنیا میں اسلام کی علمبردار بن کر اُٹھے گی، اسی کے لیے جیے گی اور اسی کے لیے مرے گی۔

جب ایسی قوم دنیا میں پیدا ہو گئی تو دیکھ لیجیے کہ کس طرح وہ دنیا پر بم کی طرح پھٹی اور کس طرح دنیا پر اس کے اثرات آج تک موجود ہیں۔

اگر اسی طرح سے کوئی قوم پوری طرح سے اسلام کو اپنائے اور اپنا پورا نظام زندگی اس کے مطابق چلائے اور اسی کے لیے جینے اور مرنے کو تیار ہو تو میرا خیال ہے کہ آج دنیا اسلام قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔

لوگوں کے لیے ناممکن ہے کہ چلتے پھرتے اسلام کو دیکھیں اور اس کو قبول نہ کریں۔ البتّہ اگر آپ زبانی تقریروں اور کتابوں کے ذریعہ اسلام پھیلانے کی کوشش کرتے رہیں گے تو قیامت تک آپ یہ "شغل" جاری رکھیے، دنیا کو اس بات پر قائل کرنا مشکل ہو گا کہ اسلام قابل عمل بھی ہے۔

ماہ نامہ تجلّی دیوبند فروری، مارچ ۶۷ء ۵۱، ۵۲

وہی سجدہ ہے لائق اہتمام
کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام

کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور نہیں کیا، جس نے ابراہیم سے جھگڑا

کیا تھا[۲۹۰]؟ جھگڑا اس بات پر کہ ابراہیم کا رب کون ہے، اور اس بنا پر کہ اس شخص کو اللہ نے حکومت دے رکھی تھی[۲۹۱]۔ جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے، تو اس نے جواب دیا، زندگی و موت میرے اختیار میں ہے ابراہیم نے کہا: اچھا، اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا اسے مغرب سے نکال لا۔ یہ سن کر وہ منکر حق ششدر رہ گیا[۲۹۲]۔

---

[۲۹۰] اس شخص سے مراد نمرود ہے، جو حضرت ابراہیم کے وطن (عراق) کا بادشاہ تھا۔ جس واقعے کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے، اس کی طرف کوئی اشارہ بائیبل میں نہیں ہے۔ مگر تلمود میں یہ پورا واقعہ موجود ہے اور بڑی حد تک قرآن کے مطابق ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم کا باپ نمرود کے ہاں سلطنت کے سب سے بڑے عہدہ دار Chief Officer of the State کا منصب رکھتا تھا۔ حضرت ابراہیم نے جب کھلّم کھلّا شرک کی مخالفت اور توحید کی تبلیغ شروع کی اور بت خانے میں گھس کر بتوں کو توڑ ڈالا تو ان کے باپ نے خود ان کا مقدمہ بادشاہ کے دربار میں پیش کیا اور پھر وہ گفتگو ہوئی، جو یہاں بیان کی گئی ہے۔

[۲۹۱] یعنی اس جھگڑے میں جو بات مابہ النزاع تھی، وہ یہ تھی کہ ابراہیم اپنا رب کس کو مانتے ہیں۔ اور نزاع اس وجہ سے پیدا ہوئی تھی کہ اُس جھگڑنے والے شخص، یعنی نمرود کو خدا نے حکومت عطا کر رکھی تھی۔ ان دو فقروں میں جھگڑنے کی نوعیت کی طرف جو اشارہ کیا گیا ہے، اس کو سمجھنے کے لئے حسب ذیل حقیقتوں پر نگاہ رہنی ضروری ہے:

(۱) قدیم زمانے سے آج تک تمام مشرک سوسائٹیوں کی یہ مشترک خصوصیت رہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو رب العالمین اور خدائے خدائیگان کی حیثیت سے تو مانتے ہیں مگر صرف اسی کو رب اور تنہا اسی کو خدا اور معبود نہیں مانتے۔

(۲) خدائی کو ہمیشہ مشرکین نے دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک فوق الفطری Supernatural خدائی جو سلسلۂ اسباب پر حکمراں ہے اور جس کی طرف انسان اپنی حاجات اور مشکلات میں دستگیری کے لیے رجوع کرتا ہے۔ اس خدائی میں وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ارواح، فرشتوں اور جنّوں اور سیّاروں اور دوسری بہت سی ہستیوں کو شریک ٹھہراتے ہیں، ان سے دعائیں مانگتے ہیں، ان کے سامنے مراسم پرستش

بجالاتے ہیں اور ان کے آستانوں پر نذر و نیاز پیش کرتے ہیں۔ دوسری تمدّنی اور سیاسی معاملات کی خدائی (یعنی حاکمیت) جو قوانینِ حیات مقرر کرنے کی مجاز اور اطاعتِ امر کی مستحق ہو اور جسے دنیوی معاملات میں فرمانبرداری کے مطلق اختیارات حاصل ہوں۔ اس دوسری قسم کی خدائی کو دنیا کے تمام مشرکین نے قریب قریب ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ سے سلب کر کے یا اس کے ساتھ شاہی خاندانوں یا مذہبی پروہتوں اور سوسائٹی کے اگلے پچھلے بڑوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اکثر شاہی خاندان اسی دوسرے معنی میں خدائی کے مدعی ہوئے ہیں اور اسے مستحکم کرنے کے لیے انھوں نے بالعموم پہلے معنی والے خداؤں کی اولاد ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور مذہبی طبقے اس معاملے میں ان کے ساتھ شریک سازش رہے ہیں۔

(۳) نمرود کا دعوائے خدائی بھی اسی دوسری قسم کا تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کا منکر نہ تھا۔ اس کا دعویٰ یہ نہیں تھا کہ زمین و آسمان کا خالق اور کائنات کا مدبّر وہ خود ہے۔ اس کا کہنا یہ نہیں تھا کہ اسباب علم کے پورے سلسلے پر اسی کی حکومت چل رہی ہے بلکہ اُسے دعویٰ اس امر کا تھا کہ اس ملک عراق کا اور اس کے باشندوں کا حاکم مطلق میں ہوں، میری زبان قانون ہے، میرے اوپر کوئی بالاتر اقتدار نہیں ہے، جس کے سامنے میں جوابدہ ہوں اور عراق کا ہر وہ باشندہ باغی و غدّار ہے جو اس حیثیت سے مجھے اپنا رب نہ مانے یا میرے سوا کسی اور کو رب تسلیم کرے۔

(۴) ابراہیم علیہ السلام نے جب کہا کہ میں صرف ایک رب العالمین ہی کو خدا اور معبود اور رب مانتا ہوں اور اس کے سوا سب کی خدائی اور ربوبیت کا قطعی طور پر منکر ہوں، تو سوال صرف یہی پیدا نہیں ہوا کہ قومی مذہب اور مذہبی معبودوں کے بارے میں ان کا یہ نیا عقیدہ کہاں تک قابل برداشت ہے، بلکہ یہ سوال بھی اُٹھ کھڑا ہوا کہ قومی ریاست اور اس کے مرکزی اقتدار پر اس عقیدے کی جو زد پڑتی ہے۔ اُسے کیوں کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم جرم بغاوت کے الزام میں نمرود کے سامنے پیش کیے گئے۔

اگرچہ حضرت ابراہیم کے پہلے فقرے ہی سے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ رب اللہ کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تاہم نمرود اس کا جواب ڈھٹائی سے دے گیا۔ لیکن دوسرے فقرے کے بعد اس کے لیے مزید ڈھٹائی سے کچھ کہنا مشکل ہو گیا۔ وہ خود بھی جانتا

تھا کہ آفتاب و ماہتاب اُسی خدا کے زیرِ فرمان ہیں، جس کو ابراہیم نے رب مانا ہے۔ پھر وہ کہتا تو آخر کیا کہتا؟ مگر اس طرح جو حقیقت اس کے سامنے بے نقاب ہو رہی تھی، اس کو تسلیم کر لینے کے معنی اپنی مطلق العنان فرماں روائی سے دست بردار ہو جانے کے تھے جس کے لیے اس کا نفس کا طاغوت تیار نہ تھا۔ لہٰذا وہ صرف ششدر ہی ہو کر رہ گیا۔ خود پرستی کی تاریکی سے نکل کر حق پرستی کی روشنی میں نہ آیا۔ اگر اس طاغوت کے بجائے اس نے خدا کو اپنا ولی و مددگار بنایا ہوتا تو اس کے لیے حضرت ابراہیم کی اس تبلیغ کے بعد راہِ راست کھُل جاتی۔

تلمود کا بیان ہے کہ اس کے بعد اس بادشاہ کے حکم سے حضرت ابراہیم قید کر دیے گئے۔ دس روز تک وہ جیل میں رہے۔ پھر بادشاہ کی کونسل نے ان کو زندہ جلانے کا فیصلہ کیا اور ان کے آگ میں پھینکے جانے کا وہ واقعہ پیش آیا جو سورۂ انبیا، رکوع ۵ میں بیان ہوا ہے۔

تفہیم القرآن ا ۱۹۸ - ۲۰۰

وہ نبوّت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش
جس نبوّت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

(نبوّت)

بس دنیا میں انبیا علیہم السلام کے مشن کا منتہائے مقصود یہ رہا ہے کہ حکومت الٰہیہ قائم کر کے اس پورے نظام کو نافذ کریں جو وہ خدا کی طرف سے لائے تھے۔ وہ اہلِ جاہلیت کو یہ حق تو دینے کے لیے تیار تھے کہ اگر چاہیں تو اپنے جاہل اعتقادات پر قائم رہیں اور جس حد کے اندر ان کے عمل کا اثر ان ہی کی ذات تک محدود رہتا ہے اس میں اپنے جاہل طریقوں پر چلتے رہیں مگر وہ انھیں یہ حق دینے کے لیے تیار نہ تھے اور فطرتاً نہ دے سکتے تھے کہ اقتدار کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں رہیں اور وہ انسانی زندگی کے معاملات کو طاقت کے زور سے جاہلیت کے قوانین پر چلائیں۔ اسی وجہ سے تمام انبیا نے سیاسی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی۔ بعض کی مساعی صرف زمین تیار کرنے کی حد تک رہی جیسے حضرت ابراہیم علیہ السّلام۔ بعض نے انقلابی تحریک عملاً شروع کر دی مگر حکومت الٰہیہ قائم کرنے سے پہلے ہی ان کا کام ختم ہو گیا جیسے حضرت مسیح علیہ السّلام

اور بعض نے اس تحریک کو کامیابی کی منزل تک پہنچا دیا جیسے حضرت یوسف علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

تجدید و احیائے دین ۳۲، ۳۳

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

(شمع و شاعر)

مسلمان جب اپنے اصل مقصدِ زندگی کو بھول کر اور اپنے حقیقی مشن کو چھوڑ کر دنیا پرستی میں مبتلا ہو گئے اور دینداری کے معنی ان کی نگاہ میں صرف یہ رہ گئے کہ عبادات اور معاشرت میں چند شرعی طور طریقوں کی پابندی کی جاتی رہے، خواہ مقاصد زندگی وہی ہوں جو دنیا پرستوں کے ہوتے ہیں، خواہ نظام اجتماعی کی زمام کار صالحین کے ہاتھ میں ہو یا فجّار کے ہاتھ میں اور خواہ اجتماعی امامت اپنے اصول اور نصب العین کے اعتبار سے اسلامی ہو یا غیر اسلامی، تو اس غفلت کی سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں اس شکل میں دی گئی کہ ان کی بڑی بڑی آبادیاں پے در پے کفّار کی تابع فرمان ہوتی چلی گئیں، لیکن انھوں نے اور ان کے علما نے اُسے سزا سمجھنے اور اس اصلی قصور کی جس کی پاداش میں یہ سزا ملی تھی، تلافی کرنے کے بجائے الٹا یہ سوچنا شروع کر دیا کہ نظامِ کفر میں "اسلامی زندگی" کیسے برتی جائے، چنانچہ "اضطرار" کے بہانے سے اس شرعی اور اسلامی زندگی کا ایک نیا نقشہ مرتب کیا گیا جو غیر شرعی اور غیر اسلامی نظام کے اندر بسر کی جا سکے۔

اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مزید سزاؤں کا سلسلہ شروع ہوا تاکہ انھیں آزمایا جائے کہ یہ سنبھل کر پلٹتے ہیں یا اپنی ضلالت میں بعید سے بعید تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اضطرار جسے ابتداً صرف ایک ہی اضطرار سمجھا گیا تھا، اللہ کی سنّت کے مطابق آگے بڑھا اور اس نے دائمی، روز افزوں اور غیر متناہی اضطراروں کی شکل اختیار کر لی۔ ہر نئے اضطرار نے مطالبہ کیا کہ جو حدود تم نے کفر کے اندر اسلام اور کفر کے ماتحت اسلامی زندگی کے لیے تجویز کیے ہیں انھیں سکیڑو اور سکیڑتے چلے جاؤ، مگر یہ جتنے عذاب

خدا کی طرف سے آئے ان میں سے کسی نے بھی مسلمانوں کی آنکھیں نہ کھولیں اور انھوں نے مستقل طور پر یہ قاعدہ طے ہی کر لیا کہ واقعی ہر اضطرار کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اسلامی زندگی کے حدود سکیڑتے رہیں اور تسلط کفر کی حدوں کو پھیلنے دیں۔

تفہیمات دوم ۱۰۹، ۱۱۰

وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

ان لوگوں کو جو اللہ کی بندگی کے ساتھ دوسروں کی بندگیاں ملاتے ہیں اور اللہ کے دین میں دوسرے دینوں کی آمیزش کرتے ہیں۔ جو اس بات پر راضی نہیں ہیں کہ پورا کا پورا نظامِ زندگی صرف ایک خدا کی اطاعت اور ہدایت پر قائم ہو۔ جنھیں اس بات پر اصرار ہے کہ جس جس معبود کی چاہیں گے بندگی کریں گے اور جن جن فلسفوں اور نظریات پر چاہیں گے اپنے عقائد و اخلاق اور تہذیب و تمدّن کی بنیاد رکھیں گے۔ ایسے سب لوگوں کے علی الرغم یہ فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ کا رسول ان کے ساتھ مصالحت کرنے کے لیے نہیں بھیجا گیا ہے بلکہ اس لیے بھیجا گیا ہے کہ جو ہدایت اور دینِ حق وہ اللہ کی طرف سے لایا ہے اُسے پورے دین یعنی نظامِ زندگی کے ہر شعبے پر غالب کر دے۔ یہ کام اُسے بہر حال کر کے رہنا ہے۔ کافر و مشرک مان لیں تو، اور نہ مانیں تو اور مزاحمت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں تو، رسول کا یہ مشن ہر حالت میں پورا ہو کر رہے گا۔

تفہیم القرآن ۵ ۴۷۷ - مزید دیکھیے سورۂ توبہ آیت ۳۳

وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

لینن (خدا کے حضور میں)

اس دور کی جتنی ترقی بھی ہے وہ ساری کی ساری دراصل علومِ طبیعی (Physical Science) کی بدولت ہے۔ ان علوم کی تحقیقات نے انسان کو غیر معمولی قوتیں دی ہیں۔ ان

کی بدولت انسان نے عجیب وعزیب ایجادات کی ہیں اور ان کے استعمال سے انسانی تمدن ومعاشرت اور تہذیب کو غیر معمولی مادی ترقی حاصل ہوئی لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ جہاں تک علوم طبیعی کا تعلق ہے، خدا نے انسان کو خود اس کی تحقیق کے ذرائع عطا کر دیے ہیں اور اس کے اندر وہ قابلیتیں اور صلاحیتیں پیدا کر دی ہیں جن کے ذریعہ وہ اپنے گردوپیش کی موجودات کا مطالعہ کر سکتا ہے اور اپنی مادّی ترقی کے لیے انھیں زیادہ سے زیادہ سے بہتر طریقے سے استعمال کرنے کی کوشش کر سکتا ہے اس کے لیے کسی خدائی ہدایت کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا نے خود انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے اس مادّی دنیا پر اس کو اقتدار عطا کر دیا ہے اس اقتدار کو استعمال کرنے کے ذرائع ووسائل اس کے لیے فراہم کر دیے ہیں اور خود انسان کے اندر وہ صلاحیتیں اور قابلیتیں پیدا کر دی ہیں جن سے کام لے کر وہ موجودات زمین سے اپنی خدمت لے سکتا ہے مگر جہاں تک تہذیب وتمدّن کا تعلّق ہے جہاں تک اخلاق کا تعلّق ہے اور جہاں تک انسان کی انفرادی واجتماعی زندگی کے نظام کا تعلّق ہے اس کے بارے میں انسان کو یہ غلط فہمی لاحق ہو جانا صحیح نہیں کہ یہاں بھی وہ اپنی ہی تحقیقات سے زندگی کے صحیح اصول معلوم کر سکتا ہے۔ یہ غلط فہمی درحقیقت ان تمام خرابیوں کا بنیادی سبب ہے جو انسانی تہذیب میں راہ پا گئی ہیں۔ یہاں فی الواقع انسان خدائی ہدایت Divine Guidance کا محتاج ہے۔ خدا کی ہدایت سے آزاد ہو کر انسان اگر اپنے اصول خود وضع کرنے لگے اور اپنے نزدیک یہ سمجھے کہ اس پہلو میں بھی اُسے خدا کی طرف سے آئی ہوئی کسی ہدایت کی ضرورت نہیں ہے تو وہ ٹھوکریں کھاتا چلا جاتا ہے اور محض اپنی عقل وفکر اور تجربات ومشاہدات کے بل بوتے پر کوئی صحت مند نظام زندگی تعمیر نہیں کر سکتا۔ یہ غلطی پہلے بھی انسان کو گمراہ کرتی رہی ہے اور آج بھی کر رہی ہے اور اس کا نتیجہ بجز تباہی کے اور کچھ نہیں ہے۔

ماہنامہ زندگی رامپور اپریل ۱۹۶۹ء ۲۸،۲۷

وحدت کی حفاظت نہیں بے قوّت بازو
آتی نہیں کچھ کام یہاں عقل خدا داد

(ہندی مسلمان)

۹۹ اور دعا کرو کہ پروردگار، مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچّائی کے ساتھ لے جا

اور جہاں سے بھی نکال سچّائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔[۱۰۰]

[۱۰۰] یعنی یا تو مجھے خود اقتدار عطا کر یا کسی حکومت کو میرا مددگار بنا دے تاکہ اس کی طاقت سے میں دنیا کے اس بگاڑ کو درست کر سکوں، فواحش اور معاصی کے اس سیلاب کو روک سکوں، اور تیرے قانون عدل کو جاری کر سکوں۔ یہی تفسیر ہے اس آیت کی جو حسن بصری اور قتادہ نے کی ہے اور اسی کو ابن جریر اور ابن کثیر جیسے جلیل القدر مفسرین نے اختیار کیا ہے اور اسی کی تائید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث کرتی ہے ۔۔۔ اللہ تعالیٰ حکومت کی طاقت سے ان چیزوں کا سدِّ باب کر دیتا ہے جن کا سدِّ باب قرآن سے نہیں کرتا"۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام دنیا میں جو اصلاح چاہتا ہے۔ وہ صرف وعظ وتذکیر سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کو عمل میں لانے کے لیے، سیاسی طاقت درکار ہے۔ پھر جب کہ یہ دعا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو خود سکھائی ہے تو اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اقامت دین اور نفاذ شریعت اور اجرائے حدود اللہ کے لیے حکومت چاہنا اور اس کے حصول کی کوشش کرنا نہ صرف جائز، بلکہ مطلوب ومندوب ہے اور وہ لوگ غلطی پر ہیں جو اُسے دُنیا پرستی یا دُنیا طلبی سے تعبیر کرتے ہیں۔ دنیا پرستی اگر ہے تو یہ کہ کوئی شخص اپنے لیے حکومت کا طالب ہو۔ رہا خدا کے دین کے لیے حکومت کا طالب ہونا تو یہ دنیا پرستی نہیں بلکہ خدا پرستی کا عین تقاضا ہے۔

تفہیم القرآن ۲ ۶۳۸

ہند میں حکمتِ دیں کوئی کہاں سے سیکھے
نہ کہیں لذّتِ کردار نہ افکارِ عمیق
حلقۂ شوق میں وہ جرأت اندیشہ کہاں
آہ! محکومی وتقلید و زوال تحقیق

(اجتہاد)

یہاں حالات کا بگاڑ وہی ہے جو ٹرکی اور دوسرے ممالک میں تھا اور ہے۔ صدیوں سے ہماری مذہبی رہنمائی جس گروہ کے ہاتھوں میں ہے اس نے اسلام کو ایک جامد وغیر متحرک

چیز بنا دیا ہے۔ غالباً چھٹی، ساتویں ہجری کے بعد سے اس گروہ کے ہاں جنتری بدلنی
موقوف ہوگئی ہے۔ وہ اپنے فلسفے اور کلام کے مباحث میں تو یہی پڑھتے پڑھاتے
ہیں کہ عالم متغیر ہے اور ہر متغیر حادث ہوتا ہے لیکن حقیقت میں عالم کے تغیر اور زمانہ کی
نیرنگی اور قوت کے سیلان و تجدد سے انھوں نے آنکھیں بند کرلی ہیں۔ دنیا بدل کر کہیں
سے کہیں پہنچ گئی۔ دنیا کے حالات، رجحانات، نظریات بدل کر کچھ سے کچھ ہوگئے۔ تمدن
کے معاملات اور مسائل نے کتنے پلٹے کھائے مگر ہمارے پیشوا اپنے آپ کو ابھی تک اسی
ماحول میں سمجھ رہے ہیں جو پانچ چھ سو برس پہلے پایا جاتا تھا۔ انھوں نے زمانہ کے ساتھ کوئی
ترقی نہ کی۔ نئے تغیرات سے بے اثر رہے۔ زندگی کے نئے مسائل سے کوئی غرض نہ رکھی
اور کوشش یہی کرتے رہے کہ اپنی قوم کو بھی زمانے کے ساتھ چلنے سے روک دیں بلکہ
مستقبل سے ماضی کی طرف کھینچ کرلے چلیں۔ یہ کوشش تھوڑی مدت تک کامیاب
ہوسکتی تھی اور ہوئی۔ مگر دائماً ایسی کوششوں کا کامیاب ہونا مشکل ہے جو قوم
دنیا کے ساتھ میل جول اور معاملات رکھتی ہو وہ کب تک دنیا کے افکار اور زندگی کے
نئے مسائل سے غیر متاثر رہ سکتی ہے؟ اگر اس کے رہنما اس کے آگے آگے چل کر نئی عقلی،
علمی اور عملی راہوں میں اس کی رہبری نہ کریں گے تو یہ بالکل فطری بات ہے کہ وہ ان کی قیادت
کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکنے پر آمادہ ہوجائے گی۔

اس خرابی کی جڑ دراصل ایک اور چیز ہے۔ ہمارے مذہبی رہنما فروع میں اس
درجہ منہمک ہوئے کہ اصول ہاتھ سے چھوٹ گئے پھر فروع نے اصول کی جگہ لے لی اور
ان سے ہزار در ہزار فروع اور نکل آئے جو اصل قرار پا گئے۔ حالانکہ اسلام میں ان کی
قطعاً کوئی اہمیت نہ تھی ملت اسلامی کی عمارت دراصل اس ترتیب پر قائم ہوئی تھی
کہ پہلے قرآن، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پھر اہل علم و بصیرت کا اجتہاد۔
لیکن بدقسمتی سے اس ترتیب کو بالکل الٹ دیا گیا اور نئی ترتیب یوں قرار پائی کہ پہلے
ایک خاص زمانہ کے اہل بصیرت کا اجتہاد، پھر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
اور سب سے آخر میں قرآن۔ یہی نئی ترتیب اس جمود کی ذمہ دار ہے جس نے اسلام کو
ایک ساکن و غیر متحرک شے بنا دیا ہے۔

ائمۂ فقہ، متکلمین، مفسرین، محدثین رحمہم اللہ اجمعین کے علم و فضل اور ان

کی جلالتِ شان سے کون انکار کرسکتا ہے؟ مگر وہ انسان تھے۔ اکتساب علم کے وہی
ذرائع رکھتے تھے جو عام انسانوں کو حاصل ہیں۔ ان کے پاس وحی نہیں آتی تھی بلکہ وہ اپنی
عقل و بصیرت کے ساتھ کلام اللہ و سنت رسول اللہ میں غور و فکر کرتے تھے اور جو
اصول ان کے نزدیک متحقق ہوجاتے تھے انہی سے وہ قوانین اور عقائد کے فروع مستنبط
کرلیا کرتے تھے۔ ان کی یہ اجتہادات ہمارے لیے مددگار اور رہنما بن سکتے ہیں مگر
بجائے خود منبع نہیں بن سکتے۔ انسان خواہ سراسر اپنی رائے سے اجتہاد کرے یا کسی الہامی کتاب
سے اکتساب کرکے اجتہاد کرے۔ دونوں صورتوں میں اس کا اجتہاد دنیا کے لیے دائمی
قانون اور اٹل قاعدہ نہیں بن سکتا کیوں کہ انسانی تعقل اور علم ہمیشہ زمانہ کے قیود سے
مقید ہوتا ہے۔

تمام زمانی و مکانی قیود سے آزاد اگر کوئی ہے تو وہ صرف خداوند عالم ہے جس کے
پاس حقیقی علم ہے اور جس کے علم میں زمانہ کے تغیرات سے ذرہ برابر کوئی تغیر واقع نہیں
ہوتا۔ اس علم کا فیضان قرآن کی آیات اور اس کے لانے والے کے سینے میں ہوا تھا۔
وہی درحقیقت ایسا ماخذ اور سرچشمہ بن گیا ہے جس سے ہمیشہ اور ہر زمانے کے
لوگ اپنے مخصوص حالات اور اپنی ضروریات کے لحاظ سے علوم، افکار اور قوانین اخذ
کرتے ہیں۔ جب تک علمائے اسلام اس ماخذ و منبع سے اکتساب علم کرتے رہے اور
صحیح غور و فکر سے کام لے کر اپنے اجتہاد سے علمی و عملی مسائل حل کرتے رہے، اس
وقت تک اسلام زمانہ کے ساتھ حرکت کرتا رہا مگر جب قرآن میں غور و فکر کرنا چھوڑ دیا
گیا۔ جب احادیث کی تحقیق اور چھان بین بند ہوگئی۔ جب آنکھیں بند کرکے پچھلے
مفسرین اور محدثین کی تقلید کی جانے لگی۔ جب پچھلے فقہا اور متکلمین کے اجتہادات
کو اٹل اور دائمی قانون بنا لیا گیا۔ جب کتاب و سنت سے براہ راست اکتساب علم
ترک کردیا گیا، اور جب کتاب و سنت کے اصول کو چھوڑ کر بزرگوں کے نکالے
ہوئے فروع ہی اصل بنا لیے گئے تو اسلام کی ترقی دفعتاً رک گئی۔ اس کا قدم آگے
بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کے حامل اور وارث علم و عمل کے نئے میدانوں
میں دنیا کی رہنمائی کرنے کے بجائے پرانے مسائل اور علوم کی شرح و تفسیر میں منہمک
ہوگئے، جزئیات و فروع میں جھگڑنے لگے، نئے نئے مذاہب نکالنے اور دور از کار

مباحث میں فرقہ بندی کرنے لگے اور اس دریادلی کے ساتھ مسلمانوں میں کفر وفسق تقسیم کیا گیا کہ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا کی جگہ یَخۡرُجُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا کا تماشا دنیا نے دیکھا اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ وَرُحَمَآءُ بَیۡنَھُمۡ کی جگہ رُحَمَآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ اَشِدَّآءُ بَیۡنَھُمۡ کے مناظر ہر طرف نمایاں ہوئے اور تَحۡسَبُھُمۡ جَمِیۡعًا وَّقُلُوۡبُھُمۡ شَتّٰی کی جو کیفیت منافقین وکفار کے حق میں بیان ہوئی، وہ مسلمانوں کا حال بن گئی۔

تنقیحات ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

(مومن)

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان کی پختگی اصول کی مضبوطی سیرت کی طاقت اور ایمانی فراست کی وجہ سے کفار کے مقابلہ میں پتھر کی چٹان کا حکم رکھتے ہیں۔ وہ موم کی ناک نہیں ہیں کہ انھیں کافر جدھر چاہیں موڑ دیں۔ وہ نرم چارہ نہیں ہیں کہ کافر انھیں آسانی کے ساتھ چبا جائیں انھیں کسی خوف سے دبایا نہیں جاسکتا۔ انھیں کسی ترغیب سے خریدا نہیں جاسکتا۔ کافروں میں یہ طاقت نہیں کہ انھیں اس مقصد عظیم سے ہٹا دیں جس کے لیے وہ سر دھڑ کی بازی لگا کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے کے لیے اُٹھے ہیں۔۔ ان کی سختی جو کچھ بھی ہے وہ دشمنان دین کے لیے ہے۔ اہل ایمان کے لیے نہیں ہے اہل ایمان کے مقابلہ میں وہ نرم ہیں، رحیم وشفیق ہیں، ہمدرد وغمگسار ہیں۔ اصول ومقصد کے اتحاد نے ان کے اندر ایک دوسرے کے لیے محبت اور ہم رنگی وسازگاری پیدا کر دی ہے۔

تفہیم القرآن ۵ ۶۳

ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا
تفضیل علی ہم نے سنی اس کی زبانی

(زہد اور رندی)

معترض حضرات نے مجھ پر اس شبہ کا بھی اظہار فرمایا ہے کہ میں حضرت علیؓ

کی بیجا وکالت کر رہا ہوں۔ مگر میں صحابہ کرام اور خصوصاً خلفائے راشدین کے معاملہ میں اپنا یہ مستقل مسلک پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ ان کا کوئی قول یا فعل اگر بظاہر غلط محسوس ہوتا ہو تو ان کے اپنے کسی بیان، یا اس وقت کے ماحول یا ان کے مجموعی طرز عمل میں اس کا صحیح حل تلاش کرنے کی پوری کوشش کی جائے اور اس کے حق میں ہر وہ معقول تاویل کی جائے جو بے جا اور بھونڈی وکالت کی حد تک نہ پہنچتی ہو۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں رسائل مسائل حصہ اوّل کے مضمون "حضرت علی کی امیدواری خلافت" اور موجودہ زیر بحث مضمون میں جو رویّہ میں نے اختیار کیا ہے وہ دراصل اسی قاعدے پر مبنی ہے، کوئی بے جا وکالت نہیں ہے جس کا مجھے طعنہ دیا جا رہا ہے۔ میں جب دیکھتا ہوں کہ تمام معتبر روایات کی رو سے شیخین اور حضرت عثمانؓ کے پورے دور خلافت میں جس خلوص اور کامل جذبۂ رفاقت کے ساتھ انھوں نے ان تینوں حضرات کے ساتھ تعاون کیا اور جیسے محبت کے تعلقات ان کے درمیان رہے، اور حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کی وفات کے بعد جس طرح دل کھول کر وہ ان کی تعریفیں کرتے رہے، تو مجھے وہ روایات کمزور محسوس ہوتی ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ ان میں سے ہر ایک کے خلیفہ بنائے جانے پر ناراض تھے، اور وہ روایات زیادہ قوی معلوم ہوتی ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ انھوں نے ہر ایک کی خلافت آغاز ہی میں دل سے قبول فرمائی تھی۔ جب دونوں طرح کی روایات موجود ہیں اور سند کے ساتھ بیان ہوئی ہیں تو آخر ہم ان روایات کو کیوں نہ ترجیح دیں جو ان کے تعاون کے مجموعی طرز عمل سے مناسبت رکھتی ہیں اور خواہ مخواہ وہی روایات کیوں قبول کریں جو اس کی ضد نظر آتی ہیں۔ اسی طرح حضرت عثمانؓ کی شہادت سے لے کر خود ان کی اپنی شہادت تک ایک ایک مرحلے پر ان کا جو رویّہ رہا ہے اس کے ہر جز کا ایک صحیح محل میں نے تلاش کیا اور ان کے اپنے بیانات میں یا اس وقت کے حالات وواقعات میں وہ مجھے مل گیا، مگر صرف ایک مالک الاشتر اور محمد بن ابی بکر کو گورنری کا عہدہ دینے کا فعل ایسا تھا جس کو کسی تاویل سے بھی حق بجانب قرار دینے کی گنجائش مجھے نہ مل سکی۔ اسی بنا پر میں نے اس کی مدافعت سے اپنی معذوری ظاہر کر دی ہے۔

خلافت وملوکیت ۳۴۷، ۳۴۸

ہے وہاں بے حاصلی کشت اجل کے واسطے
سازگار آب و ہوا تخم عمل کے واسطے

(والدہ مرحومہ کی یاد میں)

اوّل تو موجودہ نظامِ کائنات جن قوانین پر چل رہا ہے ان کے اندر اتنی گنجائش ہی نہیں ہے کہ انسانی افعال کے اخلاقی نتائج پوری طرح مرتب ہو سکیں، دوسری یہاں چند سال کی زندگی میں انسان جو عمل کرتا ہے، اس کے ردِّ عمل کا سلسلہ اتنا وسیع ہوتا ہے اور اتنی مدّت تک جاری رہتا ہے کہ صرف اسی کے پورے نتائج وصول کرنے کے لیے ہزاروں بلکہ لاکھوں برس کی زندگی درکار ہے اور موجودہ قوانین قدرت کے ماتحت انسان کو اتنی زندگی ملنی ناممکن ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسانی ہستی کے خاکی، عضوی اور حیوانی عناصر کے لیے تو موجودہ طبعی دنیا Physical World اور اس کے طبعی قوانین کافی ہیں، مگر اس کے اخلاقی عنصر کے لیے یہ دنیا بالکل ناکافی ہے۔ اس کے لیے ایک دوسرا نظامِ عالم درکار ہے جس میں حکمران قانون (Governing Law) اخلاق کا قانون ہو اور طبعی قوانین اس کے ماتحت محض مددگار کی حیثیت سے کام کریں، جس میں زندگی محدود نہ ہو بلکہ غیر محدود ہو، جس میں وہ تمام اخلاقی نتائج جو یہاں مرتب ہونے سے رہ گئے ہیں، یا الٹے مرتب ہوئے ہیں، اپنی صحیح صورت میں پوری طرح مرتب ہو سکیں، جہاں سونے چاندی کے بجائے نیکی اور صداقت میں وزن اور قیمت ہو۔ جہاں آگ صرف اس چیز کو جلائے جو اخلاقاً جلنے کے مستحق ہو، جہاں عیش اس کو ملے جو نیک ہو اور مصیبت اس کے حصے میں آئے جو بد ہو۔ عقل چاہتی ہے، فطرت مطالبہ کرتی ہے کہ ایک ایسا نظامِ عالم ضرور ہونا چاہیے۔

جہاں تک عقلی استدلال کا تعلق ہے وہ ہم کو صرف "ہونا چاہیے" کی حد تک لے جا کر چھوڑ دیتا ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ آیا واقعی کوئی ایسا عالم ہے بھی، تو ہماری عقل اور ہمارا علم، دونوں اس کا حکم لگانے سے عاجز ہیں۔ یہاں قرآن ہماری مدد کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہاری عقل اور تمہاری فطرت جس چیز کا مطالبہ کرتی ہے فی الواقع وہ ہونے والی ہے موجودہ نظامِ عالم جو طبعی قوانین پر بنا ہے، ایک وقت میں توڑ ڈالا جائے گا اس کے بعد ایک دوسرا نظام بنے گا، جس میں زمین و آسمان اور ساری چیزیں ایک دوسرے ڈھنگ پر ہوں گی۔۔۔

اسلامی تہذیب اصول و مبادی ۳۶۰ تا ۳۶۲

ہوتا ہے کوہ و دشت میں پیدا کبھی کبھی
وہ مرد جس کا فقر خزف کو کرے نگیں

وہ الگ تھلگ رہنے والا سکون پسند انسان جس کے اندر کسی نے چالیس برس تک سیاسی دلچسپی کی بو بھی نہ پائی تھی، یکایک اتنا زبردست ریفارمر اور مدبّر بن کر ظاہر ہوا کہ ۲۳ سال کے اندر اس نے ۱۲ لاکھ مربع میل میں پھیلے ہوئے ریگستان کے منتشر، جنگجو، جاہل، سرکش، غیر متمدّن اور ہمیشہ آپس میں لڑنے والے قبائل کو، ریل اور تار اور ریڈیو اور پریس کی مدد کے بغیر ایک مذہب، ایک تہذیب، ایک قانون اور ایک نظامِ حکومت کا تابع بنا دیا۔ اس نے ان کے خیالات بدل دیے، ان کے اخلاق بدل دیے۔ ان کی ناشائستگی کو اعلا درجہ کی شائستگی میں، ان کی وحشت کو بہترین مدنیت میں، ان کی بدکرداری اور بداخلاقی کو صلاح و تقویٰ اور مکارمِ اخلاق میں، ان کی سرکشی اور انارکی کو انتہا درجہ کی پابندی قانون اور اطاعت امر میں تبدیل کر دیا اس بانجھ قوم کو جس کی گود میں صدیوں سے کوئی ایک بھی قابلِ ذکر انسان پیدا نہ ہوا تھا۔ اس نے ایسا مردم خیز بنا دیا کہ اس میں ہزار دو ہزار اعاظمِ رجال اٹھ کھڑے ہوئے اور دنیا کو دین اور اخلاق اور تہذیب کا درس دینے کے لیے چار دانگ عالم میں پھیل گئے۔

اور یہ کام اس نے ظلم اور جبر اور دغا اور فریب سے انجام نہیں دیا بلکہ دل موہ لینے والا اخلاق اور روحوں کو مسخر کر لینے والی شرافت اور دماغوں پر قبضہ کر لینے والی تعلیم سے انجام دیا۔ اس نے اپنے اخلاق سے دشمنوں کو دوست بنایا۔ رحم و شفقت سے دلوں کو موم کیا۔ عدل و انصاف سے حکومت کی۔ حق و صداقت سے کبھی یک سرِ مو انحراف نہ کیا۔ جنگ میں بھی کسی سے بدعہدی اور دغا نہ کی۔ اپنے بدترین دشمنوں پر بھی ظلم نہ کیا جو اس کے خون کے پیاسے تھے۔ جنھوں نے اس کو پتھر مارے تھے، اس کو وطن سے نکالا تھا، اس کے خلاف تمام عرب کو کھڑا کر دیا تھا، حتیٰ کہ جنھوں نے جوش عداوت میں اس کے چچا کا کلیجہ تک نکال کر چبا ڈالا تھا، ان کو بھی اس نے فتح پا کر بخش دیا۔ اپنی ذات کے لیے کبھی اس نے کسی سے بدلہ نہ لیا۔

تفہیمات اول ۲۰۳، ۲۰۴

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

(تعلیم اور اس کے نتائج)

ہماری قوم کے نوجوان انگریزی تعلیم اور فرنگی تہذیب سے استفادہ کرنے کے لیے مدرسوں اور کالجوں میں بھیجے گئے۔ اسلامی تعلیم سے کورے، اسلامی تہذیب میں خام، انگریزی حکومت سے مرعوب، فرنگی تہذیب کی شان و شوکت پر فریفتہ پہلے ہی سے تھے۔ اب جو انھوں نے انگریزی مدرسے کی فضا میں قدم رکھا تو اس کا پہلا اثر یہ ہوا کہ ان کی ذہنیت کا سانچہ بدلا اور ان کی طبیعت کا رخ مذہب سے پھر گیا کیونکہ اس کی آب و ہوا کی اوّلین تاثیر یہ تھی کہ یورپ کے کسی مصنّف یا محقّق کے نام سے جو چیز پیش کی جائے اس پر وہ بے تامّل آمنّا و صدّقنا کہیں اور قرآن و حدیث یا ائمۂ دین کی طرف سے کوئی بات پیش ہو تو اس پر دلیل کا مطالبہ کریں۔ اس منقلب ذہنیت کے ساتھ انھوں نے جن مغربی علوم کی تعلیم حاصل کی ان کے اصول و فروع اکثر و بیشتر اسلام کے اصول اور جزئیات احکام کے خلاف تھے۔ اسلام میں مذہب کا تصور یہ ہے کہ وہ زندگی کا قانون ہے اور مغرب میں مذہب کا تصور یہ ہے کہ وہ محض شخصی اعتقاد ہے جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام میں پہلی چیز ایمان باللہ ہے اور وہاں سرے سے اللہ کا وجود ہی مسلّم نہیں۔ اسلام کا پورا نظام تہذیب وحی و رسالت کے اعتقاد پر قائم ہے اور وہاں وحی کی حقیقت ہی میں شک اور رسالت کے منجانب اللہ ہونے میں شبہ ہے۔ اسلام میں آخرت کا اعتقاد پورے نظام اخلاق کا سنگ بنیاد ہے اور وہاں یہ بنیاد خود بے بنیاد نظر آتی ہے۔ اسلام میں جو عبادات اور اعمال فرض ہیں وہاں وہ محض عہد جاہلیت کے رسوم ہیں جن کا اب کوئی فائدہ نہیں۔ اسی طرح اسلام کے اصول تمدّن و تہذیب بھی مغربی تہذیب و تمدّن کے اصول سے یکسر مختلف ہیں۔ قانون میں اسلام کا اصل الاصول یہ ہے کہ خود خدا واضعِ قانون ہے، رسول خدا شارحِ قانون اور انسان صرف متبع قانون۔ مگر وہاں خدا کو وضع قانون کا سرے سے کوئی حق ہی نہیں، لیجسلیچر واضعِ قانون ہے اور قوم لیجسلیچر کو منتخب کرنے والی ہے۔ سیاسیات میں اسلام کا مطمح نظر حکومت الٰہی ہے اور مغرب کا مطمح نظر حکومت قومی۔ اسلام کا رُخ

بین الاقوامیت (Internationalism) کی طرف ہے اور مغرب کا کعبۂ مقصود قومیت (Nationalism) معاشیات میں اسلام اکل حلال، اور زکوٰۃ و صدقہ اور تحریم سود پر زور دیتا ہے اور مغرب کا سارا نظام معاشی ہی سود اور منافع پر چل رہا ہے اخلاقیات میں اسلام کے پیش نظر آخرت کی کامیابی ہے اور مغرب کے پیش نظر دنیا کا فائدہ، اجتماعی مسائل میں بھی اسلام کا راستہ قریب قریب ہر معاملہ میں مغرب کے راستہ سے مختلف ہے۔ ستر و حجاب، حدود زن و مرد، تعدد ازدواج، قوانین نکاح و طلاق، ضبط ولادت، حقوق ذوی الارحام، حقوق زوجین اور ایسے ہی دوسرے بہت سے معاملات ہیں جن میں ان دونوں کا اختلاف اتنا نمایاں ہے کہ بیان کی حاجت نہیں، اور اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کے اصول مختلف ہیں۔ ہمارے نوجوانوں نے مرعوب بلکہ غلامانہ ذہنیت اور پھر غیر مکمل اسلامی تعلیم و تربیت کے ساتھ جب ان مغربی علوم کی تحصیل کی اور مغربی تہذیب کے زیر اثر تربیت پائی تو نتیجہ جو کچھ ہونا چاہیے تھا وہی ہوا ان میں تنقید کی صلاحیت پیدا نہ ہو سکی۔ انھوں نے مغرب سے جو کچھ سیکھا اس کو صحت اور درستی کا معیار سمجھ لیا پھر ناقص علم کے ساتھ اسلام کے اصول و قوانین کو اس معیار پر جانچ کر دیکھا اور جس مسئلہ میں دونوں کے درمیان اختلاف پایا اس میں کبھی مغرب کی غلطی محسوس نہ کی بلکہ اسلام ہی کو برسرِ غلط سمجھا اور اس کے اصول و قوانین میں ترمیم و تنسیخ کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

جدید تعلیم نے معاشی اور سیاسی حیثیت سے ہندوستان کے مسلمانوں کو خواہ کتنا ہی فائدہ پہنچایا ہو مگر ان کے مذہب اور ان کی تہذیب کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی کسی فائدے سے نہیں ہو سکتی۔

تنقیحات ۲۹، ۳۰، ۳۱

دریا میں موتی! اے موج بے باک
ساحل کی سوغات! خار و خس و خاک

(طلوع اسلام)

جن غیر معمولی اخلاقی قوتوں کی اس کام کے لیے ضرورت ہے اور جیسی مؤثر شخصیت

یا شخصیتیں اس کام میں جان ڈالنے کے لیے ضروری ہیں وہ بہر حال حجروں میں پیدا نہیں ہو سکتیں بلکہ اس راہ کی عملی جدّوجہد کے نتیجہ ہی میں پیدا ہوا کرتی ہیں۔ ابھی اس سعی کی ابتدا ہے اور آزمائش کے لمحات بہت کم آئے ہیں۔ اس وجہ سے اس سعی کے مردم ساز اثرات آپ کے سامنے پوری طرح نمایاں نہیں ہو سکے ہیں۔ لیکن آگے چل کر جیسے جیسے امتحان کے مواقع سامنے آتے جائیں گے آپ دیکھیں گے کہ جو لوگ اللہ سے گہرا تعلق رکھنے والے نہیں ہیں وہ کسی نہ کسی امتحان کی گھڑی پر اپنی کمزوری کے خود شکار ہو جائیں گے اور راستے سے ہٹ جائیں گے اور جن لوگوں کو فی الواقع اللہ سے تعلق ہوگا وہ نہ صرف یہ کہ ایک امتحان کے موقع پر کامیاب ہوں گے بلکہ ہر امتحان ان کی سیرت میں ایک نئی طاقت پیدا کر دے گا۔ ان کے اندر کی بہت سی کھوٹ نکال دے گا اور بالآخر وہ زرِ خالص بن جائیں گے۔ پھر رفتہ رفتہ انہی لوگوں میں پارس کی سی خصوصیات پیدا ہو جائیں گی کہ جو ان سے چھو گیا وہ سونا بن گیا۔

بہر حال میں اس معاملہ میں مطمئن ہو چکا ہوں کہ اس کام کو شروع کرنے سے پہلے مکمّل شخصیت یا شخصیتوں کے موجود ہونے کی شرط لگانا غلط ہے۔ یہ شرط کبھی متحقق نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے برعکس صحیح یہ ہے کہ ایک مرتبہ خلوص نیت کے ساتھ یہ کام شروع کر دیا جائے تو رفتہ رفتہ یہی کام خود مکمل شخصیتیں بناتا چلا جاتا ہے اور جتنا جتنا یہ اپنی تکمیل کے مراحل کی طرف بڑھتا ہے اتنی ہی بلند تر شخصیتیں اس کے کارکنوں میں سے ابھرتی چلی آتی ہیں۔ سمندر کی موجوں سے لڑنے کے لیے آپ ایسے آدمی کبھی نہیں لا سکتے جو سمندر کے اندر اترنے سے پہلے اس کی موجوں سے لڑنے کی قوت فراہم کر چکے ہوں۔ یہ قوت تو بہر حال سمندر میں کودنے اور موجوں سے لڑنے ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ جو کمزور ہیں وہ اسی سمندر میں ڈوب مرتے ہیں اور جن کے دست و بازو میں اللہ نے قوّت پیدا کی ہے وہ تھپیڑے کھا کھا کر اور موجوں سے لڑ لڑ کر بالآخر پیراکوں کے پیراک بن جاتے ہیں۔

رسائل مسائل اوّل ۳۷۴، ۳۷۵

ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغ بے نیام
(ابلیس کی مجلس شوریٰ)

اگر آپ مجھ سے دریافت کریں کہ آج اسلام اور مسلم جماعت اور جہاد کا وہ تصور جو تم پیش کر رہے ہو کہاں غائب ہو گیا اور کیوں دنیا بھر کے مسلمانوں میں کہیں بھی اس کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا تو عرض کروں گا کہ یہ سوال مجھ سے نہ کیجیے، بلکہ ان لوگوں سے کیجیے جنھوں نے مسلمانوں کی توجہ ان کے اصلی مشن سے ہٹا کر تعویذ گنڈوں اور عملیات اور مراقبوں اور ریاضتوں کی طرف پھیر دی۔ جنھوں نے نجات اور فلاح اور حصول مقاصد کے لیے شارٹ کٹ تجویز کیے" تاکہ مجاہدے اور جان فشانی کے بغیر سب کچھ تسبیح پھرانے یا کسی صاحب قبر کی عنایات حاصل کر لینے ہی سے میسّر آ جائے۔ جنھوں نے اسلام کے کلّیات اور اصول اور مقاصد سب کو لپیٹ کر تاریک گوشوں میں پھینک دیا اور مسلمانوں کے ذہن کو آمین بالجہر اور رفع یدین اور ایصال ثواب و زیارت قبور اور اسی قسم کے بے شمار جزئیات میں ایسا پھنسایا کہ وہ اپنے آپ اور اپنے مقصد تخلیق کو اور اسلام کی حقیقت کو قطعی بھول گئے۔ اگر اس سے بھی آپ کو تشفّی نہ ہو تو پھر یہ سوال ان امرا اور صاحب اقتدار کے سامنے پیش کیجیے جو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر قرآن کے قانون اور محمدؐ کی ہدایت کا اس سے زیادہ کوئی حق اپنے اوپر تسلیم نہیں کرتے کہ کبھی ختم قرآن کرا دیں اور کبھی عید میلاد کے جلسے کرا دیں اور کبھی اللہ میاں کو نعوذ باللہ ان کی شاعری کی داد دید یا کریں۔ رہا اس قانون اور ہدایت کو عملاً نافذ کرنا تو یہ حضرات اپنے آپ کو اس سے بریّ الذمّہ سمجھتے ہیں کیونکہ درحقیقت ان کا نفس ان پابندیوں کو قبول کرنے اور ان ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھالنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہے جو اسلام ان پر عاید کرتا ہے۔ یہ بڑی سستی نجات کے طالب ہیں۔

تفہیمات ۱ ۷۷

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات
لینن (خدا کے حضور میں)

صنعتی انقلاب کی وجہ سے طریق پیداوار میں جو بنیادی تغیر واقع ہو گیا تھا وہ یہ تھا

کہ پہلے جو کام انسانی اور حیوانی طاقت سے کیے جاتے تھے اب ان کے لیے مشین کی طاقت استعمال کی جانے لگی۔ ایک مشین لگا دینے کے معنی یہ ہو گئے کہ دس آدمی وہ کام کرنے لگیں جو پہلے ہزار آدمی کرتے تھے۔ اس طریق پیداوار کی آئین فطرت میں یہ چیز شامل ہے کہ وہ چند انسانوں کو کام پر لگا کر ہزاروں انسانوں کو بیکار کر دیتا ہے۔ ایسے طریقے کے متعلق ملکیت اور آزادیٔ سعی کے مطلق حقوق کا دعویٰ اور حکومت کی عدم مداخلت کا مطالبہ اصولاً بالکل بے جا تھا۔ آخر یہ کس طرح جائز ہو سکتا تھا کہ ایک شخص یا گروہ محض اس وجہ سے کہ وہ ایسا کرنے کے ذرائع رکھتا ہے ایک خاص قسم کا مال تیار کرنے کے لیے اچانک ایک بڑا کارخانہ قائم کر دے اور اس کی کچھ پروا نہ کرے کہ اس کی اس حرکت سے پورے علاقے کے ان ہزارہا آدمیوں کے روزگار پر کیا اثر پڑتا ہے جو پہلے اپنے گھروں اور دکانوں میں یا دستی کاریگری کی چھوٹی چھوٹی فیکٹریوں میں بیٹھے وہی مال تیار کر رہے تھے؟

اس کا یہ مطلب نہیں کہ مشین کی طاقت کو صنعت میں استعمال نہ ہونا چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ اس طاقت کے استعمال کی اندھا دھند اجازت نہ ہونی چاہیے تھی اور حکومت کو اول روز ہی سے یہ فکر کرنی چاہیے تھی کہ ساتھ ساتھ ان لوگوں کے روزگار کا بندوبست بھی ہوتا جائے جن کو یہ صنعتی طاقت بیکار کر رہی تھی۔ چونکہ ایسا نہیں ہوا، اسی وجہ سے مشینی طریق پیداوار کے وجود میں آتے ہی انسانی سوسائٹی میں بے روزگاری کا ایک مستقل مسئلہ اتنے بڑے پیمانہ پر پیدا ہو گیا جس سے تاریخ پہلے کبھی آشنا نہ ہوئی تھی اور یہ بات ظاہر ہے کہ بے روزگاری کسی ایک مسئلے کا نام نہیں ہے بلکہ وہ انسان کی مادی، روحانی، اخلاقی اور تمدّنی زندگی کے بے شمار پیچیدہ مسائل کی مورث اعلیٰ ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک فرد یا چند افراد کو کیا حق ہے کہ اپنی ملکیت میں ایسے طریقے سے تصرف کریں جس سے اجتماعی زندگی میں اتنی زبردست پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں؟ اور اس تصرف کے بارے میں کوئی مرد عاقل یہ کیسے دعویٰ کر سکتا ہے کہ یہ افراد کی وہ روشن خیال خود غرضی ہے جو آپ سے آپ اجتماعی مفاد کی خدمت کرتی رہتی ہے؟ اور ایسے انفرادی تصرفات کے معاملہ میں یہ خیال کرنا کتنی بڑی حماقت ہے کہ ان کا کھلا لائسنس دے کر قومی حکومت کو خاموش بیٹھ جانا چاہیے اور ان اثرات کی طرف سے آنکھیں بند کر لینی چاہیے جو ایک قلیل التعداد گروہ کی کارروائیوں سے پوری قوم کی زندگی پر پڑ رہے ہوں؟

پھر اس طریق پیداوار نے جب ہزارہا بلکہ لکھوکھا آدمیوں کو بے روزگار کر دیا اور وہ مجبور ہو گئے کہ اپنے دیہات اور قصبات سے اور اپنے محلّوں اور گلیوں سے نکل نکل کر ان بڑے کارخانہ داروں اور تاجروں کے پاس مزدوری یا نوکری تلاش کرتے ہوئے آئیں تو لامحالہ اس کا نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا اور یہی ہوا کہ بھوکے مرتے ہوئے طالبین روزگار ان کم سے کم اجرتوں پر کام کرنے کے لیے مجبور ہو گئے جو سرمایہ داروں نے ان کے سامنے پیش کیں۔ کام ان سب کو نہ ملا، بلکہ قابل کار آدمیوں کا حصّہ مستقلاً بیکار رہا۔ پھر جنھیں کام ملا وہ بھی اس پوزیشن میں نہ تھے کہ سرمایہ دار سے سودا چکا کر بہتر شرائط منوا سکتے کیونکہ وہ تو خود طالب روزگار ہو کر آئے تھے۔ سرمایہ دار کی پیش کردہ شرائط قبول نہ کرتے تو شام کی روٹی تک کا بندوبست ان کے پاس نہ تھا اور اس پر بھی کچھ اکڑ دکھاتے تو دوسرے ہزاروں بھوکے جھپٹ کر ان ہی شرائط پر یہ روزگار اچک لینے کے لیے تیار تھے۔ اس طرح بورژوا حضرات کا وہ سارا استدلال غلط ثابت ہو گیا جو وہ اس اصول کے حق میں پیش کرتے تھے کہ کھلے مقابلے میں اجیر اور مستاجر کے درمیان کسر و انکسار سے مناسب اور منصفانہ اجرتیں آپ ہی آپ طے ہوتی رہتی ہیں۔ اس لیے کہ یہاں حقیقت میں مقابلے کے ساتھ "کھلے ہونے" کی شرط مفقود تھی۔ یہاں یہ صورت تھی کہ ایک آدمی نے ہزاروں آدمیوں کا رزق چھین کر پہلے اپنے قابو میں کر لیا اور جب وہ بھوک سے تڑپ کر اس کے پاس آئے، تو وہ ان سب کو نہیں بلکہ ان کے صرف دسویں یا بیسویں حصّے کو کام دینے پر راضی ہوا۔ ایسے حالات میں ظاہر ہے کہ سودا چکانے کی ساری طاقت اسی ایک شخص کے پاس جمع ہو گئی اور ان ہزاروں طالبین روزگار میں سے کوئی بھی اپنی شرائط منوانے کے قابل نہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس صنعتی انقلاب کے دور میں جدید سرمایہ داری جیسے جیسے بڑھتی گئی، سوسائٹی میں بے روزگاری کے علاوہ افلاس اور خستہ حالی کی مصیبت بھی بڑھتی چلی گئی۔ بڑے بڑے صنعتی اور تجارتی مرکزوں میں جو لوگ محنت مزدوری اور نوکری کے لیے جمع ہوئے، انھیں بہت کم اجرتوں پر زیادہ وقت اور محنت کرنے پر راضی ہونا پڑا۔ وہ جانوروں کی طرح کام کرنے لگے۔ جانوروں سے بدتر حالت میں شہروں کے تنگ و تاریک مکانات میں رہنے لگے۔ ان کی صحتیں برباد ہونے لگیں۔ ان کی ذہنیتیں پست ہونے لگیں ان کے اخلاق بری طرح بگڑنے شروع ہو گئے۔ نفسی

نفسی کے عالم میں باپ بیٹے اور بھائی بھائی تک کے درمیان ہمدردی باقی نہ رہی۔ والدین کے لیے اولاد اور شوہروں کے لیے بیویاں وبال جان بن گئیں۔ غرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہ رہا جو اس غلط اور ایک رُخی قسم کی آزاد حیثیت کے برے اثرات سے بچا رہ گیا ہو۔

سود دوم ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸

ہے آبِ حیات اسی جہاں میں
شرط اس کے لیے ہے تشنہ کامی

(جاوید سے)

یہ وقت ہے کہ مغربی قوموں کے سامنے قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کو پیش کیا جاوے اور انھیں بتایا جائے کہ یہ ہے وہ مطلوب جس کی طلب میں تمھاری روحیں بے قرار ہیں، یہ ہے وہ امرت رس جس کے تم پیاسے ہو۔ یہ ہے وہ شجر طیب جس کی اصل بھی صالح ہے اور شاخیں بھی صالح، جس کے پھول خوشبودار بھی ہیں اور بے خار بھی، جس کے پھل میٹھے بھی ہیں اور جاں بخش بھی، جس کی ہوا لطیف بھی ہے اور روح پرور بھی۔ یہاں تم کو حکمت ملے گی۔ یہاں تم کو فکر و نظر کے لیے ایک صحیح نقطۂ آغاز ملے گا۔ یہاں تم کو وہ علم ملے گا جو انسانی سیرت کی بہترین تشکیل کرتا ہے۔ یہاں تم کو وہ روحانیت ملے گی جو راہبوں اور سنیاسیوں کے لیے نہیں بلکہ کارزار دنیا میں جدوجہد کرنے والوں کے لیے سکون قلب اور جمعیت خاطر کا سرچشمہ ہے۔ یہاں تم کو اخلاق اور قانون کے وہ بلند اور پائیدار قواعد ملیں گے جو انسانی فطرت کے علم حاوی پر مبنی ہیں اور خواہشات نفس کے اتباع میں بدل نہیں سکتے۔ یہاں تم کو تہذیب کے وہ صحیح اصول ملیں گے جو طبقات کے جعلی امتیازات اور اقوام کی مصنوعی تفریقوں کو مٹا کر خالص عقلی بنیادوں پر انسانی جمعیت کی تنظیم کرتے ہیں، اور عدل، مساوات، فیاضی اور حسن معاملت کی ایسی پُرامن اور مناسب فضا پیدا کر دیتے ہیں جس میں افراد اور طبقات اور فرقوں کے درمیان حقوق کی کشمکش اور مفاد و مصالح کے تضاد اور اغراض و مقاصد کے جنگ کے لیے کوئی موقع باقی نہیں رہتا بلکہ سب کے

سب باہمی تعاون کے ساتھ شخصی و اجتماعی فلاح کے لیے خوش دلی اور اطمینان کے ساتھ عمل کر سکتے ہیں۔ اگر تم ہلاکت سے بچنا چاہو تو قبل اس کے کہ تمھاری تہذیب ہولناک صدمہ سے پاش پاش ہو کر تاریخ کی برباد شدہ تہذیبوں میں ایک اور مٹی ہوئی تہذیب کا اضافہ کرے، تم کو چاہیے کہ اسلام کے خلاف ان تمام تعصبات کو، جو تمھیں قرون وسطیٰ کے مذہبی دیوانوں سے وراثت میں ملے ہیں اور جن کو تم نے اس تاریک دور کی تمام دوسری چیزوں سے قطع تعلق کرنے کے باوجود ابھی تک نہیں چھوڑا ہے، اپنے دلوں سے نکال ڈالو اور کھلے دل کے ساتھ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کو سنو، سمجھو اور قبول کرو۔

تنقیحات ۳۶، ۳۷

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

(سلطنت)

اسلامی جمہوریت ایک مکمل جمہوریت ہے، اتنی مکمل جتنی کوئی جمہوریت مکمل ہو سکتی ہے البتہ جو چیز اسلامی جمہوریت کو مغربی جمہوریت سے الگ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ مغرب کا نظریہ سیاسی "جمہوری حاکمیت" کا قائل ہے اور اسلام "جمہوری خلافت" کا۔ وہاں جمہور خود بادشاہ ہیں اور یہاں بادشاہی خدا کی ہے اور جمہور اس کے خلیفہ ہیں۔ وہاں اپنی شریعت جمہور آپ بناتے ہیں۔ یہاں ان کو اس شریعت کی پابندی کرنی ہوتی ہے جو خدا نے اپنے رسول کے ذریعہ سے دی ہے۔ وہاں حکومت کا کام جمہور کا منشا پورا کرنا ہوتا ہے۔ یہاں حکومت اور اس کے بنانے والے جمہور سب کا کام خدا کا منشا پورا کرنا ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ مغربی جمہوریت ایک مطلق العنان خدائی ہے جو اپنے اختیارات کو آزادانہ استعمال کرتی ہے۔ اس کے برعکس اسلامی جمہوریہ ایک پابند آئین بندگی ہے جو اپنے اختیارات کو خدا اور خدا کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرتی ہے۔

اسلام کا سیاسی نظام

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

(شمع اور شاعر)

ایک شخص واحد اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کے لیے مامور کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ کی توحید اور آخرت کے عقیدے اور رسالت کے اتباع کی بنیادوں پر انسانی زندگی کے تعمیر کے لیے کوشش کرے۔ اس ایک بندہ حق نے ۱۳ برس تک مکہ معظمہ میں اس دعوت کو خلق خدا کے سامنے پیش کیا اور محض زبان ہی سے نہیں پیش کیا بلکہ اپنی زندگی کے ایک ایک عمل سے، اپنی حرکات و سکنات سے، اپنے رویہ، اپنے برتاؤ سے غرض اپنی ایک ایک چیز سے اس شخصیت کبریٰ نے اس بات کا مظاہرہ کیا کہ اسلام کس قسم کا انسان چاہتا ہے، کس قسم کے اخلاق بنانا چاہتا ہے۔ کیا رویہ اس دنیا کی زندگی میں ایک ایسے شخص کا ہونا چاہیے جو اسلام کو مانے اور جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے سامنے پیش کیا، اس کا مجسم نمونہ آپ خود تھے۔

اس دعوت کو سن کر اور اس نمونے کو دیکھ کر خلق خدا میں سے وہ لوگ آپؐ کے ساتھ شریک ہوتے چلے گئے جنھوں نے پوری ایمانداری اور پورے خلوص اور پورے فہم اور پورے شعور کے ساتھ اس چیز کو اچھی طرح جان کر قبول کیا۔ ناسمجھی کے ساتھ کوئی ایک آدمی بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں آیا اور جب کوئی شخص خوب سوچ سمجھ کر آیا تو پھر اس نے اپنی زندگی کو ٹھیک ٹھیک اسی سانچے کے مطابق ڈھال لیا۔ جس سانچے میں رسول اللہؐ کی پیش کردہ دعوت چاہتی تھی کہ وہ ڈھلے۔ اس تیرہ برس کی مدت میں مکہ معظمہ میں جو لوگ اسلام لائے تھے ان میں ایک ایک آدمی کی زندگی میں عملاً وہ انقلاب رونما ہوا تھا جو اسلام حیات انسانی میں رونما کرنا چاہتا ہے اور صرف یہی نہیں کہ ان کے اندر عملاً وہ انقلاب برپا ہوا تھا بلکہ اس انقلاب کے راستے میں جتنی داخلی اور خارجی طاقتیں مزاحم تھیں ان سب کے ساتھ انھوں نے مجاہدہ کیا۔ کشمکش کی بڑی سے بڑی قربانیاں جو انسان کسی مقصد کے لیے دے سکتا ہے اس سلسلے میں انھوں نے دیں۔ بڑے سے بڑے نقصانات برداشت کیے اس لیے کہ ان کے نزدیک دنیا کی سب سے بڑی قدر وہ تھی جو اسلام کے ذریعہ سے انھیں ملی تھی، اس کو وہ دنیا کی کسی چیز پر قربان کرنے کے لیے تیار نہ تھے اور ہر چیز کو

اسی کے اوپر قربان کرنے کے لیے تیار تھے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ان کے اندر پوری طاقت کے ساتھ یہ جذبہ ابھر آیا تھا کہ جس نظریہ حیات پر وہ ایمان رکھتے ہیں اُسے دنیا میں غالب کر کے چھوڑیں گے۔ اور وہ جان کی بازی لگا کر بھی اُس امکان کو ختم کر دینے پر تل گئے تھے کہ کوئی باطل نظریۂ حیات ان پر غالب ہو۔

اس طرح تیرہ برس کی مختصر مدت میں مٹھی بھر جاں نثاروں کا جو گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیار کیا تھا اُسے لے کر آپؐ مدینہ طیبہ منتقل ہو گئے اور وہاں ایک بہت چھوٹی سی ریاست قائم کر دی جس کا رقبہ آپ کے ایک معمولی قصبے کے رقبے سے زیادہ نہ تھا۔ جس کی آبادی بمشکل اس وقت ۶، ۷ ہزار ہو گی، اتنے چھوٹے علاقے میں ایک ریاست قائم قائم ہوتی ہے اور وہ پورے عرب کو چیلنج کر دیتی ہے، ایک طرف پورا عرب ہے اور ایک طرف وہ چھوٹی سی ریاست، اس ریاست میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عربی جاہلیت کے علی الرغم بالکل ایک نیا معاشرہ بنانا شروع کر دیا اور چند سال کے اندر وہ نمونہ تیار کر کے سارے عرب کے سامنے رکھ دیا جسے دیکھ کر ہر شخص علانیہ یہ معلوم کر سکتا تھا کہ اسلام انسانی تہذیب و تمدن کو کیا شکل دینا چاہتا ہے اور اس میں اخلاق کی کیسی روح جاری و ساری کرنا اس کے پیش نظر ہے۔ اسلام جس عدل کی دعوت دیتا ہے اُسے معاشرے اور ریاست میں وہ عملاً قائم کر کے دکھایا گیا۔ اسلام جیسا پاکیزہ معاشرہ بنانا چاہتا ہے وہاں وہ بالفعل کر کے دکھایا گیا۔ اسلام معاشی زندگی میں جو اصلاح کرنا چاہتا ہے وہاں اس کو نافذ کر کے دکھایا گیا۔ غرض ہر وہ چیز جس کے لیے اسلام دعوت دیتا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے عملاً قائم کر کے دکھایا تاکہ لوگ محض کانوں ہی سے نہ سنیں بلکہ آنکھوں سے بھی دیکھ لیں کہ کیا ہے اسلام اور کیا ہیں اس کی برکات اور کس طرح اُسے عمل میں لایا جا سکتا ہے۔

اب یہ انسانی تاریخ کا حیرت انگیز معجزہ ہے کہ آٹھ برس کی مختصر سی مدت میں ایک قصبے کی چھوٹی سی ریاست جو چند مربع میل اور چند ہزار انسانوں پر مشتمل تھی پورے عرب پر چھا گئی۔ صرف آٹھ برس کے اندر دس بارہ لاکھ مربع میل کا پورا ملک مسخر ہو گیا اور مسخر بھی اس طرح ہوا کہ لوگ محض ایک سیاسی نظام ہی کے تابع نہیں ہو گئے بلکہ ان کے نظریات تبدیل ہو گئے ان کی قدریں بدل گئیں۔ ان کے اخلاق بدل گئے۔ ان کے معاشرتی طریقوں میں عظیم الشان اصولی تغیر رونما ہو گیا۔ ان کی تہذیب اور ان کے تمدن کی روح

اور شکل دونوں میں ایک ایسی انقلابی تبدیلی واقع ہوئی جس نے عرب ہی کی نہیں، بلکہ دنیا کی تاریخ کا رُخ بدل ڈالا۔ ان کے افراد نے فرداً فرداً اور ان کی قوم نے بحیثیت مجموعی سوچنے کا نیا انداز برتاؤ کا ایک نیا طریقہ اور زندگی کا ایک نیا مقصد اختیار کر لیا جس سے وہ اپنی صدہا برس کی تاریخ میں کبھی آشنا نہ ہوے تھے۔ صدیوں کی طوائف الملوکی ختم کر کے اس ملک کو ہوئے ایک سیاسی نظام کے تحت لے آنا کوئی چھوٹا کارنامہ تھا مگر اس سے ہزاروں درجہ زیادہ بڑا کارنامہ یہ فکری و اخلاقی اور تہذیبی و تمدنی انقلاب تھا۔ افسوس ہے کہ تاریخ نگاری کے ایک غلط طریقے نے اس عظیم تغیّر کو محض غزوات کے نتیجے کی حیثیت سے پیش کر دیا اور فرنگی مستشرقین نے اس پر خوب ڈھول پیٹا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے۔ حالانکہ وہ تمام لڑائیاں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہوئیں ان میں مجموعی طور پر دونوں طرف کے بمشکل ۱۲۵ آدمی مارے گئے تھے۔ کسی کے پاس عقل ہو تو وہ خود غور کرے کہ اتنی کم خونریزی کے ساتھ اتنا بڑا انقلاب کہیں تلوار کے بل پر بھی ہو سکتا ہے؟

دراصل اس عظیم تغیّر کی وجہ کچھ اور تھی۔ جب مکہ معظمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی دعوت دیتے رہے بہت کم لوگ اُسے اور اُس کے مضمرات کو سمجھ سکے۔ اس وقت صرف وہی لوگ اُسے سمجھے جو بہت زیادہ اعلیٰ درجے کا فہم و شعور رکھتے تھے۔ بڑا صاف اور بے کدورت ذہن رکھتے تھے اور اپنے اندر یہ صلاحیت رکھتے تھے کہ جاہلیت کے تمام تعصّبات سے بالاتر ہو کر ایک حق بات کو محض حق ہونے کی بنا پر سمجھ بھی لیں، مان بھی لیں، عملاً اس کی پیروی بھی اختیار کر لیں اور پھر سر دھڑ کی بازی لگا کر اس کی علمبرداری کے لیے بھی اٹھ کھڑے ہوئے، مگر جب ان صفات کی ایک مختصر سی جماعت تیار ہو گئی اور اس کو لے کر حضورؐ نے مدینے میں ایک اسلامی معاشرہ قائم کر دیا اور ایک آزاد اسلامی ریاست کی زمام اقتدار ہاتھ میں لے کر آپؐ نے اسلام کی پوری اصلاحی اسکیم کو اس معاشرے میں روبہ عمل لانا شروع کر دیا تو حالات یکسر تبدیل ہو گئے۔ آپ لوگوں نے آنکھوں سے دیکھ لیا کہ یہاں کیسا امن ہے، کیسی نیکی اور خدا ترسی ہے، کیسی راستبازی اور ایمانداری ہے۔ یہاں کیسی عدالت ہوتی ہے۔ یہاں کس طرح اونچ نیچ برابر کی گئی ہے۔ یہاں کیسے اخوت اور مساوات قائم کی گئی ہے۔ یہاں کس طرح معاشی زندگی کی مشکلات اور الجھنوں اور

خرابیوں کو رفع کیا گیا ہے۔ یہاں کتنا پاکیزہ اور کتنا ستھرا اور کس قدر اعلیٰ درجہ کا معاشرہ تیار کیا گیا ہے جو تمام اخلاقی گندگیوں سے پاک ہے۔ اب آنکھیں رکھنے والے انسانوں کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ اس روشنی کا انکار کریں جسے وہ علانیہ اپنے سامنے دیکھ رہے تھے۔ وہ زمانہ جاہلیت کے حالات کو بھی دیکھ چکے تھے جب انسانوں کو انسان کھائے جاتا تھا۔ جب قتل و غارت کا بازار گرم تھا اور لوگ شراب، زنا، جوئے، چوری، ڈاکے اور ہر طرح کے اخلاقی فساد میں غرق تھے اور اب اس امن، اس انصاف اس نیکی اور شرافت اور اس اخلاقی طہارت کو بھی ان کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں جس کے نور سے مدینے کی اسلامی ریاست کا سارا ماحول جگمگا رہا تھا۔ اس کے بعد بہت ہی کم لوگ ایسے رہ گئے جن کی آنکھیں پھوٹی ہوئی تھیں اور جنھیں جاہلیت کی تاریکی ہی پسند تھی۔ ان کو چھوڑ کر وہ سب لوگ اس صداقت کے قائل ہوتے چلے گئے جو اس کا راستہ روکنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کٹ کٹ کر لڑ چکے تھے۔ خالد بن ولید قائل ہوے، عکرمہ بن ابی جہل قائل ہوئے، عمرو بن عاص قائل ہوے۔ حتیٰ کہ ابوسفیان اور ہندہ جگر خوار تک نے مان لیا کہ جس دعوت کے ثمرات و نتائج یہ کچھ ہیں وہی حق ہے۔ اس لیے کہ اب انھوں نے چلتے پھرتے حق کو دیکھ لیا تھا۔ اب اسلام محض ایک تخیّل نہ تھا جو محض ایک دعوت کی صورت میں ان کے سامنے پیش کیا جا رہا ہو بلکہ وہ اسے زمین پر کام کرتے ہوئے اور انسان زندگی میں اپنے عملی نتائج کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

اس انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں ایک پوری قوم ایسی تیار کر دی جس کی اجتماعی زندگی میں پورا کا پورا اسلام نافذ تھا۔ جس کے عقائد اور افکار و نظریات اسلامی تھے، جس کا مذہب خدائے واحد کے سوا کسی دوسرے کی بندگی اور پرستش سے آلودہ نہ تھا۔ جس کی انفرادی سیرتیں اور اجتماعی اخلاق جاہلیت سے پاک ہو کر اسلام کے سانچے میں ڈھل چکے تھے جس کا تمدّن اسلامی تہذیب و تمدّن کا نمونہ تھا اور جس کی ریاست کا پورا نظام اسلام کے قوانین پر چل رہا تھا۔ یہ پوری قوم اسلام کے لیے مرنے پر تیار ہو گئی دنیا میں خدا کا کلمہ بلند کرنے کو اس نے اپنا قومی نصب العین بنا لیا اور اس کی ریاست کا مقصد وجود ہی یہ قرار پایا کہ جہاں اسے اقتدار حاصل ہے وہاں اسلام کے اصولوں پر زندگی کا نظام چلائے اور جہاں اُسے اقتدار حاصل نہیں ہے وہاں اسلام

کی دعوت پھیلائے اس طرح دنیا میں ایک پوری قوم ایسی تیار ہوگئی جو خود اسلام پر عامل تھی اور روئے زمین پر اسلام پھیلانا اس کا قومی مشن تھا ایک مکمل ریاست ایسی وجود میں آگئی جو ایک طرف اپنے داخلی نظام میں اسلام کے اصولوں کا پورا عملی مظاہرہ کر رہی تھی اور دوسری طرف وہ ساری دنیا میں اسلام کی علمبردار تھی۔

ایسی ایک قوم اور ایک ایسی ریاست بن جانے کے بعد جس طرح خلافت راشدہ کے زمانے میں اسلام پھیلا ہے اس کے لیے تاریخ میں "انفجار" (Explosion) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے یعنی جیسے کوئی بم پھٹتا ہے اس طرح اسلام دنیا میں پھیلنا شروع ہوگیا اور چند سال کے اندر وہ دیکھتے دیکھتے، افغانستان اور ترکستان سے لے کر شمالی افریقہ تک ایک سیل رواں کی طرح پھیلتا چلا گیا۔ یہ حیرت انگیز انفجار آخر کس چیز کا نتیجہ تھا؟ آج بھی آپ جا کر دیکھ لیجیے کہ عرب کے لوگ کتنے تنومند ہیں۔ یہ بھی دیکھیے کہ عرب کی سرزمین میں کتنے کچھ ذرائع وسائل ہیں۔ تیل کا ذکر نہ کیجیے وہ تو اب برآمد ہوا ہے اُسے چھوڑ کر دیکھیے کہ وہاں کیا دھرا ہے یہ بھی دیکھیے کہ عربوں کی تعداد کتنی ہے۔ شاید اس وقت جزیرۃ العرب کی آبادی ایک کروڑ سے بھی کم ہے اور خلافت راشدہ کے زمانے میں یقیناً بہت کم ہوگی۔ ایسی قوم کا اتنے بڑے رقبۂ زمین پر یوں اچانک حاوی ہو جانا درحقیقت مادی طاقت میں برتری کا نتیجہ نہ تھا۔ اصل چیز جس نے دنیا کو مسخر کیا وہ پوری مسلمان قوم کا اور اس کے ایک ایک مسلم فرد کا وہ رویّہ تھا جو صلح اور جنگ اور مفتوح علاقوں کے نظم و نسق اور مفتوح آبادیوں کے ساتھ برتاؤ میں ظاہر ہوتا تھا۔

ایران اور روم کی سلطنتوں کے ماتحت جو لوگ رہتے تھے انھوں نے اپنی آنکھوں سے کیا معنی کبھی اپنے تصور میں بھی وہ گورنر نہ دیکھے تھے جو سڑکوں پر پیدل چلیں، عام آبادیوں میں عام انسانوں کی طرح رہیں۔ ہر وقت اپنے دروازے ان لوگوں کے لیے کھلے رکھیں جنھیں کسی مدد کی ضرورت ہو اور جس آدمی کو بھی کوئی تکلیف پہنچے وہ ان کا دامن پکڑ کر کہہ سکے کہ مجھے شکایت ہے۔ اس کو رفع کیجیے۔ انھوں نے کبھی اپنے خواب میں بھی ایسے گورنر نہ دیکھے تھے اور نہ وہ سوچ سکتے تھے کہ دنیا میں ایسے گورنر بھی ہو سکتے ہیں لیکن جب یہ مسلم معاشرے نے ان ممالک میں داخل ہو کر ایسے گورنر لوگوں کو آنکھوں سے دکھا دیے تو آخر کتنے لوگ ایسے ہو سکتے تھے جو اندھے تعصب میں مبتلا ہو کر اس اخلاقی برتری کو تسلیم نہ کرتے؟۔

ان کی فوجوں نے دنیا کے سامنے یہ نمونہ پیش کیا کہ ایک مفتوح شہر میں وہ داخل ہوتی ہے، دونوں طرف بالاخانوں پر بنی ٹھنی عورتیں ان کے گزرنے کا تماشا دیکھنے کھڑی ہیں مگر ایک سپاہی بھی آنکھ اٹھا کر کسی بالاخانے کی طرف نہیں دیکھتا۔ پوری فوج گزر جاتی ہے اور اس کو پتہ نہیں چلتا کہ اوپر عورتیں کھڑی ہیں۔ یہ مفتوح لوگ صدیوں سے جو کچھ دیکھتے چلے آرہے تھے اور ان کے باپ دادا نے جو قصے ان کو سنائے تھے وہ تو یہ تھے کہ جب کوئی فاتح فوج کسی بستی میں داخل ہوتی ہے تو اس کی ایک عورت کا بھی دامن عصمت تار تار ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ فوج ان لوگوں کے دل نہ جیت لیتی جو علاقوں پر علاقے فتح کرتی ہے مگر کہیں کسی کی عزت و آبرو میں ہاتھ نہیں ڈالتی۔

ان نئے فاتحوں نے اخلاق کا یہ نرالا کرشمہ بھی دکھایا کہ اگر دشمن کے دباؤ سے کبھی کوئی جیتا ہوا علاقہ انھیں چھوڑنا پڑ گیا تو نظم و نسق کے لیے عوام سے جو ٹیکس انھوں نے وصول کیے تھے وہ سب یہ کہہ کر انھیں واپس کر دیے کہ یہ ٹیکس ہم نے تمھاری حفاظت کی ذمہ داری ادا کرنے کے لیے وصول کیے تھے۔ اب چونکہ ہم اس ذمہ داری کو پورا نہیں کر سکتے، اس لیے تمھارا روپیہ واپس کرتے ہیں۔ لوگ اس وقت تک جن حکمرانوں سے واقف تھے ان کا حال یہ تھا کہ اگر انھیں کبھی کوئی علاقہ چھوڑنا پڑ جاتا تھا تو لیا ہوا روپیہ واپس کرنا تو درکنار جو کچھ لوگوں کے پاس ہوتا تھا وہ بھی لوٹ کر چلتے بنتے تھے یہ اولیا اور انبیا کا سارا اخلاق کسی حاکم گروہ میں دیکھنے کی کسی کو توقع نہ تھی کہ وہ سیاست اور ملک داری میں اس امانت و دیانت سے کام کرے گا۔

یہ تھی وہ اصل طاقت جس سے ابتدائی دور کے مسلمانوں نے دنیا کے ایک بڑے حصے کو مسخر کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تلواروں نے جتنا کام کیا اس سے کہیں زیادہ کام ان کے اخلاق اور کردار نے کیا چونکہ ایک ایک آدمی پورے شعور کے ساتھ اسلام کو سمجھ کر ایمان لایا تھا اور سمجھنے کے بعد پھر اس کے مطابق اس نے اپنی سیرت بنائی تھی اس لیے جس حیثیت میں بھی انھوں نے کام کیا اس میں اسلام کی صحیح نمائندگی کی اور اس کی وجہ سے دنیا کی کوئی طاقت ان کے مقابلے میں ٹھہر نہ سکی۔ ان کی تلوار کی کاٹ سے پہلے ان کے اخلاق کی کاٹ لوگوں کے دلوں کے اندر اتر چکی ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے جو علاقے انھوں نے فتح کیے وہاں کی آبادی ان کی سیاسی غلام نہیں بنی بلکہ ان کی مرید اور معتقد بن گئی۔ اس نے ان کا مذہب اختیار کر لیا ان کی تہذیب قبول کر لی۔ حتّٰی کہ ان کی زبان بھی قبول کر لی۔

آج وہ مفتوح آبادی اپنے ان فاتحوں کو اپنا ہیرو اور اپنا مقتدا مانتی ہے اور اپنی ہی قوم کے کافر اسلاف کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے کیا دنیا میں کبھی تلوار بھی یہ کرشمہ دکھا سکتی ہے؟

ماہنامہ تجلّی دیوبند فروری مارچ ۱۹۶۷ء ۳۶ تا ۳۷

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ہوس کی وزیری

(دین و سیاست)

کوئی انسانی جماعت خواہ کتنی ہی علوم و فنون کی روشنی سے بہرہ ور ہو، اور خواہ عقلی ترقیات کے آسمان ہی پر کیوں نہ پہنچ جائے، اگر وہ قوانین کی تابع فرمان نہ ہو اور ایمان کی قوت نہ رکھتی ہو تو کبھی ہوائے نفس کے چنگل سے نہیں نکل سکتی۔ اس پر خواہشات نفسانی کا غلبہ اتنا شدید رہے گا کہ جس چیز پر اس کا نفس مائل ہوگا اس کی مضرتیں اگر آفتاب سے بھی زیادہ روشن کرکے دکھا دی جائیں، اگر اس کے خلاف سائنس (یعنی پرستارانِ عقل کے معبود) کو بھی گواہ بنا کر لا کھڑا کیا جائے، اگر اس کے مقابلہ میں اعداد و شمار کی بھی شہادت پیش کر دی جائے (جو ارباب حکمت کی نگاہ میں ہرگز جھوٹی نہیں ہو سکتی) اگر اس کی خرابیاں تجربہ و مشاہدہ سے بھی ثابت کر دی جائیں تب بھی وہ کبھی اپنے نفس کے معشوق کو نہ چھوڑے گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں حاسۂ اخلاقی پیدا کرنا اور اس کے ضمیر کی تشکیل کرنا اور اس میں اتنی طاقت بھر دینا کہ وہ نفس پر غالب آجائے، نہ علم و حکمت کے بس کی بات ہے اور نہ عقل و خرد کی یہ کام بجز ایمان کے اور کسی چیز کے ذریعہ انجام نہیں پا سکتا۔

تنقیحات ۶۰

هم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں راہ دکھلائیں کسے؟ رہرو منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جوہر قابل ہی نہیں جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گل ہی نہیں

(جواب شکوہ)

یہ خیال کہ پہلے تو وحی کی رہنمائی کام کرتی تھی۔ اس لیے صحیح وقت پر صحیح تدبیر اختیار کرلی

جاتی تھی۔ مگر اب کیا ہوگا؟ تو اس کا جواب قرآن مجید میں دے دیا گیا ہے کہ "وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا" وہ خدا جو پہلے رہنمائی کرتا تھا وہی اب بھی رہنمائی کے لیے موجود ہے۔ اس کی رہنمائی سے فائدہ اٹھانے والے موجود ہونے چاہئیں۔ ہمارے اندر اگر ایک دو آدمی بھی ایسے موجود رہیں جو قرآن کی روح اپنے اندر جذب کر چکے ہوں اور جماعت میں کم از کم ایک معتد بہ اکثریت ایسے لوگوں کی موجود رہے جو قلب سلیم کی نعمت سے بہرہ ور ہوں اور صحیح و غلط رہنمائی میں امتیاز کر سکتے ہوں اور جن میں صحیح رہنمائی کے لیے سمع و طاعت کا مادہ موجود ہو تو انشاءاللہ خدا کی رہنمائی بھی ہمیں ہر مرحلہ پر حاصل ہوگی اور ہم اس کی رہنمائی سے فائدہ بھی اٹھا سکیں گے۔

رسائل مسائل اوّل ۳۷۵، ۳۷۶

یہ ذکر نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

(تصوّف)

جو لوگ اپنی آنکھوں سے خدا کے دین کو کفر سے مغلوب دیکھیں۔ جن کے سامنے حدود اللہ پامال ہی نہیں بلکہ کالعدم کر دی جائیں، خدا کا قانون عملاً ہی نہیں بلکہ باضابطہ منسوخ کر دیا جائے، خدا کی زمین پر خدا کا نہیں بلکہ اس کے باغیوں کا بول بالا ہو رہا ہو، نظامِ کفر کے تسلّط سے نہ صرف عام انسانی سوسائٹی میں اخلاقی و تمدّنی فساد برپا ہو بلکہ خود امّتِ مسلمہ بھی نہایت سرعت کے ساتھ اخلاقی و عملی گمراہیوں میں مبتلا ہو رہی ہو، اور یہ سب کچھ دیکھ کر بھی ان کے دلوں میں نہ کوئی بے چینی پیدا ہو، نہ اس حالت کو بدلنے کے لیے کوئی جذبہ بھڑکے، بلکہ اس کے برعکس وہ اپنے نفس کو اور عام مسلمانوں کو غیر اسلامی نظام کے غلبے پر اصولاً و عملاً مطمئن کر دیں، ان کا شمار آخری محسنین میں کس طرح ہو سکتا ہے؟ اس جرم عظیم کے ساتھ محض یہ بات انھیں احسان کے مقام عالی پر کیسے سرفراز کر سکتی ہے کہ وہ چاشت اور اشراق اور تہجّد کے نوافل پڑھتے رہے، ذکر و شغل اور مراقبے کرتے رہے، حدیث و قرآن کے درس دیتے رہے، جزئیات فقہ کی پابندی اور چھوٹی چھوٹی سنّتوں کے اتباع کا سخت اہتمام فرماتے رہے اور تزکیہ نفس کی خانقاہوں میں دینداری کا وہ فن

سکھاتے رہے جس میں حدیث و فقہ اور تصوّف کی باریکیاں تو ساری موجود تھیں مگر ایک نہ تھی تو وہ حقیقی دینداری جو "سر داد نداد دست در دستِ یزید" کی کیفیت پیدا کرے اور "بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا" کے مقام وفاداری پر پہنچا دے۔

اسلامی نظام زندگی ۳۰۲، ۳۰۳

یقین محکم عمل پیہم محبّت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

(طلوعِ اسلام)

کوئی فوج اس وقت تک میدان جنگ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے مانند کھڑی نہیں ہوسکتی جب تک اس میں حسب ذیل صفات پیدا نہ ہوجائیں:

— عقیدے اور مقصد میں کامل اتفاق جو اس کے سپاہیوں اور افسروں کو آپس میں پوری طرح متحد کردے۔

— ایک دوسرے کے خلوص پر اعتماد جو کبھی اس کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتا کہ سب فی الواقع اپنے مقصد میں مخلص اور ناپاک اغراض سے پاک ہوں ورنہ جنگ جیسی آزمائش کسی کا کھوٹ چھپا نہیں رہنے دیتی اور اعتماد ختم ہوجائے تو فوج کے افراد ایک دوسرے پر بھروسہ کرنے کے بجائے الٹا ایک دوسرے پر شک کرنے لگتے ہیں۔

— اخلاق کا ایک بلند معیار جس سے اگر فوج کے افسر اور سپاہی نیچے گر جائیں تو ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبّت پیدا ہوسکتی ہے نہ عزّت اور نہ وہ آپس میں متصادم ہونے سے بچ سکتے ہیں۔

— اپنے مقصد کا ایسا عشق اور اُسے حاصل کرنے کا ایسا پختہ عزم جو پوری فوج میں سرفروشی اور جانبازی کا ناقابل تسخیر جذبہ پیدا کردے اور وہ میدان جنگ میں واقعی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ڈٹ جائے۔

یہی تھیں وہ بنیادیں جن پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں ایک زبردست عسکری تنظیم اٹھی جس سے ٹکرا کر بڑی بڑی قوتیں پاش پاش ہوگئیں اور صدیوں تک دنیا کی کوئی طاقت اس کے سامنے نہ ٹھہر سکی۔

تفہیم القرآن ۵ ۴۵۶، ۴۵۷

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

(لینن خدا کے حضور میں)

مشرق ہو یا مغرب، مسلمان ہو یا غیر مسلم، بلا استثنا سب ایک ہی مصیبت میں گرفتار ہیں اور وہ یہ ہے کہ ان پر ایک ایسی تہذیب مسلّط ہوگئی ہے جس نے سراسر مادّیت کے آغوش میں پرورش پائی ہے، اس کی حکمت نظری و حکمت عملی دونوں کی عمارت غلط بنیادوں پر اٹھائی گئی ہے۔ اس کا فلسفہ، اس کا سائنس، اس کا اخلاق، اس کی معیشت، اس کی معاشرت، اس کی سیاست، اس کا قانون، غرض اس کی ہر چیز ایک غلط نقطۂ آغاز سے چل کر ایک غلط رُخ پر ترقی کرتی چلی گئی ہے، اور اب اس مرحلہ پر پہنچ گئی ہے جہاں سے ہلاکت کی آخری منزل قریب نظر آرہی ہے۔

اس تہذیب کا آغاز ایک ایسی قوم میں ہوا جس کے پاس درحقیقت حکمت الٰہی کا کوئی صاف اور پاکیزہ سرچشمہ نہ تھا۔ مذہب کے پیشوا وہاں ضرور موجود تھے مگر ان کے پاس حکمت نہ تھی، ان کے پاس علم نہ تھا، ان کے پاس خدا کا قانون نہ تھا۔ محض ایک غلط مذہبی تخیّل تھا جو فکر و عمل کی راہوں میں نوع انسانی کو سیدھے راستے پر اگر چلانا چاہتا بھی تو نہ چلا سکتا تھا۔ وہ بس اتنا ہی کرسکتا تھا کہ علم و حکمت کی ترقی میں سدراہ بن جاتا۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور اس مزاحمت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ ترقی کرنا چاہتے تھے وہ مذہب اور مذہبیّت کو ٹھوکر مار کر ایک دوسرے راستے پر چل پڑے جس میں مشاہدہ، تجربہ اور قیاس و استقرائے کے سوا کوئی اور چیز ان کی رہنما نہ تھی۔ یہی ناقابل اعتماد رہنما، جو خود ہدایت اور نور کے محتاج ہیں ان کے معتمد علیہ بن گئے۔ ان کی مدد سے انھوں نے فکر و نظر، تحقیق و اکتشاف اور تعمیر و تنظیم کی راہ میں بہت کچھ جدّ و جہد کی، مگر ان کو ہر میدان میں ایک غلط نقطۂ آغاز نصیب ہوا اور ان کی تمام ترقیات کا رخ ایک غلط منزل مقصود کی طرف پھر گیا۔ وہ الحاد و مادّیت کے نقطہ سے چلے۔ انھوں نے کائنات کو اس نظر سے دیکھا کہ اس کا کوئی خدا نہیں ہے۔ آفاق و انفس میں یہ سمجھ کر نظر کی کہ حقیقت جو کچھ بھی ہے مشاہدات اور محسوسات کی ہے اور اس ظاہری پردے کے پیچھے کچھ بھی نہیں۔ تجربہ اور قیاس سے انھوں نے قانون فطرت کو جانا اور سمجھا، مگر اس کے خاطر تک نہ پہنچ سکے۔

انھوں نے موجودات کو مسخر پایا اور ان سے کام لینا شروع کیا۔ لیکن اس تخیل سے ان کے ذہن خالی تھے کہ وہ بالاصل ان اشیا کے مالک اور حاکم نہیں ہیں بلکہ اصل مالک کے خلیفہ ہیں۔ اس جہالت اور غفلت نے انھیں ذمہ داری اور جواب دہی کے بنیادی تصور سے بیگانہ کر دیا اور اس کی وجہ سے ان کی تہذیب اور ان کے تمدن کی اساس ہی غلط ہوگئی۔ وہ خدا کو چھوڑ کر خودی کے پرستار بن گئے اور خودی نے خدا بن کر ان کو فتنے میں ڈال دیا۔ اب یہ اسی جھوٹے خدا کی بندگی ہے جو فکر و عمل کے ہر میدان میں ان کو ایسے راستوں پر لیے جا رہی ہے جن کی درمیانی منزلیں تو نہایت خوش آئند اور نظر فریب ہیں مگر آخری منزل بجز ہلاکت کے اور کوئی نہیں، وہی ہے جس نے سائنس کو انسان کی تباہی کا آلہ بنایا۔ اخلاق کو نفسانیت، ریا، خلاعت اور بے قیدی کے سانچوں میں ڈھال دیا۔ معیشت پر خود غرضی اور برادر کشی کا شیطان مسلط کر دیا۔ معاشرت کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں نفس پرستی، تن آسانی اور خودکامی کا دہرا مار دیا۔ سیاست کو قوم پرستی و وطنیت، رنگ و نسل کے امتیازات، اور خداوند طاقت کی پرستاری سے آلودہ کر کے انسانیت کے لیے ایک بدترین لعنت بنا دیا۔ غرض یہ کہ وہ تخم خبیث جو مغرب کی نشاۃ ثانیہ کے زمانہ میں بویا گیا تھا چند صدیوں کے اندر تمدن و تہذیب کا ایک عظیم شجر خبیث بن کر اٹھا ہے جس کے پھل میٹھے مگر زہر آلود ہیں جس کے پھول خوشنما مگر خاردار ہیں، جس کی شاخیں بہار کا منظر پیش کرتی ہیں مگر ایسی زہریلی ہوا اگل رہی ہیں جو نظر نہیں آتی اور اندر ہی اندر نوع بشری کے خون کو مسموم کیے جا رہی ہے۔

اہل مغرب جنھوں نے اس شجر خبیث کو اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا اب خود اس سے بیزار ہیں۔ اس نے زندگی کے ہر شعبہ میں ایسی الجھنیں اور پریشانیاں پیدا کر دی ہیں جن کو حل کرنے کی ہر کوشش بہت سی الجھنیں پیدا کر دیتی ہیں، جس شاخ کو کاٹتے ہیں اس کی جگہ بہت سی خاردار شاخیں نکل آتی ہیں۔ سرمایہ داری پر تیشہ چلایا تو اشتراکیت نمودار ہوگئی۔ جمہوریت پر ضرب لگائی تو ڈکٹیٹر شپ پھوٹ نکلی۔ اجتماعی مشکلات کو حل کرنا چاہا تو نسوانیت (Feminism) اور برتھ کنٹرول کا ظہور ہوا۔ اخلاقی مفاسد کا علاج کرنے کے لیے قوانین سے کام لینے کی کوشش کی تو قانون شکنی اور جرائم پیشگی نے سر اٹھایا۔ غرض فساد کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو تہذیب و تمدن

چھوڑ رہے ہیں اور آئے دن نئے نئے شگوفے چھوڑتے رہتے ہیں۔ اس فصل کو آخر کون کاٹ سکتا ہے اور کہاں تک کاٹ سکتا ہے۔ مجھے اگر دنیا میں اور کوئی کام نہ کرنا ہو تو اُسے کاٹنے میں اپنی عمر کھپاؤں، اور جماعت اسلامی اگر اپنے مقصد اور اپنے کام سے دستبردار ہو جائے تو اس پر اپنی محنت ضائع کرے ہمارے مخالفین تو یہی چاہتے ہیں کہ ہم اس مخالفت میں مبتلا ہوں اور اس جھاڑ جھنکار سے الجھ جائیں تاکہ فساق و فجار کی قیادت کو اپنا کام کرنے کے لیے صاف راستہ مل جائے لیکن ہم نے ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں ہم کہتے ہیں کہ یہ شیطان کی فصل ہے، وہی اُسے کاٹے گا، خود نہ کاٹے گا تو سنۃ اللہ یہی ہے کہ بالآخر اس کو خود ہی اسے کاٹنا پڑے گا۔

رسائل مسائل دوم ۴۹۴

یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تو کر
کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریقِ خانقاہی

بعض لوگوں کے اس خیال کا بھی مجھے علم ہوا کہ انھیں جماعت میں اس چیز کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے جس کو وہ "روحانیت" سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر شاید وہ خود نہیں بتا سکتے کہ یہ روحانیت فی الواقع ہے کیا شے۔ اسی بنا پر ان لوگوں کی رائے یہ ہے کہ نصب العین اور طریق کار تو اس جماعت کا اختیار کیا جائے اور تزکیہ نفس اور تربیت روحانی کے لیے خانقاہوں کی طرف رجوع کیا جائے۔ یہ ساری باتیں صاف بتاتی ہیں کہ ابھی تک ہماری تمام کوششوں کے باوجود لوگوں میں دین کا فہم نہیں پیدا ہوا ہے۔ میں ابھی آپ کے سامنے ایمان، اسلام، تقویٰ اور احسان کی جو تشریح کر چکا ہوں اس میں اگر کوئی چیز قرآن و حدیث کی تعلیم سے تجاوز کر کے میں نے خود وضع کر دی ہو تو آپ بے تکلف اس کی نشان دہی فرما دیں لیکن اگر آپ تسلیم کرتے ہیں کہ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کی رو سے یہی ان چار چیزوں کی حقیقت ہے تو پھر خود ہی سوچئے کہ جہاں ایمان کے مقتضیات بھی پوری طرح متحقق نہ ہوں اور جہاں تقویٰ اور احسان کی جڑ ہی نہ پائی جاتی ہو، وہاں آخر کونسی روحانیت پائی جا سکتی ہے جسے آپ تلاش کرنے جا رہے ہیں۔

اسلامی نظام زندگی ۳۰۵، ۳۰۶

یہ دنیا دعوت دیدار ہے فرزند آدم کو
کہ ہر مستور کو بخشا گیا ہے ذوق عریانی

(حضرت انسان)

کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں تمہارے لیے مسخّر کر رکھی ہیں[۳۵] اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر عطا کر دی ہیں[۳۶]؟ -

---

۳۵ کسی چیز کو کسی کے لیے مسخّر کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ چیز اس کے تابع کر دی جائے اور اسے اختیار دے دیا جائے کہ جس طرح چاہے اس میں تصرف کرے اور جس طرح چاہے اُسے استعمال کرے۔ دوسری یہ کہ اس چیز کو ایسے ضابطہ کا پابند بنا دیا جائے جس کی بدولت وہ اس شخص کے لیے نافع ہو جائے اور اس کے مفاد کی خدمت کرتی رہے۔ زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے ایک ہی معنی میں مسخّر نہیں کر دیا ہے، بلکہ بعض چیزیں پہلے معنی میں مسخّر کی ہیں اور بعض دوسرے معنی میں۔ مثلاً ہوا، پانی، مٹی، آگ، نباتات، معدنیات، مویشی وغیرہ بے شمار چیزیں پہلے معنی میں ہمارے لیے مسخّر ہیں، اور چاند، سورج، وغیرہ دوسرے معنی میں۔

۳۶ کھلی نعمتوں سے مراد وہ نعمتیں ہیں جو آدمی کو کسی نہ کسی طرح محسوس ہوتی ہیں، یا جو اس کے علم میں ہیں اور چھپی ہوئی نعمتوں سے وہ نعمتیں مراد ہیں جنھیں آدمی نہ جانتا ہے، نہ محسوس کرتا ہے۔ بے حد و حساب چیزیں ہیں جو انسان کے اپنے جسم میں اور اس کے باہر دنیا میں اس کے مفاد کے لیے کام کر رہی ہیں، مگر انسانوں کو اس کا پتہ تک نہیں ہے کہ اس کے خالق نے اس کی حفاظت کے لیے، اس کی رزق رسانی کے لیے، اس کی نشوونما کے لیے اور اس کی فلاح کے لیے کیا کیا سامان فراہم کر رکھا ہے۔ سائنس کے مختلف شعبوں میں انسان تحقیق کے جتنے قدم آگے بڑھاتا جا رہا ہے، اس کے سامنے خدا کی بہت سی وہ نعمتیں بے نقاب ہوتی جا رہی ہیں جو پہلے اس سے بالکل مخفی تھیں اور آج تک جن نعمتوں پر سے پردہ اٹھا ہے وہ ان نعمتوں کے مقابلے میں درحقیقت کسی شمار میں بھی نہیں ہیں جن پر سے اب تک پردہ نہیں اٹھا ہے۔

تفہیم القرآن ۴ ۲۰،۱۹

یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و ملّا ملوکیت کے ہیں بندے تمام

(ابلیس کی مجلس شوریٰ)

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے علمائے کرام کی اکثریت یا تو قلّتِ فہم کے باعث یا کم ہمّتی کے سبب سے یا پھر اپنی نا اہلی کے اندرونی احساس کی وجہ سے دین و دنیا کی اس تقسیم پر راضی ہو چکی ہے جس کا تخیّل اب سے مدتوں پہلے عیسائیوں سے مسلمانوں کے ہاں درآمد ہوا تھا۔ انھوں نے چاہے نظری طور پر اُسے پوری طرح نہ مانا ہو مگر عملاً وہ اُسے تسلیم کر چکے ہیں کہ سیاسی اقتدار اور دنیوی ریاست و قیادت غیر اہل دین کے ہاتھ میں رہے۔ چاہے یہ محدود دنیا بے دین سیاست و قیادت کی مسلسل تاخت سے روز بروز سکڑ کر کتنی ہی محدود ہوتی چلی جائے۔ اس تقسیم کو قبول کر لینے کے بعد یہ حضرات اپنی تمام تر قوت دو باتوں پر صرف کر رہے ہیں۔

ایک اپنی محدود مذہبی ریاست کی حفاظت جس کے مسائل اور معاملات میں کسی کی مداخلت انھیں گوارا نہیں ہے۔

دوسرے کسی ایسے بے دین قیادت سے گٹھ جوڑ جو مذہب کے محدود دائرے میں ان کی اجارہ داری کے بقا کی ضمانت دے دے۔ اور اس دائرے سے باہر کی دنیا پر جس فسق اور ضلالت کو چاہے فروغ دیتی رہے۔ اس طرح کی ضمانت اگر کسی قیادت سے انھیں مل جائے تو یہ دل کھول کر اس کا ساتھ دیتے ہیں اور خود جان لڑا کر اُسے قائم کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے، خواہ اس کا نتیجہ یہی کیوں نہ ہو کہ کفر و الحاد اور فسق و ضلالت تمام سیاسی و معاشی اور تہذیبی قوتوں پر قابض ہو کر پورے دین کی جڑیں ہلا دے اور اس محدود مذہبیت کے پنپنے کے امکانات بھی باقی نہ رہنے دے جس کی ریاست اپنے لیے محفوظ رکھنے کی خاطر یہ لوگ اس قدر پاپڑ بیل رہے ہیں۔

رسائل مسائل دوم ۴۹۹، ۵۰۰

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر
یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقتِ قیام آیا

آپ کو یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام میں جس فرض کا جو وقت ہوتا ہے اس وقت

اس فرض کو ادا کرنا لازم ہے۔ دوسری کوئی بڑی سے بڑی نیکی بھی اس کے بدلے قبول نہیں کی جاتی۔ مثلاً روزوں کے لیے جو زمانہ رکھا گیا ہے اس میں آپ کو روزہ رکھنا ہوگا۔ اگر آپ اپنی ساری دولت بھی خدا کی راہ لٹا دیں تو وہ ایک روزے کا بھی بدل نہ ہو سکے گا اسی طرح یہ وقت اس فرض کو انجام دینے کا ہے کہ شر اور فسق وفجور اور ظلم وستم کی طاقتوں کے مقابلے میں آپ اپنی ساری قوتیں صرف کر دیں اور ان کو شکست دینے کے لیے اپنا پورا زور لگا دیں۔ اس فرض کو چھوڑ کر اگر آپ اپنے سارے دن روزے رکھنے میں اور ساری راتیں نفل پڑھنے میں صرف کر دیں تو کوئی چیز قبول نہیں کی جائے گی اور کسی چیز کا اجر نہ ملے گا۔ پھر آپ خود ہی سمجھ لیجیے کہ جب اس فرض کی ادائیگی کے وقت نفل عبادتیں تک مقبول نہیں ہیں تو اپنے دنیوی کاروبار میں لگے رہنے اور فیصلے کے وقت اپنی طاقتیں خیر کے پلڑے میں لاکر نہ ڈال دینے پر خدا کے ہاں کیسی باز پرس ہوگی۔

ذکری ڈائجسٹ رام پور مئی ۱۹۷۶ء ۵۶، ۵۷

تیرا امام بے حضور تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گزر ایسے امام سے گزر

جہاں تک نماز کی ظاہری صورت کا تعلق ہے وہ تو اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے کہ اوقات مقررہ پر چند جسمانی حرکات کا اعادہ اور چند مقرر الفاظ کی تکرار ہے اور یہی حال دوسری عبادات کا بھی ہے۔ ایک خاص مہینہ میں صبح سے شام تک اکل وشرب اور مباشرت سے مجتنب رہے۔ اس کا نام روزہ ہو گیا۔ سال میں ایک مرتبہ اپنے مال میں سے ایک مقرر مقدار مخصوص مصارف کے لیے نکال دی، یہ زکوٰۃ ہو گئی، ایک خاص زمانے میں حجاز کا سفر کر لیا اور مخصوص مقامات پر چند مناسک ادا کر دیے، یہ حج ہو گیا۔ ظاہر ہے بجائے خود ان افعال میں کوئی ایسی چیز نہیں جو انسان کے نفس پر اثر انداز ہو سکتی ہو، مجرد افعال ہونے کی وجہ سے نماز اور ایک جسمانی ورزش روزے اور فاقے، زکوٰۃ اور سرکاری ٹیکس حج اور عام سفروں کے درمیان کچھ فرق نہیں اور کوئی صاحب عقل یہ نہیں کہہ سکتا کہ ورزش جسمانی سے روح میں لطافت پیدا ہوتی ہے یا فاقہ کرنے سے اخلاقی تربیت ہوتی ہے

کے اسی درخت سے نکل رہا ہے اور اس نے مغربی زندگی کو از سر تا پا مصائب وآلام کا ایک پھوڑا بنا دیا ہے جس کی ہر رگ میں ٹیٹنس اور ہر ریشے میں دکھن ہے۔ مغربی قومیں درد سے بے تاب ہو رہی ہیں ان کے دل بے قرار ہیں۔ ان کی روحیں کسی امرت رس کے لیے تڑپ رہی ہیں مگر انھیں خبر نہیں کہ امرت رس کہاں ہے۔ ان کی اکثریت ابھی تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ مصائب کا سرچشمہ اس شجر خبیث کی محض شاخوں میں ہے اس لیے وہ شاخیں کاٹنے میں اپنا وقت اور اپنی محنتیں ضائع کر رہی ہیں۔ مگر نہیں سمجھتی کہ خرابی جو کچھ بھی ہے اس درخت کی جڑ میں ہے اور اصل فاسد سے فرع صالح نکلنے کی امید رکھنا حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ دوسری طرف ایک قلیل جماعت ایسے صحیح العقل لوگوں کی بھی ہے جنھوں نے حقیقت کو پالیا ہے کہ ان کے شجر تہذیب کی جڑ خراب ہے مگر چونکہ وہ صدیوں تک اسی درخت کے سایہ میں پرورش پاتے رہے ہیں اور اسی کے ثمرات سے ان کی ہڈی بوٹی بنی ہے، اس لیے ان کے ذہن یہ سمجھنے سے یہ قاصر ہیں کہ اس اصل کے بجائے کونسی دوسری اصل ایسی ہو سکتی ہے جو صالح برگ وبار لانے کی قوت رکھتی ہو۔ نتیجہ میں دونوں جماعتوں کا حال ایک ہی ہے۔ وہ سب کے سب بے تابی کے ساتھ کسی چیز کے طالب ہیں جو ان کے درد کا درماں کرے، مگر انھیں خبر نہیں ہے کہ ان کا مطلوب کیا ہے اور کہاں ہے۔

تنقیحات ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

(تصویر درد)

اس دور کے تغیرات میں سے ایک اور اہم تغیر یہ تھا کہ مسلمانوں سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی آزادی سلب کر لی گئی۔ حالانکہ اسلام نے اُسے مسلمانوں کا صرف حق ہی نہیں بلکہ فرض قرار دیا تھا، اور اسلامی معاشرہ وریاست کا صحیح راستے پر چلنا اس پر منحصر تھا کہ قوم کا ضمیر زندہ اور اس کے افراد کی زبانیں آزاد ہوں، ہر غلط کام پر وہ بڑے سے بڑے آدمی کو ٹوک سکیں اور حق بات برملا کہہ سکیں۔ خلافت راشدہ میں لوگوں کی یہ

آزادی پوری طرح محفوظ تھی۔ خلفائے راشدین اس کی نہ صرف اجازت دیتے تھے بلکہ اس پر لوگوں کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ ان کے زمانے میں حق بات کہنے والے ڈانٹ اور دھمکی نہیں، تعریف اور تحسین سے نوازے جاتے تھے اور تنقید کرنے والوں کو دبایا نہیں جاتا تھا بلکہ ان کو معقول جواب دے کر مطمئن کرنے کی کوشش کی جاتی تھی لیکن دورِ ملوکیت میں ضمیروں پر قفل چڑھا دیے گئے اور زبانیں بند کردی گئیں اب قاعدہ یہ ہوگیا کہ منہ کھولو تو تعریف کے لیے کھولو، ورنہ چپ رہو، اور اگر تمہارا ضمیر ایسا ہی زوردار ہے کہ تم حق گوئی سے باز نہیں رہ سکتے تو قید اور قتل اور کوڑوں کی مار کے لیے تیار ہو جاؤ۔ چنانچہ جو لوگ بھی اس دور میں حق بولنے اور غلط کاریوں پر ٹوکنے سے باز نہ آئے ان کو بدترین سزائیں دی گئیں تاکہ پوری قوم دہشت زدہ ہو جائے۔

خلافت و ملوکیت ۱۶۳، ۱۶۴

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

(نماز)

ایمان باللہ انسان کو پستی و ذلت سے اٹھا کر خودداری و عزتِ نفسی کے بلند ترین مدارج پر پہنچا دیتا ہے۔ جب تک اس نے خدا کو نہ پہچانا تھا، دنیا کی ہر طاقتور چیز، ہر نفع یا ضرر پہنچانے والی چیز، ہر شاندار اور بزرگ چیز کے سامنے جھکتا تھا۔ اس سے خوف کھاتا تھا۔ اس کے آگے ہاتھ پھیلاتا تھا۔ اس سے امیدیں وابستہ کرتا تھا۔ مگر جب اس نے خدا کو پہچانا تو معلوم ہوا کہ جن کے آگے وہ ہاتھ پھیلا رہا تھا وہ خود محتاج ہیں۔ جن کی وہ بندگی کر رہا تھا وہ خود اس کے بندے ہیں۔ جن سے وہ مدد کی امیدیں رکھتا تھا وہ اس کی مدد تو درکنار آپ اپنی ہی مدد نہیں کرسکتے۔ حقیقی طاقت کا مالک تو خدا ہے۔ وہی حکمراں اور صاحبِ امر ہے۔ حامی و مددگار اس کے سوا کوئی نہیں۔ مدد اُسی کی جانب سے ہوتی ہے۔ رزق دینے والا وہی ہے۔ زمین و آسمان کی کنجیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ مارنے اور جلانے والا وہی ہے۔ اس کے اذن کے بغیر نہ کوئی کسی کو مار سکتا ہے نہ بچا سکتا ہے۔ نفع و ضرر پہنچانے کی اصلی طاقت اسی کے ہاتھ میں ہے

یہ علم حاصل ہو جانے کے بعد وہ تمام دنیا کی طاقتوں سے بے نیاز اور بے خوف ہو جاتا ہے۔ خدا کے سوا اس کی گردن کسی کے آگے نہیں جھکتی۔ خدا کے سوا اس کا ہاتھ کسی کے آگے نہیں پھیلتا۔ خدا کے سوا کسی کی عظمت اس کے دل میں نہیں رہتی۔ خدا کو چھوڑ کر وہ کسی دوسرے سے امیدیں وابستہ نہیں کرتا۔

اسلامی تہذیب اصول و مبادی ۱۶۴، ۱۶۵

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون

میں نے آپ کی دریافت کردہ عبارت میں جو بات کہی ہے وہ یہ ہے کہ قدرتِ الٰہی کمتر درجہ کی چیزوں سے تخلیق کی ابتدا کرکے بتدریج بلند تر درجہ کی چیزیں پیدا کرتی رہی ہے۔ مثلاً جمادات پہلے پیدا کیے گئے۔ اس کے بعد نباتات، پھر حیوانات، اور حیوانات میں بھی کمتر درجہ کے حیوانات پہلے پیدا کیے گئے اور پھر بتدریج اعلا قسم کے حیوانات پیدا کیے جاتے رہے۔ یہاں تک کہ بلند ترین نوع یعنی انسان کو پیدا کیا گیا۔ قدرت کا یہی قاعدہ اس عالم پر بہ حیثیت مجموعی بھی جاری ہونا چاہیے۔ یعنی موجودہ نظامِ عالم بہ حیثیت مجموعی ناقص ہے۔ لہٰذا اس کے بعد ایک دوسرا نظامِ عالم ہونا چاہیے جو اس سے کامل تر ہو۔ اور اسی نظام کا نام عالمِ آخرت ہے۔ گویا میرے نزدیک موجودہ نظامِ عالم کے بعد عالمِ آخرت کا آنا قدرت کے قانونِ ارتقا کا ایک لازمی تقاضا ہے۔

رسائل مسائل اوّل ۲۸۴

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی
اخوّت کی جہانگیری، محبّت کی فراوانی

(طلوعِ اسلام)

خدا کی راہ میں کام کرنے والے لوگوں کو عالی ظرف اور فراخ حوصلہ ہونا چاہیے، ہمدردِ خلائق اور خیر خواہ انسانیت ہونا چاہیے، کریم النفس اور شریف الطبع ہونا

چاہیے۔ خود دار اور خوگر قناعت ہونا چاہیے۔ متواضع اور منکسر مزاج ہونا چاہیے۔ شیریں کلام اور نرم خو ہونا چاہیے۔ وہ ایسے لوگ ہونا چاہئیں جن سے کسی کو شر کا اندیشہ نہ ہو اور ہر ایک ان سے خیر خواہی کا متوقع ہو، جو اپنے حق سے کم پر راضی ہوں اور دوسروں کو ان کے حق سے زیادہ دینے پر تیار رہیں۔ برائی کا جواب بھلائی سے دیں یا کم از کم برائی سے نہ دیں۔ جو اپنے محبوب کے معترف اور دوسروں کی بھلائیوں کے قدر داں ہوں، جو اتنا بڑا دل رکھتے ہوں کہ لوگوں کی کمزوریوں سے چشم پوشی کر سکیں، قصوروں کو معاف کر سکیں، زیادتیوں سے درگزر کر سکیں اور اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہ لیں، جو خدمت لے کر نہیں خدمت کر کے خوش ہوتے ہوں۔ اپنی غرض کے لیے نہیں بلکہ دوسروں کی بھلائی کے لیے کام کریں۔ ہر تعریف سے بے نیاز اور ہر خدمت سے بے پروا ہو کر اپنا فرض انجام دیں اور خدا کے سوا کسی کے اجر پر نگاہ نہ رکھیں۔ جو طاقت سے دبائے نہ جا سکیں، دولت سے خریدے نہ جا سکیں مگر حق اور راستی کے آگے بے تامل سر جھکا دیں۔ جن کے دشمن بھی ان پر بھروسہ رکھتے ہوں کہ کسی حال میں ان سے شرافت و دیانت اور انصاف کے خلاف کوئی حرکت سرزد نہیں ہوسکتی۔ یہ دلوں کو موہ لینے والے اخلاق ہیں ان کی کاٹ تلوار کی کاٹ سے بڑھ کر اور ان کا سرمایہ سیم و زر کی دولت سے گراں تر ہے کسی فرد کو یہ اخلاق میسر ہوں تو وہ اپنے گرد و پیش کی آبادی کو مسخر کر لیتا ہے لیکن اگر کوئی جماعت کی جماعت ان اوصاف سے متصف ہو جائے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اُسے شکست دینے میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔

اسلامی تزکیہ نفس ۲۸، ۲۹

یہ اتفاق مبارک ہو مومنوں کے لیے
کہ یک زبان ہیں فقیہان شہر میرے خلاف

پاکستان سے ہندوستان تک ہر طرف فتووں، پمفلٹوں، اشتہاروں اور مضامین کی ایک فصل اُگ رہی ہے جس میں کمیونسٹ، سوشلسٹ، زندیق، ملحدین قادیانی، منکرین حدیث، بریلوی اور دیوبندی سب ہی اپنے اپنے شگوفے

کو جتنی ضرورت غلظت، شدت اور صلابت کی ہے، اتنی ہی ضرورت رقت، نرمی اور لچک کی بھی ہے۔ جتنی ضرورت اچھے سپہ سالاروں، اچھے مدبروں اور اچھے منتظمین کی ہے، اتنی ہی ضرورت اچھی ماؤں، اچھی بیویوں اور اچھی خانہ داروں کی بھی ہے۔ دونوں عنصروں میں جس کو بھی ساقط کر دیا جائے گا تمدن بہر حال نقصان اٹھائے گا۔

یہ وہ تقسیم عمل ہے جو خود فطرت نے انسان کی دونوں صنفوں کے درمیان کر دی ہے۔ حیاتیات، عضویات، نفسیات اور عمرانیات کے تمام علوم اس تقسیم کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ بچہ جننے اور پالنے کی خدمت کا عورت کے سپرد ہونا ایک ایسی فیصلہ کن حقیقت ہے جو خود بخود انسانی تمدن میں اس کے لیے ایک دائرۂ عمل مخصوص کر دیتی ہے، اور کسی مصنوعی تدبیر میں یہ طاقت نہیں ہے کہ فطرت کے اس فیصلہ کو بدل سکے۔ ایک صالح تمدن وہی ہوسکتا ہے جو اوّلاً اس فیصلہ کو جوں کا توں قبول کرے، پھر عورت کو اس کے صحیح مقام پر رکھ کر اُسے معاشرت میں عزت کا مرتبہ دے، اس کے جائز تمدنی و معاشی حقوق تسلیم کرے، اس پر صرف گھر کی ذمہ داریوں کا بار ڈالے اور بیرون خانہ کی ذمہ داریاں اور خاندان کی قوّامیت مرد کے سپرد کر دے۔ جو تمدن اس تقسیم کو مٹانے کی کوشش کرے گا وہ عارضی طور پر مادی حیثیت سے ترقی اور شان و شوکت کے مظاہر پیش کر سکتا ہے، لیکن بالآخر ایسے تمدن کی بربادی یقینی ہے۔ کیونکہ جب عورت پر مرد کے برابر معاشی و تمدنی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا جائے گا تو وہ اپنے اوپر سے فطری ذمہ داریوں کا بوجھ اتار پھینکے گی اور اس کا نتیجہ نہ صرف تمدن بلکہ خود انسانیت کی بربادی ہو گا۔

پردہ ۱۴۷ تا ۱۴۹ ۔

بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسہ زن
ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت

(عورت اور تعلیم)

عورتوں کو دینی اور دنیوی علوم سیکھنے کی نہ صرف اجازت دی گئی ہے بلکہ ان کی تعلیم و تربیت کو اسی قدر ضروری قرار دیا گیا ہے جس قدر مردوں کی تعلیم و تربیت

ضروری ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دین و اخلاق کی تعلیم جس طرح مرد حاصل کرتے تھے اسی طرح عورتیں بھی کرتی تھیں۔ آپ نے ان کے لیے اوقات متعیّن کر دے تھے۔ جن میں وہ آپ سے علم حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوتی تھیں۔ آپ کی ازواج مطہرات اور خصوصاً حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نہ صرف عورتوں کی بلکہ مردوں کی معلّمہ تھیں اور بڑے بڑے صحابہ و تابعین ان سے حدیث، تفسیر اور فقہ کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اشراف تو درکنار، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لونڈیوں تک کو علم و ادب سکھانے کا حکم دیا تھا چنانچہ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ :۔

جس شخص کے پاس کوئی لونڈی ہو اور وہ اس کو خوب تعلیم دے اور عمدہ تہذیب و شائستگی سکھائے پھر اس کو آزاد کر کے اس سے شادی کرے اس کے لیے دوہرا اجر ہے۔ (بخاری کتاب النکاح)

جہاں تک نفس تعلیم و تربیت کا تعلّق ہے، اسلام نے عورت اور مرد کے درمیان کوئی امتیاز نہیں رکھا ہے۔ البتہ نوعیت میں فرق ضروری ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے عورت کی صحیح تعلیم و تربیت وہ ہے جو اس کو ایک بہترین بیوی، بہترین ماں اور بہترین گھر والی بنائے۔ اس کا دائرۂ عمل گھر ہے، اس لیے خصوصیت کے ساتھ ان علوم کی تعلیم دی جانی چاہیے جو اس دائرہ میں اُسے زیادہ مفید بنا سکتے ہیں۔ مزید برآں وہ علوم بھی اس کے لیے ضروری ہیں جو انسان کو انسان بنانے والے اور اس کے اخلاق کو سنوارنے والے اور اس کی نظر کو وسیع کرنے والے ہیں۔ ایسے علوم اور ایسی تربیت سے آراستہ ہونا ہر مسلمان عورت کے لیے لازم ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی عورت غیر معمولی عقلی و ذہنی استعداد رکھتی ہو، اور علوم کے علاوہ دوسرے علوم و فنون کی اعلا تعلیم بھی حاصل کرنا چاہے تو اسلام اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہے۔ بشرطیکہ وہ ان حدود سے تجاوز نہ کرے جو شریعت نے عورتوں کے لیے مقرر کیے ہیں۔

پردہ ۱۸۶، ۱۸۷

نگاہ پاک تری ہے تو پاک ہے دل بھی　　　کہ دل کو حق نے کیا ہے نگاہ کا پیرو

جو شخص معز شریعت تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہو وہ بآسانی سمجھ سکتا ہے

کہ غضِّ بصر کے احکام کن مصالح پر مبنی ہیں اور ان مصالح کے لحاظ سے ان احکام میں شدّت اور تخفیف کا مدار کن امور پر ہے۔ شارع کا اصل مقصد تم کو نظر بازی سے روکنا ہے، ورنہ اُسے تمھارے آنکھوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ یہ آنکھیں ابتدا میں بڑی معصوم نگاہوں سے دیکھتی ہیں، نفس کا شیطان ان کی تائید میں بڑے بڑے پر فریب دلائل پیش کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ ذوق جمال ہے جو فطرت نے تم میں ودیعت کیا ہے۔ جمال فطرت کے دوسرے مظاہر و تجلّیات کو جب تم دیکھتے ہو اور ان سے بہت ہی پاک لطف اُٹھاتے ہو تو جمال انسانی کو بھی دیکھو اور روحانی لطف اٹھاؤ مگر اندر ہی اندر یہ شیطانی لطف اندوزی کی لے بڑھاتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ ذوق جمال ترقی کر کے شوق وصال بن جاتا ہے۔ کون ہے جو اس حقیقت سے انکار کی جرأت رکھتا ہو کہ دنیا میں جس قدر بدکاری اب تک ہوئی ہے اور اب ہو رہی ہے اس کا پہلا اور سب سے بڑا محرک یہی آنکھوں کا فتنہ ہے؟ کون یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اپنی صنف مقابل کے کسی حسین اور جوان فرد کو دیکھ کر اس میں وہی کیفیات پیدا ہوتی ہیں جو ایک خوبصورت پھول کو دیکھ کر ہوتی ہیں؟ اگر دونوں قسم کی کیفیات میں فرق ہے اور اس کے برخلاف دوسری کیفیت کم و بیش شہوانی کیفیت ہے تو پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ ایک ذوق جمال کے لیے بھی وہی آزادی ہونی چاہیے جو دوسرے ذوق جمال کے لیے ہے؟ شارع تمھارے ذوق جمال کو مٹانا تو نہیں چاہتا، وہ کہتا ہے کہ تم اپنی پسند کے مطابق اپنا ایک جوڑا انتخاب کر لو اور جمال کا جتنا ذوق تم میں ہے اس کا مرکز صرف اسی ایک کو بنا لو پھر جتنا چاہو اس سے لطف اٹھاؤ۔ اس مرکز سے ہٹ کر دیدہ بازی کرو گے تو فواحش میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اگر ضبط نفس یا دوسرے موانع کی بنا پر آوارگی عمل میں مبتلا نہ بھی ہوئے تو آوارگی خیال سے نہ بچ سکو گے۔ تمھاری بہت سی قوت آنکھوں کے رستے ضائع ہو گی۔ بہت سے ناکردہ گناہوں کی حسرت تمھارے دل کو ناپاک کرے گی۔ بار بار فریب محبّت میں مبتلا ہو گے اور بہت سی راتیں بیداری کے خواب دیکھنے میں جاگ جاگ کر ضائع کرو گے، بہت سے حسین ناگو اور ناگنوں سے ڈسے جاؤ گے۔ تمھاری بہت سی قوت حیات دل کی دھڑکن اور خون کے ہیجان میں ضائع ہو جائے گی۔ یہ نقصان کیا کچھ کم ہے؟ اور یہ سب اپنے مرکز دید سے ہٹ کر دیکھنے ہی کا نتیجہ ہے لہذا اپنی آنکھوں کو قابو میں رکھو۔ بغیر حاجت کے دیکھنا اور ایسا دیکھنا کہ جو فتنے کا

یا ٹیکس ادا کرتے اور کسی مقام کا سفر کر آنے سے انسان میں اعلا درجے کے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں۔

مگر جو چیز ان اعمال کو دوسرے افعال سے ممتاز کرتی اور ان کو تہذیب اخلاق و تزکیہ نفس و تصفیہ روح کا ایک بہترین زاویہ بناتی ہے وہ ایمان ہے۔ ایمان ہی رکوع وسجود اور قیام وقعود کو "نماز" بناتا ہے۔ وہی فاقے کو روزے میں تبدیل کر دیتا ہے، وہی ٹیکس کی ماہیت میں انقلاب پیدا کر کے اسے "زکوٰۃ" کا بلند مرتبہ بخشتا ہے، اور وہی ایک خاص قسم کے سفر کو سیر وسیاحت کے ادنیٰ مقام سے اٹھا کر "حج" کے اعلیٰ مقام پر پہنچا دیتا ہے۔ درحقیقت ان تمام عبادات کی روح اور ان کا جوہر وہی ہے اسی سے ارکان عبادت میں معنویت پیدا ہوتی ہے، وہی ان ارکان کو تاثیر کی قوت بخشتا ہے اور اسی کی بدولت نفس میں ان سے متاثر ہونے کی استعداد پیدا ہوتی ہے۔

اب یہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص واقعی ایمان رکھتا ہو، خدا کو اپنا خدا سمجھتا ہو، آخرت کی زندگی پر عقیدہ رکھتا ہو، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول مانتا ہو، اور ان کی لائی ہوئی تعلیم کو خدائی تعلیم سمجھتا ہو، تو ممکن نہیں ہے کہ وہ دن میں پانچ وقت نماز کا سبق تازہ کرے اور پھر بھی اس کی لوحِ دل اس سبق کے اثر سے یکسر خالی رہے اور اس کی روزمرہ کی زندگی میں خوف خدا اور اطاعت احکام الٰہی کا کوئی نشان نمایاں نہ ہو۔ ہر سال پورے ایک مہینے تک سخت ضوابط کے ماتحت پرہیزگاری اور خداترسی کی تربیت پاتا رہے اور پھر اس کی زندگی میں قطعاً کوئی انقلاب نہ ہو، حتیٰ کہ وہ بالکل ایسا کورا رہ جائے کہ گویا اس نے کوئی تربیت پائی ہی نہیں، خالص ایمان بالغیب کی تحریک پر ہر سال اپنے محبوب مال کی قربانی کرتا رہے اور پھر بھی اُسی شحِّ نفس اور قساوت قلب اور حرام خوری وخودغرضی کے مرض میں مبتلا رہے جو ایک بے ایمان، زرپرست انسان میں پائی جاتی ہے۔ اپنے رب کی پکار پر لبّیک، لبّیک کہتا ہوا اپنا گھر بار چھوڑ کر اپنے مفید ومحبوب مشاغل ترک کر کے فقیرانہ لباس پہن کر نکلے، ایک مدّت دراز تک اس شوق وعشق کی لگن دل میں لیے ہوئے سفر کرے، یہاں تک کہ مرکز اسلام میں پہنچ کر اپنی آنکھوں سے اللہ کی ان روشن نشانیوں کا مشاہدہ کرلے جو خدا کے سچّے اور مطیع فرمان بندوں کی سرفرازیوں پر اور سرکشوں کی نامرادیوں پر کھلی گواہی دے رہی ہیں اور پھر بھی جب

سبب بن سکتا ہو، قابل حذر ہے۔ اگر دیکھنے کی حقیقی ضرورت ہو یا اس کا کوئی تمدنی فائدہ ہو تو احتمال فتنہ کے باوجود دیکھنا جائز ہے، اور اگر حاجت نہ ہو لیکن فتنے کا بھی احتمال نہ ہو تو عورت کے لیے مرد کو دیکھنا جائز ہے مگر مرد کے لیے عورت کو دیکھنا جائز نہیں، اِلّا یہ کہ اچانک نظر پڑ جائے۔

پردہ ۲۲۸، ۲۲۹

آغوش صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے
وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر

(خلوت)

آزاد شہوت رانی کے حامی کہتے ہیں کہ بچوں کی پرورش اور تعلیم کے لیے ایک قومی نظام ہونا چاہیے تاکہ بچوں کو ان کے والدین اپنے آزادانہ تعلق سے جنم دیں اور قوم ان کو پال پوس کر تمدن کی خدمت کے لیے تیار کرے۔ اس تجویز سے ان لوگوں کا مقصد یہ ہے کہ عورتوں اور مردوں کی آزادی اور ان کی انفرادیت محفوظ رہے اور ان کی نفسیاتی خواہشات کو نکاح کی پابندیوں میں جکڑے بغیر تولید نسل و تربیت اطفال کا مدعا حاصل ہو جائے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جن لوگوں کو موجودہ نسل کی انفرادیت اتنی عزیز ہے وہ آئندہ نسل کے لیے قومی تعلیم یا سرکاری تربیت کا ایسا سسٹم تجویز کرتے ہیں جس میں انفرادیت کی نشوونما اور شخصیت کے ارتقا کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اس قسم کے ایک سسٹم میں جہاں ہزاروں لاکھوں بچّے بیک وقت ایک نقشے ایک ضابطے اور ایک ہی ڈھنگ پر تیار کیے جائیں، بچّوں کا انفرادی تشخّص کبھی ابھر اور نکھر نہیں سکتا۔ وہاں تو ان میں زیادہ سے زیادہ یکسانی اور مصنوعی ہمواری پیدا ہوگی۔ اس کارخانے سے بچّے اسی طرح ایک سی شخصیت لے کر نکلیں گے جس طرح کسی بڑی فیکٹری سے لوہے کے پرزے یکساں ڈھلے ہوئے نکلتے ہیں۔ غور تو کرو انسان کے متعلق ان کم عقل لوگوں کا تصور کتنا پست اور کتنا گھٹیا ہے۔ یہ باٹا کے جوتوں کی طرح انسانوں کو تیار کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو معلوم ہے کہ بچہ کی شخصیت کو تیار کرنا ایک لطیف ترین آرٹ ہے۔ یہ آرٹ ایک چھوٹے نگار خانے میں ہی انجام پا سکتا ہے۔ جہاں ہر مصوّر کی توجہ ایک ایک تصویر پر مرکوز ہو۔ ایک بڑی فیکٹری میں

واپس آئے تو اس سفر کے آثار اور نتائج سے اس کی سیرت ایسی معرّا ہو کہ گویا وہ کہیں گیا ہی نہیں اور اس کی آنکھوں نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔

یہ ضرور ہے کہ کمیت و کیفیت کے اعتبار سے ہر نفس پر ان عبادات کی تاثیرات یکساں نہیں ہو سکتیں، نفوس کی کم و بیش صلاحیتوں کے لحاظ سے، اور قوت ایمانی کی زیادتی اور کمی کے لحاظ سے اُن کا کم و بیش اور شدید و ضعیف ہونا ایک فطری بات ہے۔ لیکن یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ایمان کے ساتھ جو عبادت کی جائے وہ بالکل ہی بے اثر ثابت ہو۔ ہم یہ بات قطعیت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جو شخص نماز کو فحشا و منکر کے ساتھ جمع کرتا ہے، جس کی زندگی میں روزہ اور فسق ایک ساتھ پائے جاتے ہیں۔ جس کی سیرت میں حرام خوری اور زکوٰۃ دونوں بہم ہیں، جو حج اور ہتک حرمات کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا رہا ہے، اس کی نماز "نماز" نہیں ایک عادی حرکت ہے، اس کا روزہ "روزہ" نہیں فاقہ ہے۔ اس کی زکوٰۃ "زکوٰۃ" نہیں چندہ یا ٹیکس ہے، اس کا حج "حج" نہیں بلکہ اس کے حق میں ویسا ہی ایک سفر ہے جیسا پیرس اور لندن کا سفر۔

تفہیمات دوم ۱۷۳، ۱۷۴

بڑھ جاتا ہے جب ذوق نظر اپنی حدوں سے
ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر

(خلوت)

مردوں اور عورتوں کے آزادانہ اختلاط نے عورتوں میں حسن کی نمائش عریانی اور فواحش کو غیر معمولی ترقی دے دی ہے صنفی میلان (Sexual Attractirar) جو پہلے ہی فطری طور پر مرد اور عورت کے درمیان موجود ہے اور کافی طاقتور ہے۔ دونوں صنفوں کے آزادانہ میل جول کی صورت میں بہت آسانی کے ساتھ غیر معمولی حد تک ترقی کرتا جاتا ہے۔ پھر اس قسم کی مخلوط سوسائٹی میں قدرتی طور پر دونوں صنفوں کے اندر یہ جذبہ ابھر آتا ہے کہ صنف مقابل کے لیے زیادہ سے زیادہ جاذب نظر Attractive بنیں۔ اور جب کہ اخلاقی نظریات کے بدل جانے کی وجہ سے ایسا کرنا معیوب بھی نہ

رہا ہو بلکہ علانیہ شان دلربائی پیدا کرنے کو مستحسن سمجھا جانے لگا ہو۔ تو حسن و جمال کی نمائش رفتہ رفتہ تمام حدود کو توڑتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ برہنگی کی آخری حد کو پہنچ کر ہی دم لیتی ہے۔ یہی کیفیت اس وقت مغربی تہذیب میں پیدا ہو گئی ہے۔ صنف مقابل کے لیے مقناطیس بننے کی خواہش عورت میں اتنی بڑھ گئی ہے اور اتنی بڑھتی چلی جا رہی ہے کہ شوخ و شنگ لباسوں غازوں اور سرخیوں اور بناؤ سنگھار کے نت نئے سامانوں سے اس کی تسکین نہیں ہوتی۔ بیچاری تنگ آ کر اپنے کپڑوں سے باہر نکلی پڑتی ہے۔ یہاں تک کہ بسا اوقات تار تک لگا نہیں رہنے دیتی۔ ادھر مردوں کی طرف سے ہر وقت "ھل من مزید" کا تقاضا ہے کیونکہ جذبات میں جو آگ لگی ہوئی ہے وہ حسن کی ہر بے حجابی پر بجھتی نہیں بلکہ اور زیادہ بڑھکتی ہے اور مزید بے حجابی کا مطالبہ کرتی ہے۔ ان غریبوں کی پیاس بھی بڑھتے بڑھتے تونس بن گئی ہے۔ جیسے کسی کو لُو لگ گئی ہو اور پانی کا ہر گھونٹ پیاس کو بجھانے کے بجائے اور بھڑکا دیتا ہو۔ حد سے بڑھی ہوئی شہوانی پیاس سے بیتاب ہو کر بیچارے ہر وقت ہر ممکن طریقے سے اس کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔ یہ ننگی تصویریں، یہ صنفی لٹریچر، یہ عشق و محبّت کے افسانے یہ عریاں اور حبڑ وال ناچ، یہ جذبات شہوانی سے بھرے ہوئے فلم، آخر کیا ہیں؟ سب اسی آگ کو بجھانے۔ مگر دراصل بھڑکانے۔ کے سامان ہیں۔

(پردہ ۲۲، ۲۳)

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اُسی علم کو ارباب نظر موت

(عورت اور تعلیم)

عورت کو مردانہ کاموں کے لیے تیار کرنا عین اقتضائے فطرت اور وضع فطرت کے خلاف ہے، اور یہ چیز نہ انسانیت کے لیے مفید ہے نہ خود عورت کے لیے چونکہ علم الحیات کے رو سے عورت کو بچّہ کی پیدائش اور پرورش ہی کے لیے بنایا گیا ہے، اس لیے نفسیات کے دائرے میں بھی اس کے اندر وہی صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں جو اس کے فطری وظیفہ کے لیے موزوں ہیں۔ یعنی محبّت، ہمدردی رحم و شفقت،

رقّتِ قلب، ذکاوتِ حِس اور لطافتِ جذبات اور چونکہ صنفی زندگی میں مرد کو فعل کا اور عورت کو انفعال کا مقام دیا گیا ہے۔ اس لیے عورت کے اندر تمام وہی صفات پیدا کی گئی ہیں جو اُسے زندگی کے صرف منفعلانہ پہلو میں کام کرنے کے لیے تیار کرتی ہیں۔ اس کے اندر سختی اور شدت کے بجائے نرمی اور نزاکت اور لچک ہے۔ اس میں اثراندازی کے بجائے اثر پذیری ہے۔ فعل کے بجائے انفعال ہے۔ جمنے اور ٹھہرنے کے بجائے جھکنے اور ڈھل جانے کی صلاحیت ہے، بے باکی اور جسارت کے بجائے منع و فرار اور رکاوٹ ہے۔ کیا ان خصوصیات کو لے کر وہ کبھی ان کاموں کے لیے موزوں ہو سکتی ہے اور ان دوائرِ حیات میں کامیاب ہو سکتی ہے جو شدّت، تحکّم، مزاحمت اور سرد مزاجی چاہتے ہیں، جن میں نرم جذبات کے بجائے مضبوط ارادے اور بے لاگ رائے کی ضرورت ہے؟ تمدّن کے ان شعبوں میں عورت کو گھسیٹ لانا خود اس کو بھی ضائع کرنا ہے اور ان شعبوں کو بھی۔

اس میں عورت کے لیے ارتقا نہیں، بلکہ انحطاط ہے، ارتقا اس کو نہیں کہتے کہ کسی کی قدرتی صلاحیتوں کو دبایا اور مٹایا جائے اور اس میں مصنوعی طور پر وہ صلاحیتیں پیدا کرنے کی کوشش کی جائے جو فطری طور پر اس کے اندر نہ ہوں۔ بلکہ ارتقا اس کا نام ہے کہ قدرتی صلاحیتوں کو نشوونما دیا جائے، ان کو نکھارا اور چمکایا جائے اور ان کے لیے بہتر سے بہتر عمل کے مواقع پیدا کیے جائیں۔

اس میں عورت کے لیے کامیابی نہیں، بلکہ ناکامی ہے۔ زندگی کے ایک پہلو میں عورتیں کمزور ہیں اور مرد بڑھے ہوئے ہیں۔ دوسرے پہلو میں مرد کمزور ہیں اور عورتیں بڑھی ہوئی ہیں۔ تم غریب عورتوں کو اُس پہلو میں مرد کے مقابلے پر لاتے ہو جس میں وہ کمزور ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ عورتیں ہمیشہ مردوں سے کمتر رہیں گی۔ تم خواہ کتنی ہی تدبیر کر لو، ممکن نہیں ہے کہ عورتوں کی صنف سے ارسطو، ابن سینا، کانٹ، ہیگل، خیّام، شیکسپئیر، سکندر، نپولین، صلاح الدین، نظام الملک، طوسی اور بسمارک کی ٹکر کا ایک فرد بھی پیدا ہو سکے، البتہ تمام دنیا کے مرد چاہے کتنا ہی سر مار لیں، وہ اپنی پوری صنف میں سے ایک معمولی درجہ کی ماں بھی پیدا نہیں کر سکتے۔

اس میں خود تمدّن کا بھی فائدہ نہیں، بلکہ نقصان ہے۔ انسانی زندگی اور تہذیب

جہاں کرایہ کے مزدور ایک ہی طرز کی تصویر لاکھوں کی تعداد میں تیار کرتے ہوں، یہ آرٹ غارت ہوگا، نہ کہ ترقی کرے گا۔

پردہ ۱۲۷

نے پردہ نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیت کا زن کا نگہبان ہے فقط مرد

(عورت کی حفاظت)

اسلامی قانون ازدواج کا پہلا مقصد اخلاق کی حفاظت ہے وہ زنا کو حرام قرار دیتا ہے اور نوع انسانی کی دونوں صنفوں کو مجبور کرتا ہے کہ اپنے فطری تعلّق کو ایک ایسے ضابطے کا پابند بنا دیں جو اخلاق کو فحش اور بے حیائی سے اور تمدّن کو فساد سے محفوظ رکھنے والا ہو۔ اسی لیے قرآن مجید میں نکاح کو لفظ احصان سے تعبیر کیا ہے۔ حِصن قلعہ کو کہتے ہیں اور احصان کے معنی قلعہ بندی کے ہیں۔ جو مرد نکاح کرتا ہے وہ "محصن" ہے گو وہ ایک قلعہ تعمیر کرتا ہے اور جس عورت سے نکاح کیا جاتا ہے وہ "محصنہ" ہے یعنی وہ اس قلعہ کی حفاظت میں آگئی ہے، جو نکاح کی صورت میں اس کے نفس اور اس کے اخلاق کی حفاظت کے لیے تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ استعارہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ اسلام میں نکاح کا اوّلین مقصد اخلاق اور عصمت کا تحفظ ہے اور قانون ازدواج کا پہلا کام اس قلعہ کو مستحکم کرتا ہے، جو نکاح کی صورت میں اس گراں قدر چیز کی حفاظت کے لیے تعمیر کیا گیا ہے۔۔۔۔

حقوق الزّوجین ۱۲، ۱۳

فہرست موضوعات

الف

ب

ت

پ

ج

ن

و

ہ

ی